اسلام اور مغربی ذرائع ابلاغ

ایڈورڈ سعید

مترجم

ظہیر جاوید

مقتدرہ قومی زبان ★ پاکستان

اسلام اور مغربی ذرائع ابلاغ ایڈورڈ سعید
مترجم ظہیر جاوید
مقتدرہ قومی زبان ★ پاکستان

مصنف اور کتاب

ایڈورڈ سعید ۱۹۳۵ء میں پیدا ہوئے اور ۲۰۰۳ء میں انتقال کر گئے، ان کی پیدائش بیت المقدس میں ہوئی اور جب فلسطین کا تنازع کھڑا ہوا تو ان کا خاندان ہجرت کر کے قاہرہ میں آباد ہو گیا، ایڈورڈ نے ابتدائی تعلیم بیت المقدس اور قاہرہ میں حاصل کی، اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا آئے، پرنسٹن سے گریجویشن، ہارورڈ سے ماسٹرز اور پی ایچ ڈی کی اور نیویارک کی کولمبیا یونیورسٹی میں پروفیسر ہو گئے، ان کا علم بڑا جامع اور وسیع تھا، اس لیے وہ بے شمار امریکی یونیورسٹیوں کے مہمان پروفیسر رہے اور یورپ کی یونیورسٹیاں ان کے لیکچر کا اہتمام کرتی رہیں، ایڈورڈ سعید، یورپ، ایشیا اور مشرق وسطیٰ کے کئی اخباروں میں بھی لکھتے تھے، پھر انھوں نے موسیقی پر بھی بڑا کام کیا ہے۔

۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ نے ایڈورڈ سعید کو معمول کی زندگی سے ہٹا کر اس راستے پر ڈالا، جس نے انھیں پہچان، عزت اور شہرت دی، ہوا یوں کہ جب اسرائیلی وزیر اعظم گولڈا میئر نے کہا ''فلسطینی کہیں بھی کوئی معنی نہیں رکھتے، ان کا کوئی وجود نہیں ہے'' تو ایڈورڈ نے ۱۹۷۹ء میں پہلا سیاسی مضمون لکھا، جس میں فلسطینیوں کا دفاع کیا گیا تھا، ایڈورڈ کی ناموری کے سفر کا یہ آغاز تھا اور اس راہ پر چلتے ہوئے انھوں نے بائیس شہرہ آفاق کتابیں لکھیں جن کا پینتیس زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے، ایڈورڈ کا یہ ایمان رہا ہے کہ مغربی میڈیا، خاص طور پر امریکی میڈیا نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو سخت رویہ اختیار کر رکھا ہے وہ تاریخ، ثقافت یا کسی اور حوالے سے درست ثابت نہیں ہوتا البتہ جھوٹ کے اس پلندے نے امریکا اور یورپ کے عوام کی سوچ پر ایک انمٹ چھاپ لگا دی ہے اور امریکی حکومت کو بھی جکڑ رکھا ہے۔

زیر نظر کتاب میں مسلمانوں اور مسلم ممالک کے متعلق مغربی طاقتوں کے اسی رویے کو موضوع بحث بنایا گیا ہے، انھوں نے بے شمار، مغربی سکالروں، رپورٹروں، کالم نگاروں کی تحریروں، اخباروں کے اداریوں، ریڈیو اور ٹیلی وژن پروگراموں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور مستند حوالوں سے مغرب کی فکری خامیوں کی نشاندہی کی ہے، دلائل سے ان کے مفروضوں کو غلط ثابت کیا ہے، اس اعتبار سے یہ کتاب، اسلام، اہل عرب اور فلسطین کا بہترین دفاع ہے۔

ظہیر جاوید

اسلام اور مغربی ذرائع ابلاغ

ایڈورڈ سعید

مترجم

ظہیر جاوید

مقتدرہ قومی زبان ★ پاکستان

۲۰۰۷ء

عالمی معیاری کتاب نمبر ISBN ۹۷۸-۹۶۹-۴۷۴-۱۸۰-۴

☆

طبع اول	....	۲۰۰۷ء
تعداد	....	۱۵۰۰
قیمت	....	=/۲۵۰ روپے
فنی تدوین	....	عبدالرحیم خان
ترتیب وصفحہ بندی	....	منظور احمد/فخر زمان
اہتمامِ اشاعت	....	حاجی غلام مہدی
طابع	....	ورڈ میٹ پرنٹر، اسلام آباد
ناشر	....	پروفیسر فتح محمد ملک صدر نشین مقتدرہ قومی زبان، ایوانِ اُردو، پطرس بخاری روڈ، ایچ۔۸/۴، اسلام آباد، پاکستان۔

مطبوعات ترقیاتی منصوبہ : ۵

کابینہ ڈویژن، حکومت پاکستان

''سائنسی، تکنیکی وجدید عمومی موادِ خواندگی کی قومی زبان (اُردو) میں تیاری''

پیش لفظ

صلیبی جنگوں کے عہد سے لے کر دورِ حاضر میں دُنیائے اسلام کے خلاف جاری نیٹو دہشت گردی تک مغربی دُنیا اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اپنے خبثِ باطن کا اظہار کرتی چلی آ رہی ہے۔ ہر چند یہ اظہار برملا نہیں بلکہ بین السطور روا رکھا جا رہا ہے تاہم یورپ اور امریکہ کا پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں جس جس نوعیت کے جو جو پروگرام بھی پیش کرتا چلا آ رہا ہے اُنھیں پڑھیں یا دیکھیں سُنیں تو مولانا الطاف حسین حالؔی کا درج ذیل شعر یاد آنے لگتا ہے۔

کچھ کذب و افترا ہے، کچھ کذب حق نما ہے
یہ ہے بضاعت اپنی اور یہ ہے دفتر اپنا

کولمبیا یونیورسٹی میں انگریزی زبان وادب کے مرحوم اُستاد اور عہدِ حاضر کے نامور دانشور ایڈورڈ سعید (۱۹۳۵ء-۲۰۰۳ء) نے اپنی کتاب "Covering Islam" میں مغربی ذرائع ابلاغ کی اس حکمت اور حکمت عملی کو کمال خوبی کے ساتھ بے نقاب کیا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت افروز دستاویز ہے جسے ہماری یونیورسٹیوں کے ابلاغ عامہ کے شعبہ جات میں پڑھانا لازم قرار دیا جانا چاہیے۔ وطنِ عزیز کی دانش گاہوں کی اس سنگین ضرورت کے پیش نظر مقتدرہ قومی زبان نے اپنے ترقیاتی منصوبے ''سائنسی، تکنیکی وجدید عمومی موادِ خواندگی کی قومی زبان (اُردو) میں تیاری'' میں اس عہد آفریں کتاب کو اُردو میں منتقل کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

یہ ہماری خوش بختی ہے کہ مرحوم چراغ حسن حسرت کے فرزند ارجمند جناب ظہیر جاوید صاحب نے اس باب میں ہماری درخواست کو پذیرائی بخشی اور یوں ہم اس قابل ہوئے کہ یہ کتاب اہلِ فکر ودانش اور پاکستانی دانش گاہوں میں زیرِ تربیت ابلاغ عامہ کے طالب علموں کی خدمت میں پیش کر سکیں۔ میں مرحوم

ایڈورڈ سعید صاحب اور جناب ظہیر جاوید صاحب ہر دو کا احسان مند ہوں کہ اوّل الذکر نے اس بے حد اہم تصنیف کے اُردو میں ترجمے کی اجازت مرحمت فرمائی اور ثانی الذکر نے اسے اُردو زبان کا قالب عطا کیا۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم ایڈورڈ سعید کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور برادرِ مکرم ظہیر جاوید صاحب کے زورِ قلم کو اور بھی زیادہ کرے۔

——— پروفیسر فتح محمد ملک

فہرست

☆☆☆

دیباچہ

ایڈورڈ سعید 1935 میں پیدا ہوئے اور 2003ء میں انتقال کر گئے، ان کی پیدائش بیت المقدس میں ہوئی، اور جب فلسطین کا تنازع کھڑا ہوا تو ان کا خاندان ہجرت کر کے قاہرہ میں آباد ہو گیا، ایڈورڈ نے ابتدائی تعلیم بیت المقدس اور قاہرہ میں حاصل کی، اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا آئے، پرنسٹن سے گریجویشن، ہارورڈ سے ماسٹرز اور پی ایچ ڈی کی، اور نیو یارک کی کولمبیا یونیورسٹی میں پروفیسر ہو گئے، ان کا علم بڑا جامع اور وسیع تھا، اس لیے وہ بے شمار امریکی یونیورسٹیوں کے مہمان پروفیسر رہے اور یورپ کی یونیورسٹیاں ان کے لیکچر کا اہتمام کرتی رہیں، ایڈورڈ سعید، یورپ، ایشیا اور مشرق وسطیٰ کے کئی اخباروں میں بھی لکھتے تھے، پھر انھوں نے موسیقی پر بھی بڑا کام کیا ہے۔

1967ء کی عرب اسرائیل جنگ نے ایڈورڈ سعید کو معمول کی زندگی سے ہٹا کر اس راستے پر ڈالا، جس نے انھیں پہچان، عزت اور شہرت دی، ہوا یوں کہ جب اسرائیلی وزیر اعظم گولڈا میئر نے کہا کہ ''فلسطینی کہیں بھی کوئی معنی نہیں رکھتے، ان کا کوئی وجود نہیں ہے'' تو ایڈورڈ نے 1969ء میں پہلا سیاسی مضمون لکھا، جس میں فلسطینیوں کا دفاع کیا گیا تھا، ایڈورڈ کی ناموری کے سفر کا یہ آغاز تھا اور اس راہ پر چلتے ہوئے انھوں نے بائیس شہرہ آفاق کتابیں لکھیں جن کا پینتیس زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے، ایڈورڈ کا یہ ایمان رہا ہے کہ مغربی میڈیا، خاص طور پر امریکی میڈیا نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو سخت رویہ اختیار کر رکھا ہے وہ تاریخ، ثقافت یا کسی اور حوالے سے درست ثابت نہیں ہوتا البتہ جھوٹ کے اس پلندے نے امریکا اور یورپ کے عوام کی سوچ پر ایک انمٹ چھاپ لگا دی ہے اور امریکی حکومت کو بھی جکڑ رکھا ہے۔

زیر نظر کتاب میں مسلمانوں اور مسلم ممالک کے متعلق مغربی طاقتوں کے اسی رویے کو موضوع بحث بنایا گیا ہے، انھوں نے بے شمار مغربی سکالروں، رپورٹروں، کالم نگاروں کی تحریروں، اخباروں کے اداریوں، ریڈیو اور ٹیلی وژن پروگراموں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور مستند حوالوں سے مغرب کی فکری خامیوں کی نشاندہی کی ہے، دلائل سے ان کے مفروضوں کو غلط ثابت کیا ہے، اس اعتبار سے یہ کتاب، اسلام، اہل عرب اور فلسطین کا بہترین دفاع ہے۔

ظہیر جاوید

ونٹیج ایڈیشن کا تعارف

کورنگ اسلام کی اشاعت کو پندرہ برس ہو گئے ہیں، ان پندرہ برسوں کے دوران امریکا اور مغربی میڈیا نے مسلمانوں اور اسلام کو کچھ اس طرح سے کڑی تنقید کا نشانہ بنائے رکھا ہے کہ میں نے اپنی کتاب کی پہلی اشاعت میں مسلمانوں اور اسلام کے خلاف جس مبالغہ آمیزی، نہ تبدیل ہونے والی رائے اور سوچ اور گہری دشمنی کا ذکر کیا تھا وہ ہیچ معلوم ہونے لگی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے مغربی دنیا کی یہ سوچ بڑی پختہ ہو چکی ہے کہ اسلام چونکہ ہائی جیکنگ اور دہشت گردی کا دوسرا نام ہے، اس لیے ایران جیسے مسلم ملک، مغرب اور مغربی زندگی کے انداز واطوار کے لیے کھلا خطرہ بن چکے ہیں، اس وہم نے مغربی دنیا کا یہ حال کر دیا ہے کہ وہ مسلمانوں کی خیالی سازشوں کا تصور باندھتی، اس خوف سے سہمی رہتی ہے کہ ابھی عمارتیں دھماکے سے اڑ جائیں گی، تجارتی ہوائی جہاز سبوتاژ ہوں گے، پانی کی سپلائی لائنوں کو زہر آلود کر دیا جائے گا، اس مخصوص اور معلوم اندازِ فکر نے مغربی ''ماہرین'' کی ایک فوج تیار کر دی ہے، اب جب اور جہاں کوئی بحران پیدا ہوتا ہے، یہ ماہرین خبروں کے پروگراموں اور ٹاک شوز میں آ دھمکتے ہیں اور اسلام کے متعلق اپنی گھسی پٹی سوچ کو، نمایشی اور رسمی انداز میں بیان کرنے لگتے ہیں، ان پروگراموں کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ پادریوں کے، جس مذہبی انداز کو غیر معتبر قرار دیا جا چکا تھا اور اسلام کے متعلق سفید فاموں سے ہٹ کر مشرقی علوم کے ماہرین کے جو خیالات کبھی کے رد ہو چکے ہیں، اس خیال اور اس انداز کو پھر سے اختیار کیا جا رہا ہے، آگے لایا جا رہا ہے، اور یہ سب کچھ ایسے وقت میں ہو رہا ہے، جب دوسرے ثقافتی گروہوں کے متعلق نسلی اور مذہبی غلط بیانی کو عقل و خرد سے عاری انداز میں پھیلانے کا زمانہ کبھی کا گزر چکا ہے، ایسے میں ان ''ماہرین'' کا اور ان کے خیالات کا، اہمیت اختیار کرنا بڑا تشویشناک ہے، اور اس لیے تشویشناک ہے کہ یہ لوگ مباحثوں میں مسلمانوں کی ذہنیت، ان کے کردار، مذہب، ثقافت کے متعلق الگ الگ یا بحیثیت مجموعی جو کچھ کہتے ہیں، اسے آج کے دور میں افریقیوں، یہودیوں، دوسرے مشرقی یا ایشیائی باشندوں کے متعلق بھی نہیں کہا جا سکتا، اس بات کو یوں سمجھیے کہ آج کے مغرب میں اگر کسی غیر ملکی کلچر کو کلنک کا ٹیکا قرار دینا مقصود ہوتا ہے، تو مغربی میڈیا کسی اور کو اپنا نشانہ نہیں

بناتا بلکہ اسلام کے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان پندرہ برسوں میں ایران، سوڈان، عراق، صومالیہ، افغانستان اور لیبیا جیسے مسلم ممالک نے اور مسلمانوں نے اشتعال انگیزیاں کی ہیں اور انھوں نے کئی تشویشناک واقعات کو جنم دیا ہے، ان واقعات کا ایک اختصار نامہ آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں، جو یوں ہے کہ 1983ء کے دوران لبنان میں بم دھماکے سے 240 کے قریب امریکی میرینز ہلاک ہوئے، اس دھماکے کی ذمہ داری ایک مسلم گروپ نے قبول کی، پھر اسی سال بیروت کے امریکی سفارتخانے پر خودکش حملہ ہوا، اس میں بھی کافی جانی نقصان ہوا، 1980ء کی دہائی میں لبنان کے شیعہ گروپوں نے کئی امریکیوں کو اغوا کیا اور طویل عرصے تک قید کیے رکھا، کئی طیارے ہائی جیک ہوئے، جن میں سب سے زیادہ بدنام ٹی ڈبلیو اے کی پرواز تھی، جسے ایک مسلم گروپ نے 1985ء میں 14 سے 30 / جون تک بیروت کے ہوائی اڈے پر روکے رکھا، اسی دوران فرانس میں بم کے کئی دھماکے ہوئے، 1988ء میں پین ایم کی فلائیٹ 109 سکاٹ لینڈ کے شہر لوکربی (Lockerbie) کے اوپر پرواز کے دوران دھماکے سے تباہ ہوئی، یہ دھماکا بھی مسلم دہشت گردوں نے کیا، اسی عرصے میں ایران کو ایک نئی شناخت ملی، اسے لبنان، اردن، سوڈان، فلسطین، مصر، سعودی عرب، اور دوسرے علاقوں میں باغی گروپوں کا حامی اور پشت پناہ سمجھ لیا گیا، یہی وہ زمانہ ہے جب افغانستان پر سوویت قبضہ ختم ہوا اور افغان مسلم گروپوں اور قبیلوں کے درمیان لڑائی چھڑ گئی، کئی مسلم باغی گروپوں، خاص طور پر طالبان نے جنھیں امریکا نے جنگی تربیت دی تھی، اسلحہ اور سرمایہ بھی فراہم کیا تھا، ملک کے بڑے حصہ پر قبضہ کر لیا، امریکا سے چھاپہ مار جنگ کی تربیت حاصل کرنے والے کچھ افراد افغانستان کی بجائے دوسرے علاقوں کی طرف نکل گئے، ان میں وہ شیخ عمر عبدالرحمان[1] بھی ہیں، جنھیں 1993ء میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی تباہی کا منصوبہ بنانے کا مجرم قرار دیا جا چکا ہے اور جو اس وقت مشرق وسطیٰ میں امریکا کے اہم اتحادیوں، مصر اور سعودی عرب کے باشندوں میں بے چینی پھیلانے میں مصروف ہیں، اس منظرنامے میں سلمان رشدی کے خلاف (امام) خمینی کے فتوے کی ایک الگ اہمیت ہے، یہ فتویٰ 14 / فروری 1989ء کو جاری ہوا، اور اس میں سلمان رشدی کے قتل کے لیے لاکھوں ڈالر کا

1۔ شیخ عمر عبدالرحمٰن مصری مبلغ ہیں، نابینا ہیں، جامعہ الاظہر سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد انھوں نے مصر کی عسکری تنظیموں، جماعت اسلامی اور اسلامی جہاد سے قریبی تعلق قائم کیا تھا، ان کے فتوے پر ہی اسلامی جہاد نے مصری صدر انوار السادات کو قتل کر دیا تھا۔ اس پاداش میں یہ تین سال جیل میں رہے اس کے بعد جب انھیں مصر سے نکال دیا گیا تو یہ افغانستان چلے گئے اور اس المکتب الخدمت کے ساتھ ہو لیے جس نے بعد میں القاعدہ کی شکل اختیار کی، شیخ عمر بن عبدالرحمٰن نے دنیا بھر سے افغان جہاد کے لیے رضاکار بھرتی کرنے کا کام سنبھالا، اس کے بعد وہ امریکا میں جا آباد ہوئے۔ 1993ء میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے نچلے حصے میں بارود سے بھرے ہوئے ایک ٹرک کو دھماکے سے اڑایا گیا، شیخ عمر پر اس سازش کا منصوبہ تیار کرنے کا الزام ہے اور اسی کی پاداش میں انھیں عمر قید کی سزا ہوئی ہے۔ ان کے ساتھ نو دوسرے افراد بھی قید کاٹ رہے ہیں جن میں رمزی یوسف بھی شامل ہیں۔ (مترجم)

جو انعام مقرر کیا گیا تھا، اس نے مغرب کے اس تصور کو تقویت دی کہ اسلام انتقام کا مذہب ہے، چنانچہ اسے لے کر بڑی الٹی سیدھی باتیں بنائی گئیں اور اس سے یہ تاثر بھی لیا گیا کہ اسلام جدیدیت اور روشن خیالی کا نہ صرف دشمن ہے بلکہ مغرب کو چیلنج کرنے، مشتعل کرنے اور اسے دھماکے سے اڑانے کے لیے سمندروں کو عبور کر کے اس تک پہنچنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔

1983ء کے بعد جگہ جگہ سے اسلام پر مسلمانوں کے اظہار، یقین اور ایمان کی خبریں آنے لگی تھیں ان سے ہی پتا چلا کہ الجزائر میں مسلمانوں نے میونسپل الیکشن میں کامیابی حاصل کر لی تھی، مگر فوج نے انھیں ملک کا اقتدار حاصل کرنے سے روک دیا ہے، اس واقعہ کے بعد سے الجزائر خانہ جنگی میں پھنسا ہوا ہے اور عسکریت پسند، الجزائری فوج کے ساتھ ٹکرا رہے ہیں اور اس ٹکراؤ نے ہزاروں دانشوروں، صحافیوں، فنکاروں اور ادیبوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے، اسی طرح اب سوڈان پر عسکریت پسند اور اسلامی پارٹی کی حکومت ہے، جس کے سربراہ حسن الترابی ہیں، ان کا ذکر اکثر کینہ پرور کے طور پر کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ وہ اسلام کے لبادے میں سیونگلی[1] اور سیونارولا[2] ہیں، مصر کے حالات بھی دوسروں سے کچھ مختلف نہیں ہیں، وہاں بھی مسلم حملہ آوروں نے درجنوں بے گناہ یورپی اور اسرائیلی سیاحوں کو قتل کر دیا ہے، اس ملک میں اخوان المسلمین اور جماعت اسلامی کی قوت، پچھلے ایک عشرے کے دوران بہت بڑھ گئی ہے اور یہ دونوں ہی نہ صرف ایک دوسرے سے بڑھ کر متشدد ہیں، بلکہ ان میں سے کوئی بھی مصالحت کی طرف مائل نہیں ہے، دسمبر 1987ء میں جب مقبوضہ مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی کے علاقے میں انتفادہ شروع ہوا، تو اسرائیل نے اس علاقے کی ایک جماعت کی اس لیے حمایت کی تھی تاکہ پی ایل او کی گرفت کو کمزور کیا جا سکے، اب صورت یہ ہے کہ حماس کے ساتھ ساتھ اسلامی جہاد بھی بہت خوفناک انداز میں ابھر کر سامنے آ گیا ہے، ان دونوں سے سب نہ صرف ڈرتے ہیں بلکہ صحافی، اسلامی انتہا پسندی کی مثالیں ان کے کارناموں سے ہی لیتے ہیں، خودکش دھماکے، شہریوں کی بسوں کی تباہی، اسرائیلی شہریوں کی ہلاکت جیسے، بھیانک واقعات کو ان کے جرائم کی فہرست میں شامل کیا جاتا ہے، حزب اللہ کے چھاپہ مار بھی، ان سے کم خوفناک نہیں ہیں، امریکی میڈیا میں انھیں عام طور پر دہشت گرد ظاہر کیا جاتا ہے جبکہ حزب اللہ کے چھاپہ مار خود کو مزاحمت کار قرار دیتے ہیں اور مقامی طور پر ان کے متعلق تاثر بھی یہی ہے کہ اسرائیل نے جنوبی لبنان کے جس علاقے کو نام نہاد حفاظتی پٹی قرار دے کر اس پر

1۔ جارج ڈوموریئر (George du Maurier) کے ناول ٹرلبائی (Trilby) کا افسانوی کردار جو ہپناٹزم کا ماہر ہے اور بری نیت سے دوسروں کو اپنی مرضی کا تابع بناتا ہے۔ (مترجم)

2۔ اطالوی پادری (1452-1498ء) جو یورپ کی نشاۃ ثانیہ کا زبردست مخالف تھا، کتابیں اور فن پارے جلا دیتا تھا، اپنی مرضی کی مذہبی اصلاحات رائج کرتا تھا۔ (مترجم)

قبضہ کر رکھا ہے یہ چھاپہ مار اسی قبضے کو ختم کرانے کے لیے لڑ رہے ہیں۔

اس تناظر میں ایک عالمی کانفرنس مارچ 1996ء میں منعقد کی گئی تھی، جس میں بہت سے سربراہان مملکت نے شرکت کی ان میں صدر بل کلنٹن (Bill Clinton)، وزیر اعظم شمعون پیریز (Shimon Peres)، صدر حسنی مبارک، اور چیئرمین یاسر عرفات شامل تھے، یہ کانفرنس مصری بندرگاہ، شرم الشیخ میں ہوئی تھی، اس میں ''دہشت گردی'' کو موضوع بحث بنایا گیا تھا، اور دہشت گردی کے الزام کو ثابت کرنے کے لیے اسرائیلی شہریوں پر تازہ ترین خودکش حملوں کی مثال دی گئی تھی، اس کانفرنس سے پیریز کا خطاب دنیا بھر میں نشر ہوا، اور اِس میں اُس نے اِس شک وشبے کی کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی کہ دہشت گردی کے واقعات کی ذمہ داری اسلام اور ایران کی اسلامی جمہوریہ پر عائد ہوتی ہے، پیریز کے اِس بیان سے امریکا میں خاص طور پر اور مغربی دنیا میں عمومی طور پر میڈیا، اسلام کے خلاف اِس قدر بھڑک اٹھا کہ جب اپریل 1995ء میں اوکلاہوما (Oklahoma) شہر میں بم کا دھماکا ہوا تو چاروں طرف سے یہ آواز سنائی دینے لگی کہ مسلمانوں نے ایک بار پھر وار کر دیا ہے، مجھے یہ بات یاد کرتے ہوئے دلی تکلیف ہوتی ہے کہ اس واقعہ کے فوری بعد مجھے کوئی پچیس ٹیلی فون آئے ہوں گے، یہ فون اخباروں، ٹیلی وژن کے بڑے اداروں اور متعدد ذمہ دار رپورٹروں کے تھے اور وہ اس مفروضے پر مجھ سے رابطہ کر رہے تھے کہ میرا تعلق چونکہ مشرق وسطیٰ سے ہے اور میں اُس کے متعلق لکھتا بھی رہتا ہوں، اس لیے دوسرے لوگوں کی بہ نسبت مجھے اس واقعہ کے بارے میں کچھ زیادہ ہی معلوم ہوگا، مغرب نے عربوں اور مسلمانوں کا، دہشت گردی کے ساتھ جو فرضی تعلق جوڑ رکھا تھا، اس سے پہلے وہ مجھ پر اتنی شدت کے ساتھ ظاہر نہیں ہوا تھا، مگر اس دن اپنے آپ کو اچھی طرح جانتے ہوئے بھی کہ میرا اس طرح کی سرگرمیوں سے کوئی تعلق نہیں ہوسکتا، مجھے اس واقعہ میں ملوث ہونے کا شدید مجرمانہ احساس ہوا، ٹیلی فون پر مجھ سے جو رابطے کیے گئے ان کا مقصد مجھے یہی احساس دلانا تھا اور مجھے یہ احساس دلا دیا گیا مختصر یہ کہ میڈیا نے مجھے اور اسلام کو نشانہ بنایا، یا دوسرے الفاظ میں میرے ساتھ اس سلوک کی وجہ اسلام کے ساتھ میرا تعلق تھا۔

میرے خیال میں بوسنیا کے مسلمانوں کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہوگا، انھیں بھی اسلام کے ساتھ تعلق کی سزا دی گئی تھی، انھیں ان کے اپنے ہم وطن سرب باشندوں نے اسی لیے لسانی تعصب کا نشانہ بنایا ہوگا تاکہ دوسروں کے بھی کان ہو جائیں، اس سلسلے میں ڈیوڈ ریف (David Rieff) اور بعض دوسرے افراد کا کہنا ہے کہ یورپی ممالک اور امریکا نے ان کی مدد کے لیے بروقت قدم نہیں اٹھایا تھا بلکہ ظلم و بربریت کی لہر کے گزر جانے کے بہت بعد یہ میدان میں آئے تھے، جس وقت بوسنیا کا سانحہ پیش آیا اس وقت مغربی عوام ذہنی

طور پر اس موڑ تک پہنچ چکے تھے کہ مسلمان جارح ہیں، انھیں جارح سمجھنا اور ان کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہیے، جس کا ایک جارح مستحق ہے، چنانچہ ان سے گالم گلوچ کرنا، انھیں دھمکیاں دینا، ان پر پابندیاں لگانا، انھیں دوسروں سے الگ تھلگ رکھنا اور بسا اوقات ان پر ہوائی حملے کرنا، نہایت مناسب سلوک ہے، ایسے میں جب اقوام متحدہ نے بڑے پیمانے پر یہ کوشش کی کہ بوسنیا کے مسلمانوں کی انسانی بنیادوں پر مدد کی جائے، تو اس ماحول میں یہ بات بڑی انوکھی معلوم ہوئی، مسلمانوں کے ساتھ سلوک کی اس بات کو اگر ہم آگے بڑھائیں تو کئی انسانیت سوز باتیں سامنے آتی ہیں، ان میں چیچنیا کے مسلمانوں کو کچلنے کے وہ خونی اقدامات بھی شامل ہیں جو روس نے کیے اور لیبیا اور عراق کے ساتھ امریکا کا سلوک بھی ہے، اول الذکر پر اپریل 1986ء میں امریکا نے جب بمباری کی تو شام کا پُر ہجوم وقت تھا لوگ تفریح اور خریداری میں مصروف تھے کہ ان پر آسمان سے آگ برسنے لگی، لیبیا کے بعد عراق کو بھرپور جنگ کا نشانہ بنایا گیا، 1993ء اور 1996ء میں امریکا نے اس پر ہوائی حملے کیے، جن میں سے زیادہ تر کو سی این این (CNN) پر دکھایا بھی گیا، اس بمباری سے معصوم شہریوں کا بھاری جانی اور مالی نقصان ہوا، مگر مغرب میں ان کی مذمت کے بجائے، عوام کی اکثریت نے ان حملوں کو اس لیے درست قرار دیا کہ انھیں پہلے ہی ہموار کیا جا چکا تھا، اسی طرح 1992ء میں امریکا نے جب مسلم صومالیہ میں انسانی بنیادوں پر مداخلت کی تو کسی کو اس میں کوئی دلچسپی ہی نہ تھی اور جس طرح دس سال پہلے لبنان میں ایسی ہی مداخلت بدنظمی کا شکار ہوگئی تھی، اسی طرح صومالیہ کے لیے انسانی امداد کا بھی حشر کچھ مختلف نہ ہوا، عراق، لیبیا، چیچنیا اور بوسنیا کے جن حالات کا میں نے ذکر کیا اور جن وجوہ کی بنا پر یہ حالات وقوع پذیر ہوئے وہ اگرچہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن دنیا بھر میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کی نظر میں مشترک بات صرف اور صرف یہ ہے کہ مغرب، خاص طور پر ''عیسائی'' قوتیں اور عوام، اسلام کے خلاف ایک لمبی جنگ لڑنے کے لیے لام بندی کر رہے ہیں، مسلمانوں کی یہ سوچ اور مسلمانوں کے متعلق مغرب کی وہ سوچ جسے اوپر بیان کیا گیا ہے، ان دونوں نے، دشمنی کو گہرا کر دیا ہے، اور مختلف ثقافتوں کے درمیان مذاکرات التوا کا شکار ہوگئے ہیں، بہت سے مسلمانوں نے یہ لکھا اور کہا ہے کہ اگر بوسنیا' فلسطین اور چیچنیا کے متاثرین مسلمان نہ ہوتے اور اگر ''اسلام'' کو ''دہشت گردی'' کا سرچشمہ نہ سمجھا جاتا، تو مغربی طاقتوں نے ان علاقوں کے متاثرین کے لیے جس قدر کیا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ کرتے، ان تمام واقعات اور حالات کو دیکھتے ہوئے ذہن میں ایک سوال آتا ہے کہ آخر اسرائیل نے بھی تو کچھ مسلم علاقوں پر قبضہ کر رکھا ہے اور کچھ عرب مسلم علاقوں کو اپنے ملک میں مدغم بھی کر لیا ہے، آخر اسے اس بات کی سزا کیوں نہیں دی جاتی پھر مسلم ممالک اور مسلم عوام کو خاص طور پر

حقارت اور غیر متوازن، وحشیانہ جارحیت کا نشانہ کیوں بنایا جاتا ہے؟ اور یہ نوبت کیوں آ گئی ہے کہ امریکیوں کی اکثریت، اسلام کو فساد کا دوسرا نام قرار دیتی ہے۔

ان مخصوص حالات میں ہمارے سامنے جو نقشہ ابھرتا ہے وہ بڑا پیچیدہ ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ تمام مسلم ممالک میں جذبات کی ایک تازہ لہر دوڑ رہی ہے اور مغربی اور اسرائیلی اہداف پر منظم اور غیر منظم حملے ہو رہے ہیں، ان سے ہٹ کر جب ہم مسلم دنیا پر نظر دوڑاتے ہیں تو وہ ہمیں پسماندہ دکھائی دیتی ہے اور اس کے اندر کے حالات بڑے مایوس کن نظر آتے ہیں، ہمیں مسلم دنیا کے ہر شعبے میں پیداواری صلاحیت زوال پذیر ملتی ہے، سنسر شپ جیسے اقدامات کا شمار حالات کو بہتر بنانے کی کاوشوں میں ہوتا ہے، ان ممالک میں زیادہ تر ایسے ہیں جن میں جمہوریت نہیں ہے، آمریت کا زور ہے اور اس نے لوگوں کی ہمت کو توڑ کر رکھ دیا ہے، آمریت میں جبر کے ساتھ حکمرانی کرنے اور لوگوں کو سختی کے ساتھ کچل دینے کا جذبہ اِسی لیے نمایاں ہوتا ہے، ان آمروں میں سے کچھ تو تشدد، دہشت گردی اور جنسی اعضا کو کاٹ دینے کی حد تک بڑھتے ہوئے تشدد کی بھی حوصلہ افزائی کرتے ہیں، ان میں دوسروں کے ساتھ ساتھ سعودی عرب، مصر، عراق، سوڈان، اور الجزائر جیسے اہم اسلامی ممالک شامل ہیں، میں جب ان باتوں پر غور کرتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے سادہ لوح لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے جن کے ذہنوں پر ساتویں صدی کے مکہ کا ایک دھندلا سا خاکہ نقش ہے، اس بات کو اپنا عقیدہ بنالیا ہے کہ اسلامی دنیا کی خرابیوں کا تمام تر علاج مکہ میں ہے، میں جب مسلم دنیا میں پھیلی ہوئی آمریت کو اس عقیدے کے ساتھ جوڑتا ہوں تو میرے سامنے کوئی دلکش تصویر نہیں ابھرتی۔

مجھے تشویش اس بات کی ہے کہ جب اسلام کی وضاحت کرنے یا بلا امتیاز اس کی مذمت کرنے کے لیے اسلام کا لیبل استعمال کیا جاتا ہے تو اس کا محلِ استعمال ایسا ہوتا ہے کہ اس کا نتیجہ ہمیشہ اسلام پر حملہ ہی نکلتا ہے، اس طرح ان لوگوں کے ساتھ کشیدگی بڑھتی ہے، جنھوں نے اپنے آپ کو خود ہی مسلمانوں اور مغرب کا ترجمان مقرر کرلیا ہے اور جو اس لیبل کو اسی مخصوص انداز میں استعمال کرتے ہیں، یہ لوگ جس اسلام کا ذکر کرتے ہیں اس سے اسلامی دنیا میں ہونے والے واقعات کا، اس لیے بہت محدود تعلق بنتا ہے کہ ان کی توجہ اس بات پر نہیں ہوتی کہ اسلامی دنیا ایک ارب لوگوں، درجنوں ممالک، مختلف معاشروں، مختلف روایات، مختلف زبانوں اور بلاشبہ لامحدود مختلف تجربات پر مشتمل ہے، یہ مختلف معاشرے، یہ روایات، یہ زبانیں، اسلام نہیں ہیں، ان کی اسلام سے الگ ایک حیثیت ہے، اس لیے ان سے جنم لینے والے واقعات کو اسلام سے جوڑنا غلط ہے؛ یہ بڑی سامنے کی بات ہے اس لیے امریکا، برطانیہ، اسرائیل میں موجود مستشرقین چاہے کتنا ہی زور

کیوں نہ لگائیں اور چاہے کتنا ہی نزاع کیوں نہ پیدا کریں، ان کا یہ اصرار بے بنیاد ہے کہ اسلامی معاشرے میں اوپر سے نیچے تک ہر کام اسلام کے مطابق ہوتا ہے، دارالسلام وہ واحد ادارہ ہے، جس کی سنی جاتی ہے اور مسلم ممالک میں مسجد اور ریاست ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں، مجھے اپنی اس کتاب میں یہی ثابت کرنا ہے کہ اسلام کے متعلق اس انداز میں سوچنا انتہائی غیر ذمہ دارانہ فعل ہے، اس لیے اسے قبول نہیں کیا جاسکتا، حیرت ہے کہ جس قسم کی باتیں دنیا کے کسی دوسرے مذہب، کسی ثقافت یا آبادی کے بارے میں نہیں کی جاتیں، اسلام کو بلا تامل ان کا نشانہ بنالیا جاتا ہے، آخر کیوں؟ اگر مغربی معاشروں کا سنجیدگی سے مطالعہ کرنا مقصود ہو تو ہم سے کس طرزِ عمل کی توقع کی جائے گی؟ ظاہر ہے کہ ہم پہلے مغرب کے پیچیدہ نظریات، ان کے رنگ برنگی معاشرتی ڈھانچے کے ضخیم تجزیوں، مغربی تاریخ، اس کی ثقافت کے مختلف ادوار اور مشکل تجزیاتی زبانوں کا مطالعہ کریں گے، اُس کے بعد مغرب پر رائے زنی ہوسکے گی؟ کیا ہم یہ توقع نہیں کرسکتے کہ اسلام کے مطالعے اور مغرب میں مسلم معاشروں پر بحث کے لیے بھی اسی اصول کو اپنایا جائے؟

ہمیں مغرب میں اسلام کے مطالعے کی کوئی ایسی تحریک نظر نہیں آتی، البتہ صحافی اکثر و بیشتر اسلام پر جمع خرچ کرتے دکھائی دیتے ہیں، مغربی میڈیا ان کے افکار کی طرف لپکتا ہے اور اسے ڈرامائی انداز میں پیش کردیتا ہے، مشکل یہ ہے کہ ان اصحاب کے ذہنوں پر ''بنیاد پرستی'' چھائی ہوئی ہے، جس سے وہ اکثر کھیلتے رہتے ہیں، مگر یہ نہیں جانتے کہ بنیاد پرستی کا تو اسلام کی بہ نسبت عیسائیت، یہودیت اور ہندومت سے زیادہ گہرا تعلق ہے، ان لاعلم اصحاب کا مقصد عام قاری کے ذہن میں یہ بات نقش کرانا ہوتا ہے کہ اسلام اور بنیاد پرستی ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں، چنانچہ وہ جان بوجھ کر اسلام اور بنیاد پرستی کے تصور کو اچھالتے رہتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اسلام کا تصور محدود ہو گیا ہے، مسلمانوں کے ایمان، اس مذہب کے بانی، اس مذہب اور مسلم عوام کے متعلق ایک لگی بندھی سوچ پیدا ہوگئی ہے، اس پر ستم یہ کہ ہر منفی چیز کا تعلق اسلام کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے، تشدد، پسماندگی، رجعت پسندی، دہشت زدہ کرنے والی باتوں کی اس لیے تکرار کی جاتی ہے تاکہ یہ کسی کے ذہن سے محو نہ ہونے پائیں، یہ ایسے الفاظ ہیں جنھیں یہ اصحاب بنیاد پرستی کے ذکر میں لڑھکاتے ضرور ہیں مگر بنیاد پرستی کی کہیں سنجیدہ وضاحت نہیں کرسکتے، اسی طرح جب یہ ''انقلابیت''، یا، ''انتہاپسندی'' کا ذکر کرتے ہیں تو انھیں بھی کوئی معنی نہیں پہنا سکتے، پھر جب وہ اپنی گفتگو میں مثال دیتے ہیں کہ پانچ فی صد، دس فی صد یا پچاس فی صد مسلمان بنیاد پرست ہیں، تو ان کے یہ اعداد و شمار بڑے غیر حقیقی اور بے وزن معلوم ہوتے ہیں۔

1991ء سے آرٹس اور سائنسز کی امریکی اکیڈمی (American Academy of Arts and Sciences)، بنیاد پرستی پر ایک کتاب شائع کر رہی ہے، اس کتاب کے لیے بنیاد پرستی کا باقاعدہ مطالعہ ایک گروپ نے کیا ہے جبکہ اس کا اہتمام اکیڈمی نے خود کیا تھا، یہ کتاب پانچ بھاری جلدوں پر مشتمل ہے اور اس کام میں کئی معروف اکیڈمیوں نے ہاتھ بٹایا ہے، جبکہ دو ایڈیٹروں، مارٹن ای مارٹی (Martin E Marty) اور آر۔ سکاٹ ایپل بائی (R. Scott Appleby) کو اس کا انچارج بنایا گیا تھا، اس تمام تر انتظام کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کتاب میں دلچسپ مقالات جمع ہو گئے ہیں، جن میں اسلام کے ساتھ ساتھ یہودیت اور عیسائیت کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے، مگر اسے دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ سارا منصوبہ اسلام کو ذہن میں رکھ کر شروع کیا گیا تھا مگر بات اس رخ پر آگے نہیں بڑھ سکی، جس رخ پر اس کے بڑھنے کی توقع کی گئی تھی، اس کا بھید اس کتاب کے اس تجزیے سے کھلتا ہے جو، آئین لسٹک (Ian Lustick) نے کیا ہے وہ کہتا ہے کہ اس سارے مجموعے میں بنیاد پرستی کی کوئی بامعنی تشریح نہیں ملتی، البتہ یہ احساس ضرور اجاگر ہوتا ہے کہ ایڈیٹروں اور ان کے معاونین نے ''انتہائی کوشش یہ کی ہے کہ بنیاد پرستی کی کوئی تشریح نہ ہونے پائے اور اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے بنیاد پرستی کی تشریح سے اجتناب بھی تجویز کیا ہے'' سوال یہ ہے کہ اگر اس مضمون کے ماہرین بھی بنیاد پرستی کی تشریح سے قاصر ہیں تو ان افراد سے کیونکر کسی بہتری کی توقع کی جا سکتی ہے جو کج بحثی کے کسی پروگرام کے میزبان بنتے ہیں؟ وہ تو اپنے محدود علم کے ساتھ جوش وجذبے اور جارحیت کو ہی ہوا دیں گے ناں، اور اپنے قارئین میں خطرے کے احساس اور سراسیمگی بڑھانے کو ہی اپنی کامیابی سمجھیں گے۔

اس نکتے کو سمجھانے کے لیے میں قومی سلامتی کونسل (National Security Council) کے سابق رکن پیٹر رڈمان (Peter Rodman) کی مثال دوں گا، رڈمان 11 رمئی 1992ء کے نیشنل ریویو (National Review) میں لکھتا ہے کہ ''مغرب کو آج بھی ایک ایسی دہشت ناک عسکری قوت سے خطرہ ہے جو مغربی سیاسی افکار سے نفرت کرتی ہے اور عیسائیت سے اپنی صدیوں پرانی دشمنی کو پال رہی ہے''، پیٹر رڈمان نے اپنی دانست میں ایک قضیے کا محتاط ابتدائیہ پیش کیا ہے۔ مگر اس ابتدائیے پر غور کریں تو اس کے ان افکار کی کوئی بنیاد نظر نہیں آتی، اور جب وہ یہ کہتا ہے کہ ''عیسائیت سے صدیوں پرانی دشمنی کو پال رہی ہے'' تو ان افکار کی تصدیق کرنے کی گنجائش ہی ختم ہو جاتی ہے، عیسائیت کا لفظ استعمال کر کے اس نے اپنی طرف سے اپنی بات میں جذباتیت کا وزن ڈال دیا ہے اور اسی کا سہارا لے کر وہ یوں آگے بڑھتا ہے کہ ''اسلامی دنیا زیادہ تر سماجی دھڑوں میں بٹی ہوئی ہے اور مغرب کے مقابلے میں اس کی مادی کمتری نے اسے مایوسی میں دھکیل دیا ہے، ایسے میں مغربی

ثقافت کے بڑھتے ہوئے اثرات اسے برہم رکھتے ہیں (اس برہمی کو برنارڈ لیوئس (Bernard lewis) نے ''غصے کی سیاست'' کا نام دیا ہے)، چنانچہ مغرب سے اسلامی دنیا کی اس زہریلی دشمنی کو محض جوڑ توڑ قرار نہیں دیا جا سکتا''، لیوئس نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ان کا تو جائزہ میں بعد میں لوں گا، فی الحال رڈمان زیر بحث ہے، اس نے اسلامی دنیا پر احساس کمتری اور غم وغصے کے جو الزامات لگائے ہیں، ان کے ثبوت میں اس نے شہادتیں قلم بند نہیں کیں، بلکہ ایسا فرض کر لیا ہے اور فرض کر لینے کو ہی کافی سمجھا ہے، اس کے پاس اس طرز عمل کا ایک مخصوص جواز موجود ہے اور وہ اس کی یہ سوچ ہے جس کے مطابق مستشرقین نے اپنے ذہنوں میں اسلام کا جو خاکہ بنا لیا ہے، جس طرح وہ اس خاکے کو بیان کر رہے ہیں اور اس بنیاد پر میڈیا نے جو ایک لگا بندھا طرز عمل اختیار کر لیا ہے اس سے کوئی چیز غیر واضح نہیں رہی، ان سے نہ صرف اسلام پر تمام الزامات ثابت ہو چکے ہیں، بلکہ سزا بھی سنائی جا چکی ہے، اس لیے ان الزامات کو درست ثابت کرنے کے لیے اس طرح کے دلائل کی قطعی کوئی ضرورت نہیں ہے، جس قسم کے دلائل، شواہد اور ثبوتوں کی اس وقت ضرورت پیش آتی ہے جب مغربی دنیا یا عیسائیت کو زیر بحث لایا جاتا ہے، عجیب منطق ہے، اس لیے اس مرحلے پر ان ناقدین سے یہ پوچھنا انتہائی مناسب ہوگا کہ کیا ایک ارب مسلمانوں میں سے ہر ایک غصے میں بھرا ہوا، اور احساس کمتری کا مارا ہوا ہے، کیا انڈونیشیا، پاکستان یا مصر کا ہر شہری، مغربی اثر ونفوذ کو ناپسند کرتا ہے؟ یا اصل معاملہ یہ ہے کہ مغربی ناقدین دوسری ثقافتوں اور مذاہب کی طرح اسلام کا اس لیے تجزیہ نہیں کر سکے کہ یہ مذہب، دوسری ثقافتوں اور مذاہب سے ہٹ کر اور عام انسانی تجربات سے مختلف ہے، چنانچہ وہ اپنی کم علمی کو چھپانے کے لیے اس مذہب اور اس کے اندر موجود تمام علم وحکمت کو ایک بیمار ذہنیت کا شاخسانہ بنا کے پیش کر دیتے ہیں۔

ڈینیل پائپس (Daniel Pipes) کا شمار ''اسلام'' کے سخت مخالفوں میں ہوتا ہے اور اسے ایک ایسے مستشرق کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے جو ''اسلام'' کو ایک ڈراؤنی چیز کے طور پر ''پہچانتا'' ہے، دی نیشنل انٹریسٹ (The National Interest) کے موسم خزاں 1995ء کے شمارے میں اس کے ''افکار'' اس عنوان کے ساتھ شائع ہوئے ہیں کہ ''کوئی اعتدال پسند نہیں ہے: اسلام کے بنیاد پرستوں کا جائزہ'' There are No Moderates:) (Dealing with Fundamentalist Islam، اس مضمون میں اس نے اسلام کو انتہا پسندی سے بری قرار نہیں دیا، اور نہ انتہا پسندی کی کوئی تشریح کی ہے، لیکن اس نے غیر انتہا پسند قسم کا جو عنوان رکھا ہے، اس سے ساری بات سمجھ میں آ جاتی ہے، پھر اس کا وہ یوں اظہار بھی کرتا ہے کہ ''اسلام بنیادی طور پر روایتی مذاہب سے ہٹ کر اور میوزنم، فاشزم جیسی دوسری تحریکوں کے قریب تر ہے'' تھوڑا آگے چل کے وہ اپنے اس استدلال کو یوں

آگے بڑھتا ہے کہ ''اگرچہ دوسرے تمام غیر حقیقی نظریات سے بنیاد پرست اسلام مختلف ہے لیکن اپنے دائرہ کار اور آگے بڑھنے کی سوچ کے اعتبار سے یہ ان کے بہت قریب ہے، کمیونزم اور فاشزم کی طرح یہ بھی ہوا میں لہراتے ہوئے نظریات کا پرچار کرتا ہے، اس کا بھی دعویٰ ہے کہ یہ انسان کو بہتر بنانے، ایک نیا معاشرہ تخلیق کرنے کا مکمل پروگرام رکھتا ہے، اس کے پاس اس معاشرے کو پوری طرح اپنے قابو میں رکھنے کی صلاحیت بھی ہے اور اس کے جانباز نہ صرف تیار بلکہ خون بہانے کے لیے بیتاب بھی رہتے ہیں''، پائپس ان ماہرین کا مذاق اڑاتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ سیاسی اسلام نے اپنا سفر بخوبی مکمل کیا ہے، وہ اپنی جوابی دلیل میں کہتا ہے کہ سیاسی اسلام کا عروج آج ہم پر برس رہا ہے، پائپس کا ''بنیاد پرستانہ'' اسلام، تشدد پسند، نامعقول، مصالحت سے عاری اور کسی طور مطمئن ہونے والا نہیں ہے، اس کے نزدیک اس سے پوری دنیا کو، خاص طور پر مغرب کو خطرہ ہے، تاہم امریکی دفتر خارجہ کے اعداد و شمار، پائپس کے افکار کی نفی کرتے ہیں، ان اعداد و شمار کے مطابق مشرق وسطیٰ کی دہشت گردی، واقعات کی تعداد اور شدت کے اعتبار سے دنیا میں چھٹے نمبر پر آتی ہے۔

مختصر یہ کہ بنیاد پرستی برابر ہے، اسلام برابر ہے، ہر اس چیز کے جس سے مغرب کو اسی طرح مقابلہ کرنا ہے جس طرح سرد جنگ کے ایام میں کمیونزم کا مقابلہ کیا گیا تھا، دراصل پائپس کا کہنا ہے کہ اسلام کے ساتھ لڑائی کمیونزم کے خلاف جدوجہد سے زیادہ سنگین اور خطرناک ہوگی، پائپس اور رڈمان کے ان افکار سے اگرچہ ان کی دماغی صحت پر شبہ ہوتا ہے مگر ان دونوں نے نہ تو ایک غیر متعلق شخص کی اور نہ پاگلوں کے ایک گروہ کے رکن کی حیثیت سے اپنے مضامین قلمبند کیے ہیں، وہ بڑی باقاعدگی کے ساتھ لکھتے ہیں اور ان کا واضح مقصد یہ ہوتا ہے کہ پالیسی سازان کے افکار کا سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کریں، اب اگر یہ جاننا ہو کہ، ان کے افکار کتنے مؤثر ہیں تو اس کا اندازہ یو ایس نیوز اینڈ ورلڈ رپورٹ (US News and World Report) کے 6 رجولائی 1987ء کے شمارے سے لگایا جاسکتا ہے، اس شمارے میں لکھا گیا ہے کہ ''بنیاد پرست نہ تو اپنے طرز عمل پر شرمسار ہیں، نہ جھکنے کو تیار ہیں اور یہ ایک ایسی سوچ ہے جس نے اسلامی دنیا کے بڑے حصے کو اپنے اثر میں لیا ہوا ہے، مغرب اس لیے بے خبری میں مار کھا گیا ہے، کیونکہ یہ بات اس کے وہم میں بھی نہیں تھی کہ اسلام کا مذہبی جنون اور اس کے سیاسی مقاصد ایک ہوجائیں گے، چنانچہ انھیں کامیابی کی راہ مل گئی اور انھوں نے ایک ہوکر تشدد کو ابھارا ہے، اگرچہ اس بات کے بہت کم شواہد موجود ہیں کہ بنیاد پرستوں کی اکثریت نے (امام) خمینی کے اعلان کردہ انقلابی مقاصد کی تائید کردی ہے، تاہم اس کا پیغام جس تیزی سے پھیل رہا ہے اس سے اس کی تصدیق ہوتی ہے'' اس مضمون کے کچھ عرصہ بعد 16 راکتوبر 1987ء کو اسی جریدے میں ایک اور مضمون

آیا، جس میں کہا گیا تھا کہ ''شوق شہادت اگرچہ شیعہ مسلک اور ایرانی اسلام کا ایک لازمی حصہ ہے لیکن اب یہ سنی نوجوانوں میں بھی بڑی تیزی کے ساتھ پھیل رہا ہے'' مجھے اس بات کی قطعی سمجھ نہیں آتی کہ اسلام پر بحث کرتے ہوئے آخر مغربی میڈیا میں معقولیت کو کیوں ترک کردیا جاتا ہے، مثال کے طور پر اوپر دیئے گئے بیان کو ہی لیجیے کسی نے یہ پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ جناب یہ کیسے طے کرلیا گیا ہے کہ مراکش سے لیکر ازبکستان تک پھیلے ہوئے لاکھوں سنی نوجوانوں میں اچانک شوق شہادت ابھر آیا ہے، اور اگر ایسا ہے تو اسے ثابت کرنے کے لیے کس قسم کے شواہد جمع کیے گئے ہیں؟

بے پر کی اڑانے کے اس طرز عمل کو سامنے رکھتے ہوئے جب میں نے 21 جنوری 1996ء کے سنڈے نیویارک ٹائمز کے ہفتہ وار جائزے میں یہ سرخی دیکھی کہ ''سرخ خطرہ ٹل گیا اس کی جگہ اسلام نے لے لی ہے'' تو مجھے قطعی کوئی حیرت نہیں ہوئی، اس سرخی کے نیچے ایلین سسیولینو (Elaine Sciolino) کا ایک طویل مضمون تھا، اس مضمون میں کوئی نئی بات نہیں تھی، یوں بھی ہے اور یوں بھی ہے کا گھماؤ پھراؤ تھا، البتہ جب وہ یہ کہتی ہے کہ ''آج کے ادبی حلقوں میں جن موضوعات پر گرما گرم اور ناگوار بحث ہورہی ہے ان میں سے ایک وہ بھی ہے جس نے اس پرانی بحث کو تازہ کردیا ہے کہ کمیونزم کا خطرہ کتنا منظم اور سنگین تھا'' تو بات سمجھ آجاتی ہے کہ اس کا اشارہ کس طرف ہے، اس مضمون پر جو تلخ سرخی چسپاں کی گئی ہے اس سے ہٹ کے اگر دیکھا جائے تو سارے مضمون میں سسیولینو نے قارئین کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ اسلام جسے وہ سبز خطرہ قرار دیتی ہے اسے مغربی مفادات کے لیے تباہ کن سمجھنا چاہیے، سسیولینو نے اپنے موقف کی تصدیق کے لیے بہت سے لوگوں کے حوالے دیئے ہیں جن میں نیٹو کے سیکرٹری جنرل کلائیس (Claes)، نیوٹ گنگرچ (Newt Gingrich)، برنارڈ لیوئس، شمعون پیریز اور وہ سٹیون ایمرسن (Steven Emerson) بھی شامل ہے جو پوری طرح ساتھ بھی نہیں ہوتا اور ہر جگہ موجود بھی ہوتا ہے، اس کے علاوہ سسیولینو نے بے نظیر بھٹو، حسنی مبارک اور تن سوسلر (Tansu Ciller) جیسے سربراہوں کا ذکر بھی کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ بھی مسلمانوں کی عالمی سازش کی تصدیق کرتے ہیں، میرے نزدیک یہ سب صرف کج بحثی کے ماہر ہیں اور اوٹ پٹانگ لکھتے ہیں، ان سب کے مقابلے میں جارج ٹاؤن کے پروفیسر جان اسپازیٹو (John Esposito) ہی ایک ایسی شخصیت ہے جس نے بڑی معقول اور مدلل کتاب لکھی ہے، اس کتاب کا نام ہے اسلامی خطرہ: خیالی یا حقیقی (The Islamic Threat: Myth or Reality?)، اس کتاب کو 1992ء میں آکسفورڈ (Oxford) نے شائع کیا تھا اور اس میں مصنف نے اس نظریے کے غبارے میں سے ہوا نکال دی ہے کہ اسلام ایک خطرہ ہے، اس ساری صورت حال کو اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو

یہی ثابت ہوتا ہے کہ خیال چاہے کتنا ناقص اور بودا ہو، اسے ثابت کرنا کتنا ہی ناممکن کیوں نہ ہو اگر اس میں نزاعی بنیادیں موجود ہیں تو وہ مغرب کے لیے قابل قبول ہوگا، اس طرز عمل کا نتیجہ یہ ہے کہ کج بحثی کی خاطر اسلام کو خطرہ قرار دینا، آج کے مغرب کی ضرورت بن گیا ہے۔

اسی لیے اسلام، پالیسی سازوں اور میڈیا کے حلقے میں بحث کا مرکز بنا ہوا ہے، ان مباحثوں میں اس بات کو اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ آج اسلامی گروپوں کی اکثریت امریکا کی اتحادی اور اس کے زیر کفالت ہے یا یہ گروپ امریکا کے دائرہ اثر میں ہیں، ان مباحثوں میں اس بات پر بھی توجہ نہیں دی جاتی کہ امریکا، سعودی عرب، انڈونیشیا، ملائیشیا، پاکستان، مصر، مراکش، اردن، اور ترکی کی جن حکومتوں کی کھل کر حمایت کر رہا ہے، وہ اپنے اپنے ممالک کے عوام سے کٹی ہوئی ہیں، اور حکمران طبقہ اقلیت میں ہے، اس لیے یہ حکومتیں اور حکمران مسلم ایجنڈے کے طور پر نہیں، بلکہ اپنی بقا کے لیے امریکا کی سرپرستی حاصل کرنے پر مجبور ہیں اور امریکا کی اسی مداخلت کی بدولت ان ممالک سے عسکریت پسند اٹھ رہے ہیں، امور خارجہ کی کونسل نے جو ایک معتبر اور موثر ادارہ ہے مسلم سیاست پر ایک رپورٹ جاری کی ہے، اس رپورٹ کے لیے ایک مطالعاتی گروپ قائم کیا گیا تھا جس نے بڑے وسیع پیانے پر لوگوں کی رائے جمع کی ہے، ان میں سے کچھ بڑی مفید اور معلوماتی ہیں، کونسل کے ''فارن افیئرز'' (Foreign Affairs) جیسے سہ ماہی جریدوں کا طریقہ یہ رہا ہے کہ وہ اکثر بحث کا ایک دائرہ باندھ دیتے ہیں، فارن افیئرز کے موسم بہار 1993ء کے شمارے میں بھی یہی انداز اختیار کیا گیا ہے اس میں جوڈتھ ملر (Judith Miller) اور لیون ہیڈر (Leon Hadar) کے درمیان ''کیا اسلام ایک خطرہ ہے'' کے موضوع پر بحث کو لیا گیا ہے، ملر موضوع کے حق میں اور لیون ہیڈر مخالفت میں رقم طراز ہوئے، مگر کسی کی توجہ اس طرف نہیں تھی کہ اس سے مسلمانوں کی کتنی دل آزاری ہوگی، یہ جو اسلام ایک خطرہ ہے کی مسلسل تکرار کی جاتی ہے، یہ بات چاہے کسی مباحثے میں ایک نکتے کے طور پر ہی کیوں نہ اٹھائی جائے، اس سے ہر مسلمان یہی تاثر لے گا کہ اس کے ایمان، اس کی ثقافت اور مسلم عوام کو خطرناک قرار دے کر، اس کا تعلق بھی واضح طور پر دہشت گردی، تشدد اور بنیاد پرستی کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔

ایک اور پتے کی بات یہ ہے کہ اسرائیل کے حامی رسالے اور کتابیں اسلام ایک خطرہ ہے کے تاثر کو اس لیے ایک تسلسل کے ساتھ پھیلا رہے ہیں تاکہ امریکی اور یورپی باشندے، اسرائیل کو مسلمانوں کے تشدد کا شکار جان لیں، چنانچہ 1948ء سے ایک کے بعد ایک آنے والی اسرائیلی حکومت نے مظلومیت کے اپنے اس خود ساختہ تصور کو مشرق وسطیٰ کی بحث میں نشریات کے ذریعے جنگی بنیادوں پر آگے بڑھایا ہے، اگرچہ

میں اس موضوع پر الگ سے گفتگو کر چکا ہوں، مگر یہاں یہ بات کہنا ضروری ہے کہ اکثر اوقات اسلام ایک خطرہ ہے، کی تکرار کا مقصد عربوں کے ذہنوں سے اس بات کو محو کر دینا یا دھندلا دینا ہوتا ہے کہ اسرائیل اور امریکا، اسلام دشمنی میں کیا کر رہے ہیں، یہی وہ دو ملک ہیں جنھوں نے مصر، اردن، شام، لیبیا، صومالیہ اور عراق جیسے مسلم ممالک پر بمباری کی ہے اور زمینی حملے کیے ہیں، جہاں تک اسرائیل کا تعلق ہے، اس نے اس وقت بھی چار عرب مسلم ممالک کے علاقوں پر قبضہ کر رکھا ہے اور امریکا، اقوام متحدہ میں اسرائیل کے اس فوجی قبضے کی کھلم کھلا حمایت کرتا ہے، اس لیے عربوں اور مسلمانوں کی بھاری اکثریت، اسرائیل کو اس خطے میں ایک ایسی گھمنڈی ایٹمی قوت سمجھتی ہے، جس کی نظر میں اس کے ہمسائے بڑے حقیر ہیں، اس نے کس قدر اور کتنی بار بمباری کی، یہ بات اسرائیل کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی، اس کی قتل و غارتگری کو دیکھیے تو اس خطے میں جاری عسکری کشمکش میں اسرائیلیوں سے کہیں زیادہ مسلمان ہلاک ہوتے نظر آئیں گے، پھر لوگوں سے ان کی املاک چھیننا، انھیں علاقے سے بیدخل کر دینا اس کا وطیرہ رہا ہے، خاص طور پر فلسطینیوں کے ساتھ اس نے یہی سلوک روا رکھا ہے، پھر عالمی قوانین اور اقوام متحدہ کی درجنوں قراردادوں کی خلاف ورزی اس کے حساب میں لکھی ہوئی ہے، اسرائیل نے مشرقی بیت المقدس، گولان کی پہاڑیوں کو ضم کر لیا ہے، 1982ء سے اس نے جنوبی لبنان پر قبضہ کر رکھا ہے، اس نے فلسطینیوں کے ساتھ کمتر انسانوں کا سلوک کرنے کی پالیسی اختیار کر رکھی ہے، اس نے مشرق وسطیٰ کے متعلق امریکی پالیسی کو اپنے اختیار میں لے رکھا ہے، جس سے بیس کروڑ مسلمانوں کے مفادات چالیس لاکھ اسرائیلیوں کے مفادات کے آگے دب کے رہ گئے ہیں، چنانچہ ان حقائق کی روشنی میں برنارڈ لیوئس کا یہ الزام بے بنیاد ہو جاتا ہے کہ مسلمان، مغرب کی ''جدیدیت'' سے برہم ہیں، تاہم یہ بات سمجھ آنے لگتی ہے کہ عربوں اور مسلمانوں کو شکایت تو ان طاقتوں سے ہے جو اسرائیل اور امریکا کی طرح آزاد جمہوریت ہونے کا دعویٰ تو کرتی ہیں مگر کمزوروں کے ساتھ ان کا سلوک جمہوری اقدار سے قطعی مختلف، ذاتی مفاد اور بے حرمتی پر مبنی ہوتا ہے، مفاد کی اس سیاست کو یوں سمجھیے کہ جب 1991ء میں عراق کے خلاف ممالک کے اتحاد کی قیادت امریکا نے کی تو اس وقت اس نے کہا تھا کہ جارحیت کو پلٹنے اور قبضے کو ختم کرنے کی ضرورت ہے، مگر بات کچھ اور تھی، میں سمجھتا ہوں کہ اگر عراق مسلم ملک نہ ہوتا، اس نے تیل کی دولت سے مالا مال ایک ایسے ملک پر قبضہ نہ کیا ہوتا، جس کے ذخائر امریکا کے لیے محفوظ ہیں، تو اس پر کبھی حملہ نہ ہوتا، بلکہ جس طرح امریکا نے مغربی کنارے اور گولان کی پہاڑیوں پر اسرائیل کے قبضے، مشرقی بیت المقدس کے انضمام کو نظر انداز کر رکھا ہے، اسی طرح عراقی حملے کو بھی نظر انداز کر دیا جاتا، میں یہ نہیں کہہ رہا کہ مسلمانوں نے اسلام کے نام پر

اسرائیلیوں اور مغربی باشندوں پر حملے نہیں کیے، اور انھیں زخمی نہیں کیا، بلکہ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اسلام کے متعلق پڑھنے کو جو ملتا ہے اور ہم امریکی میڈیا میں جو دیکھتے ہیں اس میں ظاہر یہی کیا جاتا ہے کہ جارحیت صرف مسلمانوں کی طرف سے ہو رہی ہے اور جارحیت ''اسلام'' کا خاصہ ہے، اس طرح جارحیت کے ارتکاب کی مقامی اور ٹھوس وجوہ کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے، دوسرے الفاظ میں اسلام کا احاطہ کرتے ہوئے مغرب میں صرف ایک جانب کی سرگرمیاں دکھائی جاتی ہیں اور مغرب جو کر رہا ہے اسے چھپالیا جاتا ہے، پھر اس بات کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے، کہ مسلمان اور عرب اپنی فطری خامیوں کی بدولت کس حد تک بد ہو چکے ہیں۔

اب میں مشرق وسطیٰ اور اسلام کے بارے میں ان لکھنے والوں کا ذکر نہیں کروں گا، جو حاشیہ بردار ہیں، جن کے خیالات واضح طور پر منتشر ہیں اور جن کے افکار غیر منطقی ہیں، بلکہ اب میں مشہور اور معروف اخباروں اور رسالوں کا ذکر کروں گا، مثال کے طور پر دی نیوری پبلک (The New Republic) اور دی اٹلانٹک (The Atlantic) کو لیجیے، دی نیوری پبلک کے مالک مارٹن پیرٹز (Martin Peretz) اور دی اٹلانٹک کے مارٹن ذوکرمان (Morton Zuckerman) ہیں، یہ دونوں اسرائیل کے زبردست حامی ہیں، اس لیے اسلام سے بغض رکھتے ہیں، پیرٹز بڑی خاص چیز ہے، امریکی میڈیا میں آج تک کسی نے بھی اتنے طویل عرصے تک کسی ثقافت یا عوام کے کسی گروہ یا طبقے کے ساتھ نسلی امتیاز اور نفرت کا ایسا مظاہرہ نہیں کیا جیسا پیرٹز نے اسلام اور عربوں سے کیا ہے، اسے نفرت تقسیم کرتے ہوئے کم از کم بیس سال ہو گئے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اسرائیل کا ہر قیمت پر دفاع کرنے کی سوچ نے اس کی تحریروں میں زہر گھول دیا ہے مگر بات یہیں تک محدود نہیں اس کی طرف سے اسرائیل کا دفاع عقل سے عاری اور ایسے گھٹیا انداز میں بدنام کرنے والا ہوتا ہے کہ اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی، اس کے نزدیک اسلام اور عرب ایک ہیں اور ان پر وقفے وقفے کے ساتھ حملے کیے جاسکتے ہیں، اس کی یہی سوچ اس کی درج ذیل تحریر میں نمایاں ہے۔ یہ تحریر اس نے 7/مئی 1984ء کو ایک ڈرامے کے متعلق لکھی تھی اور اسے لکھنے سے پہلے اس نے یہ ڈراما خود دیکھا تھا، وہ لکھتا ہے۔

> ''عربوں کے محاصرے کے دوران ہوتا یوں ہے کہ ایک جرمن بزنس مین جو دورے پر آیا ہوا ہے، ایک امریکی یہودن جو اپنے وطن کو ترک کر کے آئی ہے اور ایک فلسطینی عرب، بمباری سے بچنے کے لیے ایک ہی پناہ گاہ میں آ پہنچتے ہیں، ڈرامے میں جرمن اور یہودن کے درمیان ہمدردی ہو جانا بذات خود ایک چونکا دینے والی بات ہے، لیکن

> اس ڈرامے کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ ہماری جس ثقافت کے متعلق دنیا بھر میں تعصب پایا جاتا ہے، اس نے ہمیں عربوں کا مقابلہ کرنے کے لیے بہت کم تیار کیا ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک پاگل عرب، ویسا ہی پاگل جیسا عرب ثقافت کا خاصہ ہے، وہ اپنی زبان کی فصاحت و بلاغت کے نشے میں ڈوبا ہوا ہے، وہ خیال اور حقیقت میں تمیز نہیں کر سکتا، اسے مصالحت کے تصور سے ہی گھن آتی ہے، اور وہ اپنی تمام مصیبتوں کے لیے ہمیشہ دوسروں کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے، آخر کار اس کی محرومیوں کا دباؤ، اس کی پیاس لہو سے بجھاتا ہے اگرچہ اس عمل سے اسے لمحاتی سکون ملتا ہے مگر اس کا عمل بے معنی ثابت ہوتا ہے، یہ ایک سیاسی ڈراما ہے جسے اس کی قنوطیت نے یا یوں کہیے کہ اس کی صداقت نے بڑا جاندار بنا دیا ہے، ہم نے اس ڈرامے کے اسی عرب کردار کو طرابلس اور دمشق میں دیکھا ہے، حالیہ ہفتوں میں ہم اسے غزہ میں ایک بس کو ہائی جیک کرتے اور گلیوں میں موجود لوگوں پر گولیاں چلاتے ہوئے دیکھ چکے ہیں، بلاشبہ ڈرامے میں وہ ایک خیالی کردار ہے لیکن حقیقی دنیا میں وہ نہیں بلکہ اس کے ''اعتدال پسند'' بھائی ہمارے اعصاب پر سوار ہیں''۔

یہ تحریر دی نیوری پبلک میں کئی ہفتے تک بار بار شائع ہوتی رہی، یہاں یہ بتا دینا ضروری ہو گیا ہے کہ یہ بڑا مشہور رسالہ ہے، کبھی یہ آزاد خیال ہوتا تھا اور اس کی رائے کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی، واشنگٹن اور نیویارک کے بااثر افراد کی اکثریت اس کا مطالعہ کرتی تھی، مگر پیرٹز کے آنے سے صورت حال بڑی مختلف ہو گئی ہے، اب اس تصویر کا ایک اور رخ دیکھیے کہ پہلے پیرٹز 24/جون 1991ء کی اشاعت میں ہمیں یہ یقین دلاتا ہے، کہ ''پولینڈ، جاپان اور انگلینڈ کی طرح اسرائیل بھی عوام کی سیاسی رائے سے وجود میں آیا ہے'' اور اس کی سیاسی شناخت ہندوستانیوں یا فلسطینیوں جیسی نہیں بلکہ محفوظ ہے، یہ یقین دلانے کے بعد وہ آگے بڑھتا ہے اور 6/ستمبر 1993ء کو یہ استدلال پیش کرتا ہے کہ ''عربوں کے لیے یہودی ہمیشہ غاصب اور مداخلت کار ہی رہیں گے، اگرچہ غیر ملکیوں سے نفرت کرنا صرف عربوں کے لیے مخصوص نہیں ہے لیکن ایک ایسے دور میں جب ریاست کا تصور سیاست اور شناخت کے اختلاط سے وجود میں آتا ہو، عرب کا اسلام، اسرائیل اور مغرب سے خود کو کمتر گردانتے ہوئے، غیر ملکیوں سے ایک ایسی مخصوص نفرت میں ڈھل جاتا ہے جس میں وہ اپنی دنیا اور

صرف اپنی دنیا کا ہی سوچتے ہیں''۔

پیرٹز (Peretz) نے اپنی اس غیر معمولی بہتان طرازی میں تاریخی حقائق کو مکمل طور پر چھپانے کی کوشش کی ہے، تاریخی حقیقت یہ ہے کہ فلسطین [1] غیر آباد نہیں تھا بلکہ اس میں لوگ آباد تھے، اس ملک میں زیادہ تر یہودی یورپ سے آئے، انھوں نے فلسطینی معاشرے کو تباہ کیا، فلسطینیوں کو ان کی املاک سے محروم کیا اور دو تہائی کو ان کے اپنے ملک سے باہر نکال دیا، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسرائیل نے کئی دہائیوں سے فلسطین کے ساتھ ساتھ لبنان اور شام کے علاقوں پر بھی زبردستی قبضہ کر رکھا ہے، اس نے یک طرفہ طور پر مشرقی بیت المقدس کو بھی اپنی مملکت میں ضم کر لیا ہے، یہ ایک ایسا اقدم ہے، جسے دنیا کے کسی ملک نے بھی نہیں سراہا، پھر اس نے اس بات کو اپنا حق قرار دے رکھا ہے کہ وہ اردگرد پھیلے ہوئے متعدد عرب ممالک پر اس بنیاد پر حملہ کر سکتا ہے کہ اسے ان سے خطرہ ہے، اسرائیل کی ان بداعمالیوں کا پیرٹز کے پاس چونکہ کوئی جواب نہیں ہے، اس لیے وہ انھیں اسرائیل کی بالادستی میں چھپا دیتا ہے اور عربوں اور مسلمانوں پر خون ناحق اور ثقافتی کمتری کا الزام عائد کر دیتا ہے، اپنے اسی مخصوص انداز میں پیرٹز اپنے جریدے کی 13 راگست 1996ء کی اشاعت میں پہلے اسرائیلی وزیر اعظم بینجمن نا تین یاہو (Benjamin Netanyahu) کی طاقت کے استعمال کی بازاری سیاست کو درست قرار دیتا ہے پھر اس کے دفاع میں کہتا ہے کہ آخر اسرائیل کو ان عرب ممالک سے نپٹنا ہے جن کے پاس ''سائنسی اور صنعتی میدان میں آگے بڑھنے کی کوئی ثقافتی ترغیب موجود نہیں ہے، افسوس اس بات کا ہے کہ ایک ایسے معاشرے میں جہاں ایک اینٹ بھی تیار نہیں ہوتی وہاں یہ لوگ بھلا مائیکرو چپ کیونکر بنالیں گے''۔ پیرٹز افریقی امریکیوں اور عربوں کے متعلق ایک ہی جیسے خیالات رکھتا ہے، اور کہتا ہے کہ کمتری ان دونوں کا مقدر ہے، اپنے اس نکتہ نظر کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ یوں کہتا ہے کہ ''دونوں کے درمیان ترقی کا یہ بڑھتا ہوا فرق اسرائیل کے خلاف بڑی گہری اور بے لگام نفرت کو جنم دے گا، اگر چہ اس کا نتیجہ روایتی جنگ تو نہیں ہوگا مگر اس سے تشدد کے واقعات اور وہ ہنگامے بڑھ جائیں گے جن کا پچھلے کئی برسوں سے اسرائیل کو تجربہ ہو رہا ہے''۔

پیرٹز کی عادت ہے کہ اس کے پسندیدہ ملک اسرائیل کے خلاف عربوں اور مسلمانوں سے جو ''گناہ'' سرزد ہوئے ہیں، اس کا انھیں ملزم ٹھہرانے کے واسطے وہ ایک ایسے عام تصور کا وسیع خاکہ مرتب کرتا ہے جس کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اس کے کئی ہم عصر بھی اس کی طرح ہیں وہ بھی کتابوں، مضامین، ٹیلی وژن کی کہانیوں، بیانیہ یا تفریحی فلموں میں بے پر کی چھوڑتے رہتے ہیں، ان میں ایک ملٹن ویروسٹ (Milton Viorst) بھی ہے جس

1۔ فلسطین ایک آباد ملک تھا، یہودیوں کو یہاں آباد کرنے کا فیصلہ اس ملک کے عوام کی سیاسی رائے سے نہیں ہوا تھا بلکہ دوسری جنگ عظیم میں جرمنی کے خلاف برطانیہ اور اس کے اتحادیوں کے ساتھ تعاون پر تاجدار برطانیہ نے یہ علاقہ یہودیوں کو عطا کیا تھا۔ (مترجم)

کے مشرق وسطیٰ سے متعلق متعدد مضامین نیویارکر (New Yorker) رسالے میں شائع ہو چکے ہیں، ان مضامین کی اکثریت کو اس نے ایک کتاب میں جمع کیا ہے، جس کا اس نے نام ''ریت کے قلعے: عرب جدید دنیا کی تلاش میں'' (Sandccastles: The Arabs in Search of the Modern World) رکھا ہے، یہ کتاب 1994ء میں اشاعتی ادارے کنوف (Knopf) نے شائع کی ہے، ویروسٹ کا اگر چہ مشاہدہ بڑا تیز ہے، لیکن اسے اسلام کے متعلق غیر مصدقہ مفروضوں نے الجھا کے رکھ دیا ہے اور وہ سوچے سمجھے بغیر ان مفروضوں کو بیان کرتا رہتا ہے، اس کی کتاب پر جس قدر تبصرے ہوئے ان میں سے کسی نے بھی ان مفروضوں پر تنقید نہیں کی، صرف محمد علی خالدی نے اس کا تنقیدی جائزہ لیا ہے، رسالہ مطالعۂ فلسطین (Journal of Palestine Studies) کی موسم سرما 1996ء کی اشاعت میں انھوں نے ویروسٹ کے مفروضوں کو جس انداز میں پیش کیا ہے اس سے اس دانشور کی قلعی کھل گئی ہے، خالدی کے اس مضمون میں ویروسٹ کا ایک اقتباس یوں ہے، کہ ''روایتی اسلامی شہروں میں گھروں سے باہر صفائی پر توجہ دینے کا کوئی رواج ہی نہیں ہے، اس لیے آج کے عرب اپنی گلیوں کی صفائی کا خیال نہیں رکھتے اور وہاں کوڑا کرکٹ پھیلا رہتا ہے''، عوامی گزرگاہوں پر توجہ کی اس کمی کے متعلق بعض مبصرین کی رائے یہ ہے کہ ''یہ اس اسلامی ثقافت کی شاخسانہ ہے جو نجی زندگی میں سمٹ گئی ہے اور جس نے تمام تر سماجی زندگی کو گھروں تک محدود کر دیا ہے'' بات یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ ویروسٹ کہتا ہے کہ ''اسلام''........ لوگوں کی سوچنے اور غور کرنے کی صلاحیتوں کو زنجیریں پہنانے میں کامیاب اور ''عیسائیت'' ناکام رہی ہے،...... عربوں کے متعلق یہ بات طے ہے کہ وہ اپنی ثقافت میں رہتے ہوئے اگر تشدد پر بھروسا کرنے والے نہیں ہوتے تو بھی ان کا رجحان پیدائشی طور پر قدامت پرستی کی طرف ضرور ہوتا ہے اور علمی وادبی چیلنج کا مقابلہ کرنا ان کے بس کی بات نہیں ہوتا'' ویروسٹ کی اس سوچ پر خالدی نے یہ درست نکتہ اٹھایا ہے کہ مسلمانوں سے بڑھ کر علمی وادبی چیلنج کا مقابلہ کرنے والا اور کون ہے، یہ مسلمان ہی تھے جنھوں نے یونانی فلسفے کو اپنایا اور بعد میں یہ یورپی باشندوں کے کام آیا، یہ مسلمان ہی تھے جنھوں نے منطق اور علم نجوم کی ابتدا کی، ادویات سازی کو ایک سائنس کا درجہ دیا، پھر الجبرا مسلمانوں کی ہی تو ایجاد ہے۔

تاہم ویروسٹ جو اپنی دھن میں مگن رہنے والا شخص ہے اس پر ان تمام دلائل کا کوئی اثر نہیں ہوتا، یا شاید وہ مسلمانوں کی ان تمام علمی خدمات سے واقف ہی نہیں ہے، اسی لیے وہ بڑے یقین کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ ''اسلام کی خاصیت میں تخلیقی سوچ کے ساتھ عناد رکھنا شامل ہے'' اور وہ دعویٰ کرتا ہے کہ ''عرب اور ترک دونوں مسلمان اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ادبی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو ان کی تہذیب مغرب کی

برابری نہیں کر سکتی'' کیونکہ'' مغرب[1] نے آج کی دنیا کو علم سیکھنے کا جو جوش و جذبہ دیا ہے وہ عرب تہذیب کو چھو کر بھی نہیں گزرا۔''

ویروسٹ اور پیرنز جیسے بے شمار لوگوں نے اپنے آپ کو خود ہی ترجمان مقرر کر لیا ہے یہ لوگ تعداد میں اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا فرداً فرداً ذکر کرنا ممکن نہیں ہے، ان سب کا انداز مدافعانہ ہے اور اس میں غیر ملکیوں کے لیے نفرت نہ صرف صاف جھلکتی دکھائی دیتی ہے بلکہ یہ سب کچھ اسی نفرت سے اخذ کرتے ہیں، یہ اسلام پر حملہ بھی اسی لیے کرتے ہیں تاکہ اس طرح ان کے عام جارحانہ جذبات کی تسکین ہو جائے، پھر اسلام کا اس طرح ذکر کرنے سے ان کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ یہ اسے مغرب کے حوالے سے کمتر مذہب ثابت کر سکیں، چنانچہ ان اہداف کو پورا کرنے کے لیے یہ لوگ اس طرح کا تاثر دیتے رہتے ہیں کہ اسلام مغرب کا زبردست مخالف ہے، مغرب کا مقابلہ کر رہا ہے، پشیمانی میں مبتلا اور غصے میں بھرا ہوا ہے، یہ بات چند لوگوں تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ ایک اجتماعی مہم ہے اور نیویارکر، نیویارک ریویو آف دی بکس (Newyork Review of The Books) اور ماہنامہ اٹلانٹک جیسے اہم جریدوں کا جو لوگوں کی رائے بناتے ہیں، حال یہ ہے کہ وہ کبھی ایسے مضامین یا علمی کام کو شائع نہیں کرتے جو مسلمانوں یا عرب مصنفین نے لکھے ہوں، اس کے بجائے وہ ویروسٹ جیسے ماہرین پر انحصار کرتے ہیں اور سیاسی اور ثقافتی واقعات کا حقائق کی روشنی میں نہیں بلکہ ایسے مفروضوں کی بنیاد پر تجزیے کر کے شائع کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں، جیسے مفروضوں کا ذکر اوپر کر دیا گیا ہے، پھر ویروسٹ جیسے لوگوں نے جو اجارہ داری قائم کر رکھی ہے، اسے چیلنج کرنے والے نقاد بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔

میڈیا، پالیسی ساز جریدوں اور علمی حلقوں نے اسلام پر فقرے کسنے کا جو طرز عمل اختیار کر رکھا ہے اس کا نقصان یہ ہے کہ اس کے متعلق چند ہی تنقیدی جائزے سامنے آئے ہیں، ان میں ایک ذکری کربل (Zachary Karabell) کا تنقیدی جائزہ، ورلڈ پالیسی جرنل (World Policy Journal) کے 1995ء کے موسم سرما کے شمارے میں شائع ہوا ہے اور اس میں کربل نے ابتدا ہی یہاں سے کی ہے کہ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد'' دنیا میں بنیاد پرست'' اسلام کو غیر ضروری اہمیت دی گئی ہے، وہ کہتا ہے اور درست کہتا ہے، کہ عوامی میڈیا اسلام کے متعلق منفی تصورات سے بھرا پڑا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ'' آج اگر معروف یونیورسٹیوں یا دوسرے اداروں سے منسلک ان امریکی طلبہ سے جو تعلیم کے میدان میں کالج کی سطح تک پہنچ گئے ہیں یہ پوچھا جائے کہ

1۔ یورپ کی بیداری میں اکوی نس کا بڑا ہاتھ ہے، اس نے تمام تر علم مسلمان مفکرین سے لیا جن میں ابن رشد، ابن ماجہ، ابن خلدون اور امام غزالی کے نام آتے ہیں، ان افکار کو لے کر اس نے ریاستوں پر کلیسا کے اختیار کے خلاف جدوجہد کی، عوام کو توہمات سے نکالا اور یورپ کو ترقی کی راہ پر ڈالا۔ (مترجم)

ان کے نزدیک مسلم کہتے کسے ہیں تو ان سب کا جواب بلاشبہ یہی ہوگا کہ بندوق لہراتا ہوا، ڈاڑھی والا، متعصب دہشت گرد جو اس پر تلا ہوا ہے کہ اپنے سب سے بڑے دشمن امریکا کو تباہ کر دے اسے مسلمان کہتے ہیں'' اس طرز عمل کو واضح کرنے کے لیے کربل نے اے بی سی (ABC) کے اس پروگرام ٹونٹی ٹونٹی کا حوالہ دیا ہے جو خبروں کے لیے بڑا معتبر سمجھا جاتا ہے، اس کے متعلق وہ کہتا ہے کہ'' اس میں کئی ایسے پروگرام شامل کیے گئے ہیں جس میں اسلام کو مذہبی جنگ لڑنے والے ایک ایسے مذہب کے طور پر پیش کیا گیا ہے جس میں اللہ کے لیے جنگ لڑنے کی ترغیب دی جاتی ہے، پھر اسی میں فرنٹ لائن (Front line)، کے زیر اہتمام ایک ایسا تحقیقی پروگرام بھی شامل کیا گیا تھا جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا بھر میں مسلم دہشت گرد کہاں کہاں پھیلے ہوئے ہیں" کربل نے جو انداز اختیار کیا تھا اس میں ایمرسن (Emerson) کی اس پی بی ایس (Public Broadcasting Service) فلم کا ذکر بھی مناسب ہوتا جس کا نام'' امریکا میں جہاد'' (Jihad in America) رکھا گیا تھا، اس فلم کا انداز بڑا سنکی تھا اور اس کا مقصد امریکا میں جہاد کے خوف کو ابھارنا اور اس خوف کو اپنے مطلب کے لیے استعمال کرنا تھا، اسی طرح فیشن کے طور پر لکھی جانے والے ان اشتعال انگیز کتابوں کا ذکر بھی مناسب تھا، جن کے سرورق پر مقدس غصہ (Sacred Rage) یا خدا کے نام پر (In the Name of God) جیسے عنوان دکھائی دیتے ہیں اور جن کا مقصد یہ ثابت کرنا ہوتا ہے کہ اسلام اور کم عقلی کے درمیان گہرا تعلق ہے، کربل اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے کہ'' پرنٹ میڈیا کا طرز عمل بھی مختلف نہیں ہے، اس میں جب مشرق وسطیٰ کے متعلق کوئی کہانی شائع ہوتی ہے تو اس کے ساتھ کسی مناسبت کے بغیر ہی مسجد یا عبادت کرتے ہوئے مسلمانوں کی تصویر چسپاں کر دی جاتی ہے''۔

میں نے شروع ہی میں کہا تھا کہ پندرہ برس پہلے جب کورنگ اسلام کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا تھا، اس وقت جو حالات تھے پندرہ برس گزرنے کے بعد وہ زیادہ خراب ہو گئے ہیں، مثال کے طور پر اب بڑے وسیع پیمانے پر ایسی فیچر فلمیں تیار ہونے لگی ہیں جن کا پہلا مقصد تو مسلمانوں کو انسانیت کی سطح سے گرا ہوا شیطان ثابت کرنا ہے، دوسرا مقصد یہ ہے کہ مغرب خاص طور پر امریکا کو اتنا باجرأت اور ایسا زبردست ہیرو دکھایا جائے جو ان مسلمانوں کو آسانی کے ساتھ قتل کر سکتا ہے، ان میں سے ایک فیچر'' سچے جھوٹ'' (True Lies) کا حوالہ دیتے ہوئے کربل نے لکھا ہے کہ اس میں'' عرب دہشت گرد کو ایسا ولن دکھایا گیا ہے جس کی چمکدار آنکھوں میں امریکیوں کو قتل کرنے کی خواہش جھلکتی ہے''۔ فیچر فلموں میں اس رجحان کی ابتدا 1985ء میں ڈیلٹا فورس (Delta Force) سے ہوئی تھی، لیکن اسے آگے انڈیانا جونز (Indiana Jones) کی داستان نے بڑھایا، اور ٹیلی وژن پر بے شمار ایسی سلسلہ وار کہانیاں آ گئیں جن میں تمام مسلمانوں کو بلا تخصیص شر انگیز، متشدد

قرار دینے کے ساتھ ساتھ، قتل کیے جانے کے لائق ٹھہرایا جاتا ہے، ہالی وڈ کی فلموں میں مشرق وسطیٰ کو اپنانے کی جو پرانی روایت چلی آ رہی تھی، اس میں یہ تبدیلی دیکھنے میں آئی ہے، کہ رومان اور من کو موہ لینے والی ان چیزوں کو ان میں سے نکال دیا گیا ہے جو ایسی تمام ننجا (Ninja) فلموں میں بھی شامل ہوتی تھیں، جن میں ایک سفید فام امریکی کو سیاہ نقاب پہنے ہوئے لاتعداد مشرقیوں سے ٹکرا دیا جاتا ہے اور اس ٹکراؤ کے نتیجے میں مشرقی باشندے ڈھیر ہو جاتے ہیں۔

یہ جو غلط سلط تبصرے آ رہے ہیں ان میں مغرب کے حوالے سے جارحیت اور تحقیر کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ ان میں مسلم دنیا کے اندر، مسلم انتہاپسندی کو کتنا بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے، کربل اس پر یہ کہتے ہوئے گہری چوٹ کرتا ہے کہ ''جدیدیت اور سیکولرازم کی سوچ رکھنے والی قوتیں ابھی مشرق وسطیٰ میں اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔'' اس میں کچھ کلام نہیں کہ ان قوتوں نے ابھی تک مشرق وسطیٰ سے اپنا قدم باہر نہیں رکھا اور اس کا سیکولرازم محض دکھاوا ہے، جس کی آڑ میں یہ اسلام کو کمتر ثابت کرنے کی مذہبی جنگ لڑتے ہوئے اپنی لاعلمی یا غلط بیانی پر مصر ہیں، اس پر میرا ایک مضمون 1993ء میں شائع ہوا تھا، بعد میں جب پینتھن (Pantheon) نے 1994ء میں میری کتاب ''سیاسی محرومی'' (The Politics of Dispossession) شائع کی تو اس مضمون کو اس میں شامل کر لیا گیا، میں نے اس مضمون میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ بنیاد پرستی نے نہیں بلکہ سیکولرازم نے عرب مسلم معاشروں کو ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے سے بچائے رکھا ہے، لاعلمی میں ڈوبے ہوئے اور سنسنی خیزی کے متلاشی امریکی میڈیا نے اپنے پروگراموں کے لیے ان مغربی اسلام دشمنوں پر تکیہ کیا ہوا ہے، جنھیں بھوت، پریوں کے قصے لکھتے لکھتے اپنی صلاحیتوں کو آزمانے کے لیے ایک نیا میدان مل گیا ہے؛ اور جنھوں نے اسلام پر بے تکی باتیں کرنے کو اپنا پیشہ بنا لیا ہے، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میرے اس مدلل مضمون سے مغرب کی بند سوچ کے دریچے کھلتے مگر ایسا نہیں ہوا، میرے مدلل اور مصدقہ دلائل کے باوجود یہ اس بات کو مسلسل اچھال رہے ہیں کہ بنیاد پرستی نے عرب مسلم معاشروں کو تھام رکھا ہے، اس صورت حال میں کم از کم اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اسلام پسندوں اور مسلمانوں کی بھاری تعداد کے درمیان جو کشمکش جاری ہے اس میں بڑی حد تک اول الذکر ہار چکے ہیں، اس سلسلے میں فرانس کے سیاسی سائنسدان اولیور رائے (Olivier Roy) نے بڑی خوبصورت کتاب ''سیاسی اسلام کی ناکامی'' (The Failure of the Political Islam) لکھی ہے جس کا عنوان ہی اس صورت حال کو کھول کر بیان کرنے کے لیے کافی ہے، یہ کتاب 1994ء میں ہاورڈ (Harvard) نے شائع کی تھی، دوسرے سکالروں میں جون اسپازیٹو بھی ہے، جس نے اپنی کتاب ''اسلامی خطرہ: خیالی یا حقیقی؟'' میں ذرا

مختلف طریقے سے اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے اس کتاب میں اس نے مختلف اقسام پر زور دیا ہے، اظہار کی پیچیدگیوں کو لیا ہے، اس نے کثرت کی بنیاد پر مسلم اتحاد اور مغرب سے ان کی دشمنی کے بجائے، مسلم معاشروں کے تاریخی تجربات اور ان کی مختلف روایات کا ذکر کیا ہے۔

لیکن ایسے مدلل اور اچھی طرح چھان بین کیے ہوئے متبادل خیالات بہت کم دکھائی دیتے ہیں، اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ مارکیٹ ایک ایسے اسلام کو پیش کرنے کی ہے جو غصہ ور ہے، دوسروں کے لیے خطرہ ہے اور سازشوں کے سہارے پھیل رہا ہے، اسلام کو اس طرح پیش کرنے میں جہاں مادی فائدہ ہے وہاں اس کے ذریعے ہیجان پیدا کرنا بھی ممکن ہے یہ کیفیت تفریح کا لطف لینے کے لیے بھی کی جا سکتی ہے اور اس طرح غیر ملکی برائی کے خلاف جذبات کو بھڑکانا بھی مقصود ہو سکتا ہے، چنانچہ رچرڈ بلیٹ (Richard Bulliet) کی کتاب ''اسلام: ایک کنارے سے جائزہ'' (Islam the View from the Edge) جسے 1994ء میں کولمبیا (Columbia) نے شائع کیا، ایک غیر معمولی کتاب ہے، لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ اس جیسی ہر کتاب کے مقابلے میں بے شمار کتابیں اور مضامین سامنے آ جاتے ہیں جو ان کے نفیس خیالات کو ڈھانپ لیتے ہیں اور اپنے خیالات کو حاوی کر دیتے ہیں ان کے خیال کی مثال، ڈیوڈ پرائس جونز (David Price Jones) کی 1991ء میں شائع ہونے والی کتاب ''تنگ دائرہ'' (The closed Circle) ہے، اسے ہارپر (Harper) نے شائع کیا تھا، چارلس کراتھامر (Charles Krauthammer) کا مضمون ''عالمی انتفادہ'' (The Global Intifada) بھی اسی دائرے میں آتا ہے، یہ مضمون 16 فروری 1990ء کو واشنگٹن پوسٹ (Washington Post) میں شائع ہوا، اے ایم روزن تھال (A.M. Rosenthal) کے مضامین بھی اسی طرح کے ہوتے ہیں، اس کے نیویارک ٹائمز میں شائع ہونے والے مضامین میں سے کسی ایک کو لے لیجیے، مثال کے طور پر 27 دسمبر 1996ء کو شائع ہونے والے مضمون ''مغرب کا زوال'' (The Decline of the West) کو لے لیتے ہیں جس میں اسلام، دہشت گردی اور فلسطینیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے، یہی وہ طریقہ ہے جو امریکا کے معتبر میڈیا میں تجزیے اور کوریج کے معیار پر پورا اترتا ہے۔ میڈیا کے مرکزی دھارے میں بہتی ہوئی خبروں اور تبصروں کو روزانہ پڑھنے والوں کو عام طور پر یونی یزبک ہداد (Yvonne Yazbeck Haddad) جیسا محتاط تجزیہ نہیں ملے گا، اس نے ''مشرق قریب میں امریکی پالیسی کے متعلق اسلامی سوچ'' کو اپنا موضوع بنایا ہے اور افسوسناک بات یہ ہے کہ یہ مضمون ایک ایسی علمی کتاب میں شامل کیا گیا ہے جو قریب قریب نگاہوں سے اوجھل رہی ہے، اس کتاب کا نام ''مشرق وسطیٰ اور امریکا'' (The Middle East and the United States) ہے، اسے 1996ء میں ویسٹ ویو (WestView)

نے شائع کیا اور اسے ڈیوڈ ڈبلیولیش(David W.Lesch) نے ایڈیٹ کیا، روزن تھال اور کراتھامر کے مقابلے میں یہ خاتون بڑی محتاط دکھائی دیتی ہے، اس نے ''انتہا پسند اور بنیاد پرست'' جیسے بھڑکا دینے والے الفاظ استعمال کرنے کے بجائے مسلمانوں کے لیے اسلام پرست کا لفظ استعمال کیا ہے اور ان کی پانچ مختلف اقسام کے درمیان امتیاز کیا ہے، پھر اس نے ایک مفید کام یہ بھی کیا ہے کہ اس نے ان تمام باتوں کو جمع کر دیا ہے جو مسلمانوں کو بھڑکاتی اور مغرب کے ساتھ اسلامی دنیا کے تعلقات کو خراب کرتی ہیں، ان میں اس نے بن گورین کا یہ بیان بھی شامل کیا ہے کہ ''ہمیں اسلام سے خطرہ ہے'' اسحاق رابن کا یہ کہنا کہ ''مذہب اسلام ہمارا واحد دشمن ہے، اور ہمیں اسلام سے خطرہ ہے'' اور شمعون پیریز کا یہ نکتہ اٹھانا کہ ''جب تک اسلام اپنی تلوار ہاتھ سے رکھ نہیں دے گا ہم خود کو محفوظ تصور نہیں کریں گے'' سب اس مضمون میں ملتے ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ اسلامی دنیا کے خلاف مغرب کی براہ راست کارروائیوں کی وہ طویل فہرست بھی اس میں شامل کی گئی ہے جسے امریکا اور اسرائیل کے درمیان شراکت نے اگر جارحیت کا نہیں تو طاقت کے اظہار کا ایک ذریعہ ضرور بنا دیا ہے۔

ہداد نے جو بیان کیا ہے اس کے متعلق یہ کہنا مقصود نہیں ہے کہ یہ بالکل درست ہے یا اسے غیر مشروط طور پر قبول کرنا یا مسترد کر دینا چاہیے اس کے ذریعے میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہداد کے مضمون میں جو دلائل دیئے گئے ہیں، وہ کھرے معلوم ہوتے ہیں اور صاف نظر آتا ہے کہ یہ مضمون گہری دلچسپی کے ساتھ لکھا گیا ہے، یہ بات میڈیا پر اسلام کی اس بلا لحاظ و شرم کوریج میں دکھائی نہیں دیتی جو آج کی تصویر پر چھایا ہوا ہے، اس میں کچھ کلام نہیں کہ صحافیوں یا میڈیا سے متعلق شخصیات سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ سکالروں جیسا طرز عمل اختیار کریں گے، کتابیں پڑھیں گے، متبادل نظریات تلاش کریں گے یا ان باتوں کی طرف دھیان دیں گے، جو اسلام کو جارح اور پسماندہ قرار نہیں دیتیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان سے یہ توقع بھی نہیں کی جا سکتی کہ وہ لگے بندھے انداز میں سوچے سمجھے بغیر، اسلام کی تحقیر کرنے والے دلائل کو اختیار کر لیں گے، پھر یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ جب حکومت غیر ذمہ دارانہ انداز میں اسلام کی کردار نگاری کرتی ہے اور سرکاری طور پر لفظوں کی جو بوچھاڑ سامنے آتی ہے اسے جوں کا توں قبول کر لینے کی غیر معمولی بے تابی کیوں دیکھنے میں آتی ہے، لفظوں کی بوچھاڑ سے میرا اشارہ ''دہشت گردی'' کو ''اسلام'' کے ساتھ جوڑنے کے علاوہ یہ بھی ہے کہ اگر اسرائیل، اسلام کو ''خطرہ'' قرار دیتا ہے تو اس کے اس خیال کو امریکا کی پالیسی کا درجہ کیونکر دیا جا سکتا ہے؟

ان سب باتوں کا جواب اس میں مضمر ہے کہ صدیوں پہلے جب اسلام کو عیسائی مغرب کا مدمقابل قرار دیا گیا تھا، اس وقت جن خیالات نے جنم لیا تھا، وہ آج کی دنیا میں کس حد تک اپنا اثر رکھتے ہیں؟ وہ زمانہ

عسکریت کا تھا مگر آج حالات کچھ اور ہیں اس لیے اس رخ پر غور و فکر کرتے ہوئے ہم جاپان کی مثال لیں گے اس ملک اور اس کے عوام کی بڑی دھنائی کی گئی تھی اس کے باوجود جاپان قائم رہا جس کی سمجھ میں آنے والی وجہ یہ ہے کہ اس نے عسکریت کو اختیار کرنے کی بجائے ایک دوسرا راستہ اختیار کیا یورپ اور امریکا کی اقتصادی اجارہ داری کا ڈٹ کر مقابلہ کیا مگر یہ اس وقت کی بات ہے جب امریکا دنیا کی واحد سپر پاور نہیں تھا اب کی کیفیت اور ہے اب امریکا میں یہ خیال بڑی تیزی سے تقویت حاصل کرتا چلا جا رہا ہے کہ دنیا پر ایک ملک یعنی امریکا ہی کی حکمرانی ہے، اس لیے اس کے آگے کسی کو دم مارنے کی جرأت بھی نہیں ہونی چاہیے، اب صورت یہ ہے کہ جہاں دنیا کے بہت سے ثقافتی گروپوں نے امریکا کے اس کردار کو قبول کر لیا ہے، وہاں صرف اسلامی دنیا کے اندر، اس کی مزاحمت کرنے کے آثار بڑے قوی دکھائی دیتے ہیں، اسی لیے ثقافت اور مذہب کے حوالے سے اسلام پر تابڑ توڑ حملے کیے جاتے ہیں، یہ حملے وہ افراد اور گروپ کرتے ہیں، جن کا مفاد اسی میں ہے کہ وہ مغرب اور اس کے لیڈر امریکا کو روشن خیال اور جدید دنیا کے رہنما کے طور پر پیش کریں، مگر یہ لوگ اس حوالے سے بھی ''مغرب'' کی درست تصویر کشی کرنے سے قاصر ہیں پھر جسے یہ مغرب کی جائز بالادستی کہتے ہیں وہ حقیقت میں مغربی قوت کے بت کو ہر قسم کی تنقید سے بالاتر ثابت کرنے کی ایک کوشش ہے۔

اسلام کے خلاف ثقافتی جنگ میں سب سے زیادہ سرگرم اور بدبودار شخصیت برنارڈ لیوئس کی ہے، لیوئس کا شمار بڑے سینئر برطانوی مستشرقین میں ہوتا ہے، اب وہ امریکا میں رہائش پذیر ہے اور پرنسٹن یونیورسٹی میں پروفیسر رہنے کے بعد ریٹائر ہو گیا ہے، اس کے مضامین بڑی باقاعدگی کے ساتھ نیویارک ریویو آف بکس، کومنٹری(Commentary)، ماہنامہ اٹلانٹک اور فارن افیئرز میں شائع ہوتے ہیں، کئی عشروں سے اس کے خیالات جیسے کے تیسے ہیں، ان میں کوئی تبدیلی نہیں آئی البتہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان میں تلخی اور تحقیر بڑھتی چلی گئی ہے جسے قبول کرنے والے بہت ہیں چنانچہ اس کے ان خیالات کو آگے بڑھانے کی خواہش رکھنے والے صحافیوں اور سیاسی سائنسدانوں نے انھیں اپنی کتابوں اور مضامین میں سمو لیا ہے، لیوئس نے اپنے خیالات کی بنیاد انیسویں صدی کے فرانسیسی اور برطانوی مستشرقین کے مکتب فکر پر رکھی ہے۔

یہ مستشرقین، اسلام کو، عیسائیت اور اپنی آزادانہ روش کے خلاف ایک خطرہ سمجھتے تھے، یہی بات لے کر لیوئس اٹھا ہے چنانچہ اسے جو مقبولیت حاصل ہوئی ہے اس کی وجوہ جاننا کچھ مشکل نہیں رہا، لیوئس نے اپنی تخلیقات میں اس پر بڑا زور دیا ہے کہ اسلام اس معلوم، مانوس اور قابل قبول دنیا کا حصہ ہی نہیں ہے جس میں ''ہم'' رہتے ہیں اور عصر حاضر کے اسلام نے جدیدیت کے خلاف یورپ کے ان خیالات کو اختیار کیا ہے جو

سامی النسل[1] کے خلاف ہیں، میں نے اپنی کتاب اورینٹل ازم (شرق شناسی) میں اس بات کا ذکر کیا تھا کہ لیوئس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ مشاہدات پر پوری توجہ مرکوز نہیں کرتا، پھر الفاظ اور ان کی تاریخ کے استعمال میں دھوکا دہی سے کام لیتا ہے اس طرح وہ لوگوں کے ایک گروہ کے متعلق بڑے بھاری بھرکم ثقافتی نکات لاتا ہے، جہاں اس کی یہ دونوں باتیں لائق مذمت ہیں، وہاں یہ بات بھی لائق ملامت ہے کہ وہ مسلم عوام کو یہ حق بھی دینے کو تیار نہیں کہ وہ اپنی ثقافت، اپنی سیاست، اپنی تاریخی روایات تک کا پالنہار کرسکیں، اپنے اس مؤقف کی تائید میں وہ یہ دلیل لاتا ہے کہ مسلمان چونکہ مغرب سے تعلق نہیں رکھتے اس لیے وہ اچھے ہو ہی نہیں سکتے، اپنے اس خیال کے ساتھ وہ اس بری طرح چمٹا ہوا ہے کہ اسے کچھ اور سجھائی ہی نہیں دیتا۔

اس بات کو سمجھنے کے لیے لفظ وطن پر اس کے مضمون کو لیتے ہیں، وطن عربی کا لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں وہ دھرتی جس پر اپنا گھر ہو یا پھر اسے قوم کے معنوں میں بھی لیا جاتا ہے، لیوئس جب اس لفظ کا مطلب بیان کرتا ہے تو اس کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ علاقائی وابستگی یا تعلق کا کوئی حقیقی مطلب اشارتاً بھی نہ جڑنے پائے چنانچہ وہ کسی ثبوت کے بغیر یہ نتیجہ اخذ کرلیتا ہے کہ اس لفظ کے معنی انگریزی کے الفاظ پیٹریا یا پیٹری یا پیٹریس(Patria or Patrie or Patris) کے ہم معنی ہو ہی نہیں سکتے اور نہ ان کا عربی لفظ وطن کے ساتھ موازنہ کیا جاسکتا ہے، کیونکہ اسلام میں وطن کے معنی رہائش کی قدرتی جگہ کے ہیں، اس نے یہ بات اپنی کتاب ''اسلام اور مغرب'' (Islam and the West) میں بیان کی ہے اور اسے 1993ء میں آکسفورڈ نے شائع کیا تھا، اس کتاب میں اسی طرح کی دوسری باتیں بھی درج کی گئی ہیں جن سے لیوئس کا ایک مقصد تو اپنے علم وفضل کا رعب ڈالنا ہے، دوسرے اس استدلال کے ذریعے وہ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ مغرب کی ''بالادست'' حاکمیت کو مسلمان محسوس تو کرتے ہیں مگر اس کا اظہار نہیں کرسکتے، اس مضمون کی تمام باتیں عرب مسلمانوں کے متعلق لاعلمی کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں اور جہاں تک لفظ وطن کا تعلق ہے، انگریزی کے الفاظ پیٹریا اور پیٹری، یعنی الوطن اور وطن کے معنی عربی کے لفظ وطن سے قطعی مختلف نہیں ہیں، لیوئس نے قرون وسطیٰ کے عربی ادب سے دو یا تین ایسی ہی باتوں کو پکڑلیا ہے اور اس طرح اس نے اٹھارھویں صدی سے لے کر اب تک کے ادبی تذکروں اور لفظوں کے روزمرہ کے استعمال کو مکمل طور پر نظرانداز کردیا ہے ان میں وطن کا لفظ بھی شامل ہے جسے عرب گھر، وابستگی اور وفاداری کے اظہار کے لیے استعمال کرتے ہیں، لیوئس کے نزدیک عربی روزمرہ کی

1۔ طوفان نوح کے بعد دنیا کو حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں سام، حام اور یافث کی اولاد نے آباد کیا، سام کی اولاد میں عرب اور یہود دونوں آتے ہیں، مگر انیسویں صدی کے یورپ میں سامی النسل کی جو مخالفت ابھری اس سے مراد یہودیوں کی مخالفت تھی، مخالفت کی اس تحریک میں یہودیوں کو کمتر اور گھٹیا قرار دیا گیا تھا اور اسی کے نتیجے میں دوسری جنگ عظیم کے دوران نازی جرمنی نے ان سے ناروا سلوک اختیار کیا۔ (مترجم)

بول چال اور رابطے کی زبان نہیں بلکہ صرف تحریر کی زبان ہے اس لیے وہ وطن سے ملتے جلتے الفاظ بلاد اور ارض سے قطعی ناواقف ہے یہ الفاظ بھرپور انداز میں آبادی اور وابستگی کا اظہار کرتے ہیں۔

لیوئس کے استدلال کے اس انوکھے طریقے کی بنیاد ایسے الفاظ کے انتخاب پر ہے جن کے معنی انسان دشمنی نکلتے ہیں ان کا سہارا لے کر ہی وہ یہ نتائج اخذ کرتا ہے کہ مسلمان کیا محسوس کرتے ہیں اور ان کی آرزوئیں کیا ہیں، وہ کہتا ہے کہ اسلام ''صرف ایمان اور عبادت کا ایک نظام ہی نہیں ہے، اس نے صرف زندگی کے ایک شعبے کو نہیں سمیٹ رکھا، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ...... اس نے پوری زندگی کو اپنے بس میں کر رکھا ہے'' اس کے اسی طرح کے بیانات اس کے مکمل تعصب کو ہی ظاہر نہیں کرتے، بلکہ ان سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ اسے اس بات کا بھی ادراک نہیں ہے کہ انسانی زندگی کس طرح عمل کرتی ہے، لیوئس کہتا ہے کہ تمام مسلمانوں نے، ایک ارب کے ایک ارب مسلمانوں نے ان ''قواعد وضوابط'' کو ازبر کرلیا ہے، اپنے اندر جذب کرلیا ہے اور پوری طرح قبول کرلیا ہے، جو شہری اور مجرمانہ زندگی کا احاطہ کیے ہوئے ہیں اور جنھیں آئینی قانون کا نام دیا جاتا ہے، چنانچہ وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں ایک غلام کی طرح ان پر عمل کرتے ہیں، لیوئس کی یہ سوچ بڑی بیہودہ اور لچر ہے، اگر غور کیا جائے تو مسلمانوں کی زندگی کے جو مختلف رنگ ہیں، لیوئس انھیں سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا، وہ اس لیے مسلمانوں کو کمتر انسان سمجھتا ہے کیونکہ یہ اس کی سمجھ سے بالاتر اور بنیادی طور پر مختلف ہیں۔

اس کا یہ مزاج اس کے مضمون ''اسلام کی واپسی'' (The Return of Islam) میں بڑا نمایاں ہے، یہ مضمون پہلے دائیں بازو کے یہودیوں کے نامعقول رسالے کومنٹری میں شائع ہوا پھر اسے اس نے اپنی کتاب اسلام اور مغرب میں شامل کرلیا، اگرچہ لیوئس ہمیشہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ ایک سکالر کے مخصوص طریق کار کے مطابق صورت حال کا تجزیہ کررہا ہے مگر حقیقت میں وہ اس لیے ایک بوگس فلسفے کا سہارا لیتا ہے تاکہ وہ یہ الزام عائد کرسکے کہ ہم عصر عرب دنیا کے بڑے سیاسی مظاہر کا تعلق ساتویں صدی سے ہے، اس لیے انھیں وہ اور اس کے ساتھی نامنظور کرتے ہیں، ایک صاحب ادراک سکالر اسد ابوخلیل نے اس کے متعلق یہ بات نوٹ کی ہے کہ ''جہاں اسے (لیوئس کو) یہ حق حاصل ہے کہ وہ انتہائی ماڈرن مغربی ذہن اور مسلمان ذہن، کے درمیان ایسے خلقی اور بنیادی فرق پر یقین رکھے جو اس کی نظر میں صدیوں سے تبدیل نہیں ہوا، وہاں ہمیں بھی یہ بات کہنے کا حق ہے کہ اس کا تازہ ترین واقعات کا تجزیہ صورت حال سے قطعی آگاہی نہیں رکھتا'' اسد ابوخلیل کا یہ مضمون جے پی ایس کے 1995ء کے موسم سرما کے شمارے میں شائع ہوا، جب سے لیوئس نے یہ ظاہر کرنے

کے لیے مستشرقین کا طرزِ عمل اختیار کیا ہے کہ مسلمان کیا کرنے والے ہیں، اس کے خیالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی بلکہ اس کی بنیادی سوچ پرانے نظریے کے گرد ہی گھومتی رہی ہے، اس کی اس سوچ میں تاریخی یا انسانی وسائل کی تبدیلیوں کو سامنے رکھنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور نہ وہ اس بات کی اجازت دینے کو تیار ہے کہ ساتویں صدی کے بعد سے اب تک تمام مسلمان ایک ہی طرح نہیں سوچتے رہے، اس طرح وہ ٹھوس انداز میں زمانہ حال پر بحث کو بھی خارج کر دیتا ہے، اس تمام صورت حال میں لیوئس یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے قارئین کو یہ یقین دلا دے کہ مسلمان، اسلام قبول کر کے گمراہی کا شکار ہو گئے ہیں، وہ ناقابل اصلاح ہیں اور بار بار ایک ایسی چیز کی تکرار کر رہے ہیں جو انسانوں کی سمجھ سے باہر ہے۔

لیوئس کے بدترین کام کا نامبارک عنوان ''مسلم غیض وغضب کے اسباب'' (The Roots of Muslim Rage) ہے یہ مضمون اٹلانٹک کے ستمبر 1990ء کے شمارے میں شامل تھا جس نے بھی اس شمارے کا سرورق تیار کیا تھا، اسے لیوئس کا نکتہ نظر سمجھنے میں قطعی کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی، اس نے سرورق پر پگڑی پہنے ہوئے ایک شخص کا چہرہ لیا تھا، ظاہر ہے کہ یہ چہرہ مسلمان ہی کا تھا، جس کی آنکھیں قہر آلود تھیں اور اس کی پتلیوں میں امریکی جھنڈے کا عکس نظر آ رہا تھا، غرضیکہ اس کے انگ انگ سے غصہ اور نفرت پھوٹتی ہوئی معلوم ہوتی تھی، لیوئس کا یہ مضمون اگرچہ انتہائی موثر ثابت ہوا تھا مگر اسے علم ودانش یا حالات کی سچی تصویر کشی قرار دینا دونوں کے معانی کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے، ''مسلم غیض وغضب کے اسباب'' ایک ایسی بچگانہ نزاعی کوشش ہے جو تاریخی حقائق، عقلی دلائل یا انسانی دانش سے بالکل خالی ہے، اس میں مسلمانوں کے متعلق یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ خوفناک حد تک ایک ہی مزاج کے مالک ہیں اور بیرونی دنیا پر اس لیے برہم ہیں کہ اس نے ان کی زندگی کے پرانے انداز کو نہ صرف درہم برہم کر دیا ہے بلکہ ان کی اس حاکمیت کو جسے کوئی چیلنج کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا، زیروزبر کر دیا ہے، اس کی تحریر کا ایک نمونہ یوں ہے کہ :...... اس نام نہاد مسلمان کے گھر میں جب خود کو آزاد محسوس کرنے والی اس کی خواتین اور باغی بچوں نے اس کی سرداری کو چیلنج کیا تو یہ اس کے لیے آخری تنکا ثابت ہوا، یہ ناقابل برداشت تھا، چنانچہ اس کا غصہ، ان اجنبی، ان کافروں اور نہ سمجھ میں آنے والی قوتوں کے خلاف بھڑکنا لازمی تھا، جنھوں نے اس کی حاکمیت کو تہ وبالا کر ڈالا تھا، اس کے معاشرے کو تباہ کر دیا تھا اور آخر میں اس کے گھر کے تقدس کو بھی روند ڈالا تھا، اس صورت حال کا یہ قدرتی نتیجہ تھا کہ اس کے غصے کا رخ اپنے صدیوں پرانے دشمن کی طرف ہو جائے اور وہ قوت حاصل کرنے کے لیے قدیم اعتقادات اور وفاداریوں کا سہارا لے۔

بعد میں لیوئس نے یہ کہہ کے خود ہی اپنے اس خاکے کی نفی کر دی کہ ایک زمانے میں مسلمانوں نے مغرب کو خوش آمدید کہا تھا'' مغرب کی تعریف کی تھی اور اس پر رشک کا اظہار کیا تھا'' لیکن اس کے ساتھ ہی لیوئس اس الزام پر اتر آتا ہے کہ جب'' گہرے جذبات ابھرے'' تو مغرب کی تمام تعریف وتوصیف خالص نفرت اور غصے میں بدل گئی، اس کے اس بیان سے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے تمام تر اشتعال کی ذمہ داری ان اندرونی احساسات ہی پر عائد ہوتی ہے، اپنے مضمون کے اختتام کے قریب لیوئس یہ حیران کن دعویٰ کرتا ہے کہ ''ہم'' جس چیز پر بحث کر رہے ہیں وہ جدیدیت کے خلاف انتہائی خالص مگر بلاوجہ کا اشتعال ہے۔

> ''اب تک یہ بات واضح ہو جانی چاہیے کہ ہمیں ایک ایسے مزاج اور ایسی تحریک کا سامنا ہے جو ان مسائل، پالیسیوں اور ان حکومتوں سے بالاتر ہے جو ان مسائل کا حل تلاش کر رہی ہیں یہ کسی طرح بھی تہذیبوں کے تصادم سے کم نہیں ہے، شاید یہ بات عقل سے عاری معلوم ہو مگر یہ یقینی طور پر یہودیوں اور عیسائیوں کے مشترکہ ورثے، ہمارے موجودہ سیکولرازم اور دنیا بھر میں ان دونوں کے پھیلاؤ کے خلاف ایک قدیمی حریف کا تاریخی ردعمل ہے، یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ ہم بھی کہیں مشتعل ہو کر اپنے اس حریف کے خلاف اسی طرح کے تاریخی اور عقل سے عاری ردعمل کا مظاہرہ نہ کر بیٹھیں''۔

لیوئس کے کہنے کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ آج کے مسلمان اس لیے ردعمل کا مظاہرہ کر رہے ہیں کیونکہ تاریخی اور شاید خلقی طور پر یہ طے ہے کہ وہ ایسا ہی کریں، وہ جس کے خلاف ردعمل کا مظاہرہ کر رہے ہیں، وہ پالیسیاں یا کارروائیاں یا اسی طرح کی کوئی دوسری مادی چیز نہیں ہے بلکہ وہ آج کے سیکولرازم کے خلاف احمقانہ نفرت کے اظہار کے لیے لڑ رہے ہیں، اس نکتے پر پہنچ کے لیوئس بڑی تمکنت سے یہ دعویٰ کرتا ہے کہ آج کا سیکولرازم'' ہمارا'' اور صرف ہمارا ہے، لیوئس کے انداز میں رچی بسی یہ گستاخی دم بخود کر دیتی ہے، وہ مسلمانوں کے ساتھ صدیوں کے لین دین اور ایک دوسرے کے علاقوں میں آمدورفت کو نہیں مانتا اور چاہتا ہے کہ مسلمان اور'' ہم'' ایک دوسرے کے ساتھ مکمل قطع تعلق کر لیں، اس کا گمان ہے کہ مسلمانوں کا مقدر یہی ہے کہ وہ غم وغصے اور جہالت میں ڈوبے رہیں جبکہ'' ہماری'' قسمت میں عقل وخرد اور اپنی ثقافتی برتری سے لطف لینا لکھ دیا گیا ہے وہ کہتا ہے کہ'' ہم'' اس حقیقی دنیا کی نمایندگی کرتے ہیں جو سیکولر ہے جبکہ مسلمان روتے، دھوتے، کف اڑاتے ہوئے جس دنیا میں رہ رہے ہیں وہ طفلانہ وہم وگمان سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی، آخر میں وہ یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ ایک زمانہ وہ آئے گا جب'' ہماری دنیا'' صرف اسرائیل اور مغرب کی دنیا رہ جائے گی اور

مسلمانوں کے پاس اسلام اور باقی ماندہ دنیا ہوگی، اس تناظر میں لیوئس تجویز کرتا ہے کہ ہمیں مسلمانوں کے مقابلے میں اپنادفاع پالیسی کے طور پر یا اس لیے نہیں کرنا ہے کہ مختلف مسائل پر ان سے ہمارا اختلاف ہے بلکہ اس لیے کرنا ہے کہ ہم کسی بھی وجہ کے بغیر ان سے دشمنی رکھتے ہیں، یہ بات قطعی حیران کن نہیں ہے کہ سیموئیل پی ہنٹنگٹن (Samuel P. Huntington) نے اپنے مضمون بعنوان ''تہذیبوں کا تصادم'' کا بنیادی تصور لیوئس سے مستعار لیا ہے۔

ایسے خیالات کو جاہلانہ اور معاندانہ قرار دینا قطعی غلط نہیں ہوگا، خاص طور پر اس لیے بھی کہ نیویارک ٹائمز کی جوڈتھ ملر جیسے صحافیوں نے اپنی کم علمی کو چھپانے کے لیے لیوئس کے ان خیالات کو الہامی خیالات کا درجہ دینا شروع کر دیا ہے، جوڈتھ ملر نے ایک کتاب لکھی ہے ''خدا کے ننانوے نام: ایک رپورٹر کا جہادی مشرق وسطیٰ کا سفرنامہ'' (God Has Ninety- Nine Names:A Reporter's Journey Through a Militant Middle East) یہ کتاب 1996ء میں سائمن اور شسٹر (Simon and Schuster) نامی ادارے نے شائع کی، اس کا انداز ایک نصابی کتاب کا سا ہے، جس میں ان تمام نامناسب اور غلط سلط باتوں کا اندراج کر دیا گیا ہے جو میڈیا پر اسلام کی کوریج کرتے ہوئے بیان کی جاتی ہیں، مزید برآں مشرق وسطیٰ پر جو ٹاک شوز اور سیمینار ہوتے ہیں انھیں شہادت بناتے ہوئے ملر نے اس کتاب میں ''اسلامی خطرے'' کے اپنے اس تصور کو دہرایا ہے جو اس نے 1993ء میں فارن افیئرز کے سمپوزیم میں پیش کیا تھا، جوڈتھ ملر کا خاص مشن یہ رہا ہے کہ اسلام کو مغرب کے لیے ایک خطرہ بنا کر پیش کیا جائے، سیموئیل ہنٹنگٹن نے تہذیبوں کے تصادم میں اسی خیال کو اپنا مرکزی نکتہ بنایا ہے، چنانچہ سوویت یونین کی شکست و ریخت کے بعد ادبی خلا کا جو مفروضہ قائم ہوا تھا، اور جسے پر کرنے کے لیے کسی نئے غیر ملکی شیطان کی تلاش ہو رہی تھی وہ تلاش ملر اور ہنٹنگٹن جیسے افراد کے تصورات نے نتیجہ خیز ثابت کر دی ہے، جوڈتھ ملر اپنی بات کی ابتدا آٹھویں صدی کے اس تصور سے کرتی ہے جو مسیحی یورپ نے اس اسلام کے متعلق باندھا تھا، جو عملاً یورپ کے قریب اور اسے مسلسل چیلنج کر رہا تھا، وہ کہتی ہے کہ یہ آج بھی اتنا ہی شیطانی اور متشدد معلوم ہوتا ہے جتنا کہ یہ اس ابتدائی دور میں تھا، اسلام کو عملاً یورپ کے قریب اور مسلسل چیلنج کرنے والا ظاہر کرنا ایک ایسی مبہم اصطلاح ہے جسے لیوئس اور ہنٹنگٹن نے ''ان کے'' مقابلے میں ''ہماری'' تہذیب کو بیان کرتے ہوئے استعمال کیا ہے، ملر نے بھی اسی کو اپنایا ہے تاہم اس نے اس بات کا ذکر نہیں کیا کہ آج کے زیادہ تر اسلامی ملک غربت اور جبر و تشدد کے شکار ہیں، فوجی اور سائنسی اعتبار سے نااہل ہیں اور کسی دوسرے کے لیے نہیں بلکہ اپنے عوام کے لیے خطرہ بنے ہوئے ہیں، اس نے اس موضوع پر بھی قلم نہیں اٹھایا کہ اسلامی ممالک میں سب

سے زیادہ طاقتور سعودی عرب، مصر، اردن اور پاکستان ہیں اور یہ چاروں ملک مکمل طور پر امریکا کے حلقۂ اثر میں ہیں، ملر، ہنٹنگٹن، مارٹن کریمر (Martin Kramer)، ڈینیل پائپس اور بیری روبن (Barry Rubin) اور ان جیسے اسرائیلی دانشوروں کا ایک بڑا گروہ اس کام میں لگا ہوا ہے کہ اسلام کو امریکیوں کے لیے ایک یقینی خطرہ ثابت کرتے رہیں، وہ جانتے ہیں کہ وہ اسلام کی دہشت کو جتنا عام کریں گے، اس کی مطلق العنانی اور پرتشدد رجحان کو جس قدر بڑھا چڑھا کر پیش کریں گے اتنا ہی انھیں فائدہ ہوگا، انھیں مشاورت کا مقام و منصب ملے گا، وہ گاہے بگاہے ٹیلی وژن پر آئیں گے، ان کے ساتھ کتابوں کے معاہدے ہوں گے، چنانچہ ان اصحاب کا بنیادی مقصد ان امریکی باشندوں کو نشانہ بنانا ہے جو طبعاً لاتعلق رہنا پسند کرتے ہیں اور جنھیں اسلام کے متعلق بہت کم علم ہے، ان کے سامنے اسلامی خطرے کو بڑھا چڑھا کر انتہائی خوفناک ثابت کرنے کا مقصد اس نظریے کی حمایت حاصل کرنا ہے کہ ہر دھماکے کے پیچھے مسلمانوں کی اس گہری سازش کا ہاتھ ہے جس نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے، دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ تصور، سامی نسل کی دشمنی کے نظریے سے مطابقت نہیں رکھتا بلکہ اس کے خلاف جاتا ہے۔

اسلامی جماعتوں نے جب بھی کسی ملک پر قبضہ کر کے اسے چلانے کی کوشش کی ہے تو انھیں ناکامی ہوئی ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سیاسی معاملات میں مسلمانوں کی کارکردگی ہمیشہ کمزور رہی ہے، ہوسکتا ہے کہ ایران اس صف میں نہ آتا ہو، لیکن نہ تو سوڈان نے جو حقیقی معنوں میں ایک اسلامی ریاست ہے، نہ الجزائر نے جہاں اسلامی گروپوں اور بے رحم فوج کے درمیان زبردست مقابلہ ہو رہا ہے، نہ افغانستان نے جو ایک شورش پسند ملک کے ساتھ ساتھ ایک رجعت پسند ملک بھی بن چکا ہے کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا ہے، البتہ ان کے اندر کے حالات نے انھیں پہلے سے زیادہ غریب اور دنیا کی سٹیج پر زیادہ بے حیثیت ضرور بنا دیا ہے، تاہم مغرب میں اسلامی خطرے کو جس قدر بڑھا چڑھا کر پیش کیا جا رہا ہے خطرہ اتنا نہیں ہے، تاہم اس میں صرف اس قدر سچائی ہے کہ مسلمانوں سے اسلام کے نام پر جو اپیلیں کی جا رہی ہیں، اس نے پورے مشرق وسطیٰ میں یہاں اور وہاں، امریکا اسرائیل اتحاد کے خلاف مزاحمت کو بھڑکا دیا ہے، لوگ اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، مگر ان قوتوں کے جنم لینے کے باوجود نہ تو حزب اللہ اور نہ ہی حماس امریکا اور اسرائیل کی کارروائیوں کے آگے کوئی بند باندھ سکے ہیں، بلکہ ان کی کارروائیوں کا الٹا اثر ہوا ہے اور امن قائم کرنے کی کارروائیوں پر ہی کاری ضرب لگتی رہی ہے، میں یہ سمجھتا ہوں کہ آج کے عرب مسلمانوں کی اکثریت کے حوصلے پست ہو چکے ہیں اور وہ خود سے شرمندہ دکھائی دیتے ہیں، غیر یقینی حالات اور نااہلی نے انھیں کسی کام کا نہیں رکھا اور عقل و دانش سے عاری

آمریتوں نے بھی انھیں اس لائق نہیں رہنے دیا کہ وہ مغرب کے خلاف کسی بڑی اسلامی تحریک کی حمایت کرسکیں، اس کے ساتھ ساتھ بااثر مسلم شخصیات نے ہمیشہ حکومتوں کے ساتھ ہی گٹھ جوڑ کیا ہے، پھر اس طرح کے مارشل لا کی حمایت کی گئی ہے جو 1946ء سے مصر پر مسلط ہے، اس کے علاوہ انھوں نے ''انتہاپسندوں'' کے خلاف کئی ایسے قوانین کو موثر بنایا ہے جو لاقانونیت کے دائرے میں آتے ہیں، اسلامی دنیا کے اندرونی خلفشار کی یہ کیفیت ایسی ہے کہ اس کی موجودگی میں اسلام سے کسی خطرے کی گنجایش نہیں نکلتی، اس کے باوجود اگر تشویش پائی جاتی ہے کہ اسلام سے خطرہ محسوس کیا جارہا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خطرے کے اس احساس کی وجہ کیا ہوسکتی ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ خودکش حملے ہوتے ہیں اور دوسرے اشتعال انگیز واقعات دیکھنے میں آتے ہیں، اگر یہ اسلام سے خطرے کی علامت ہیں تو پھر یہ کوئی خطرہ نہیں ہے کیونکہ انھوں نے تو اسرائیل، امریکا اور مسلم دنیا میں ان کی حلیف حکومتوں کے ہاتھ مضبوط کرنے کے سوا اور کوئی کام کیا ہی نہیں ہے؟

تاہم میں نے جو سوال اٹھایا ہے اس کا جواب جوڈتھ ملر کی کتاب جیسی کئی دوسری کتابوں میں موجود ہے یہ کتابیں ایک اضافی ہتھیار کا درجہ رکھتی ہیں جن کا مقصد امریکا، اسرائیل کی بالادستی کے خلاف ہر قسم کی عرب یا مسلم مزاحمت کو مقابلے میں شکست دینا، انھیں مجبور کرنا، مار کے بٹھا دینا، اور تابعدار بنانا ہے، مزید برآں خفیہ طور پر ایک ایسی پالیسی کو برحق قرار دینا بھی ان کتابوں کا کارنامہ ہے، جو حکمت عملی کے اعتبار سے اہم اور تیل کی دولت سے مالا مال علاقے کا تعلق پہلے اسلام سے جوڑتے ہیں پھر اسلام کو ظلم و جبر کی علامت کے طور پر پیش کرتے ہیں، اس اسلام دشمن مہم کے ذریعے یہ مصنفین مغرب یا اسرائیل کے ساتھ برابری کی سطح پر عربوں اور مسلمانوں کے مذاکرات کے امکانات کو بھی ختم کرنے پر لگے رہتے ہیں، ساری مسلم ثقافت کو اس بات پر شیطانی اور غیر انسانی قرار دے دینا کہ یہ جدیدیت سے ''مشتعل'' ہوتے ہیں، بھی ایک سوچی سمجھی چال ہے جس کا مقصد مسلمانوں کو ایک ایسی چیز ظاہر کرنا ہے جن کا نہ صرف علاج کرنے بلکہ جنھیں سزا دینے کی بھی ضرورت ہے، میں نہیں چاہتا کہ میرے متعلق کوئی غلط فہمی پیدا ہوجائے، اس لیے میں یہ واضح کردینا چاہتا ہوں کہ میرے نزدیک کسی سیاسی عمل کو پلٹنے کے لیے اسلام یا مسیحیت یا یہودیت کو استعمال کرنا برا ہی نہیں تباہ کن حد تک برا ہے، اس نوعیت کے طرز عمل کی نہ صرف سعودی عرب، مغربی کنارے، غزہ کی پٹی، پاکستان، سوڈان، الجزائر اور تیونس میں بلکہ اسرائیل میں بھی مخالفت ہونا چاہیے، اور دائیں بازو کے ان لبنانی مسیحیوں کو بھی جن سے ملر نے غیر معمولی ہمدردی کا اظہار کیا ہے، اس کی مخالفت کرنا چاہیے، میرے نزدیک یہ بات بھی درست

نہیں ہے کہ عرب ممالک میں تمام برائیوں کی ذمہ داری صیہونیت اور شہنشاہیت پر عائد ہوتی ہے، البتہ یہ بات درست ہے کہ ان امریکی اور یورپی باشندوں میں غصے اور خوف کے جذبات پیدا کرنے کے لیے جو اسرائیل میں ایک سیکولر اور آزاد حکومت دیکھنا چاہتے ہیں اسرائیل، امریکا اور اس کے حامی دانشوروں نے جنگی بنیادوں پر ایک تحریک اٹھائی ہے جس میں انھوں نے اس ''اسلام'' کو جو مغربی باشندوں کے لیے ایک تجریدی شے ہے نہ صرف کلنک کا ٹیکا قرار دیا ہے بلکہ حاسدانہ گالیوں کا ڈھیر بھی لگا دیا ہے، ملر اپنی کتاب کے آخر میں کہتی ہے کہ وہ دائیں بازو کے اسرائیلی ''یہودیوں'' کا تذکرہ ایک دوسری کتاب میں کرے گی، اس کی کتاب ''خدا کے ننانوے نام'' کی نوعیت ایسی ہے کہ یہودیوں کا ذکر اسی کتاب میں بنتا ہے، اس لیے اسے شامل نہ کرنے کی یہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ وہ کھل کے اسلام کے خلاف لکھنے کے لیے اپنی توجہ کو کسی دوسری طرف بھٹکنے سے روکنا چاہتی تھی۔

کسی دوسرے مذہب یا دنیا کے کسی دوسرے خطے کے بارے میں لکھنا ملر کے بس کی بات نہیں ہے، اس نے اس بات پر کئی بار زور دیا ہے کہ وہ ایک صحافی کے طور پر مشرق وسطیٰ میں پچیس سال تک رہی ہے، حیرت ہے کہ اس کے باوجود نہ اسے عربی آتی ہے نہ فارسی، پھر وہ یہ بھی تسلیم کرتی ہے کہ اسے ہر جگہ ایک مترجم کی ضرورت پیش آتی رہی ہے لیکن اس کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں تھا جس سے وہ اس بات کا تعین کرسکے کہ مترجم نے اسے جو بتایا ہے وہ درست اور اعتماد کے لائق ہے بھی یا نہیں، اس کی یہ خامی کوئی عام نوعیت کی نہیں ہے، وہ جس میدان میں طبع آزمائی کررہی ہے وہاں یہ قطعی ممکن نہیں ہے کہ کسی ایسے شخص کو روس، فرانس، جرمنی، لاطینی امریکا اور شاید چین اور جاپان کے لیے سنجیدگی کے ساتھ رپورٹر یا ماہر تسلیم کیا جائے، جسے ان ممالک کی زبانوں کی شد بد نہ ہو، لیکن طرفہ تماشا دیکھیے کہ جب اسلام کی بات آتی ہے تو کسی لسانی علم کی ضرورت دکھائی نہیں دیتی، کیونکہ مغرب کے یہ دانشور سمجھتے ہیں کہ وہ جس چیز سے نبردآزما ہو رہے ہیں وہ ''حقیقی معنوں میں'' کوئی ثقافت یا مذہب نہیں ہے بلکہ نفسیاتی الجھنوں سے ٹیڑھی ہوجانے والی کوئی چیز ہے۔

ملر نے اپنی کتاب کے حاشیوں میں جو حوالے دیئے ہیں وہ بھی اس کی لاعلمی کا منہ بولتا ثبوت ہیں، ان حاشیوں میں وہ صرف ان کا حوالہ دیتی ہے جو انگریزی میں دستیاب ہوتے ہیں یا ان مستند شخصیات کے فقرے شامل کرتی ہے جن کے خیالات اس کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں، اس کے اس طرز عمل سے مسلمانوں، عربوں، غیر مستشرق سکالروں کی کتابوں کی ایک پوری لائبریری اس کی اور اس کے قارئین کی دسترس سے باہر ہوجاتی ہے اس پر مشکل یہ ہے کہ وہ جب بھی ہمیں اپنی قابلیت سے متاثر کرنے کے لیے عربی کے ایک یا دو

محاورے بولتی ہے تو ہمیشہ غلطی کر جاتی ہے، یہ بڑے عام سے جملے ہوتے ہیں، کسی طرح بھی مشکل نہیں ہوتے اور اس کی غلطی ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمے کی غلطی بھی نہیں ہوتی، اپنی اس کم علمی کے متعلق اس نے اپنی کتاب کے شروع میں ہی بڑی مشقت کے ساتھ بڑے ''بامعنی'' دلائل پیش کیے ہیں اور ان دلائل کے ذریعے اس نے خود ہی اپنے آپ کو اس فروگزاشت کے لیے معاف کر دیا ہے، یہ کوئی عام غلطیاں نہیں ہیں پھر یہ ایک ایسی غیر ملکی خاتون سے سرزد ہوئی ہیں جسے نہ تو اس موضوع کی کوئی پروا تھی اور نہ احترام تھا جس پر پچیس برس تک قلم اٹھاتے ہوئے اس نے اپنی روٹی کمائی تھی، اگر وہ کچھ مشقت کر کے اس کا کچھ علم بھی حاصل کر لیتی تو اس میں کیا برائی تھی چلیے، اس بات کو چھوڑیئے اور اس کی غلطیوں کی طرف آیئے اپنی کتاب کے صفحہ 211 پر وہ قذافی کے متعلق سادات کا فقرہ یوں دہراتی ہے ''الولد مجنون'' اور اس کا ترجمہ ''وہ جنونی لڑکا'' کرتی ہے حالانکہ وہ جو فقرہ کہنا چاہ رہی ہے وہ فقرہ ''لڑکا جنونی ہے'' تھا جس کی بامحاورہ عربی ''الولد المجنون'' بنتی ہے، اسی طرح مصر کی مشہور اداکارہ شادیہ کے نام کو وہ بگاڑ کے شاآدیہ لکھتی ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ملر عربی کے حروف تہجی کے متعلق بھی معلومات نہیں رکھتی، اس کی ایک عادت یہ بھی ہے کہ وہ عربی کے الفاظ میں انگریزی کی طرح صیغہ جمع لگاتی ہے مثلاً وہ ثوب کی جمع ثوبز یا حنیف کی حنیفز لکھتی ہے، عربی کا اتنا ناقص علم رکھنے والی اس خاتون کی دیدہ دلیری دیکھیے کہ وہ کتاب کے صفحہ نمبر 315 پر یوں رعب جھاڑتی ہے کہ ''عربی میں ایک خوبصورت نظم...... عربی کی دوسری شاعری کی طرح اس وقت اپنا لطف کھو بیٹھتی ہے جب اس کا کسی دوسری زبان میں ترجمہ کیا جاتا ہے''۔

سوچنے کی بات ہے کہ اگر عرب اسلامی زندگی کی جزئیات کو سمجھنے کی، اس کی کوششیں، اتنی ہی ناکام تھیں تو اس کی سیاسی اور تاریخی معلومات کا عالم کیا ہوگا؟ دس اسلامی ممالک جن میں مصر، سعودی عرب، سوڈان وغیرہ شامل ہیں ان میں سے ہر ایک پر اس نے الگ الگ باب تحریر کیا ہے، ان میں ہر باب کسی نہ کسی کہانی سے شروع ہوتا ہے اس کے بعد وہ فوراً پرانے برتنوں کی تاریخ کا ذکر بڑے بچگانہ انداز میں چھیڑ دیتی ہے، وہ مختلف ذرائع سے حوالے چنتی ہے اکثر یہ ذرائع با اعتماد نہیں ہوتے پھر بھی وہ ان سب حوالوں کو جوڑ کر ایک ایسی تصویر بناتی ہے جس کا مطلب یہ ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ وہ اس موضوع پر بہت دسترس رکھتی ہے مگر ہوتا یہ ہے کہ ان سے اس کے افسوسناک تعصبات یا تجزیے کی ناکامی جھلکتی ہے اور فہم و فراست کی کمی صاف دکھائی دیتی ہے۔ مثال کے طور پر سعودی عرب سے متعلق باب میں وہ ایک حاشیے میں ہمیں بتاتی ہے کہ پیغمبر (حضرت) محمد (ﷺ) کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا اس کا ''پسندیدہ'' ذریعہ فرانسیسی مستشرق میکسم روڈن سن (Maxime Rodinson)

ہے، روڈن سن بلاشک وشبہ ایک مارکسسٹ سکالر ہے، اس نے پیغمبر (حضرت) محمد (ﷺ) کی سوانح لکھی ہے جس میں مذہب کے خلاف طنز سے پر چوٹوں اور بڑی زبردست علیت کا امتزاج ملتا ہے، اس سے ملر جو حاصل کرتی ہے وہ (حضرت) محمد (ﷺ) کی زندگی اور تصورات پر ایک تلخیص ہے جو چار یا پانچ صفحات پر مشتمل ہے، اس تلخیص میں اس نے بڑا گھٹیا انداز اختیار کیا ہے، پھر وہ (حضرت) محمد (ﷺ) پر تبصرہ کرتے ہوئے کسی ایک بھی مسلم مفکر کا حوالہ نہیں دیتی اور مکمل طور پر مغربی مستشرقین کی یاوہ گوئیوں پر انحصار کرتی ہے، یہ صورت حال بڑی عجیب ہے اور اسے سمجھنے کے لیے ذرا ایک ایسی کتاب کا تصور کیجیے جو یورپ یا امریکا میں (حضرت) عیسیٰ یا (حضرت) موسیٰ پر لکھی جائے اور اس میں کسی ایک بھی یہودی یا مستند عیسائی کتاب کا حوالہ نہ دیا گیا ہو، اس کی ناسمجھی یہیں تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ (حضرت) محمد (ﷺ) پر اپنی اس خاص توجہ کا جواز یہ پیش کرتی ہے کہ اس (حضرت) محمد (ﷺ) نے ایک مذہب اور ایک ریاست کی بنیاد رکھی تھی، یہ رائے بھی اگرچہ اس کی اپنی قائم کی ہوئی نہیں ہے مگر یہاں سے بھی وہ قلابازی کھاتی ہے اور ساتویں صدی سے اڑتی ہوئی سیدھی حال میں پہنچ جاتی ہے، اور آج کا سلسلہ اس زمانے سے یوں جوڑتی ہے جیسے اسلامی ریاست کے بانی آج کے دور کی تاریخ سے گہری نسبت رکھتے ہوں، ملر نے یہ انداز بھی لیوئس سے لیا ہے۔

ملر نے یہ کتاب ''خدا کے ننانوے نام'' کچھ اس انداز میں لکھی ہے کہ کوئی بھی اسے پڑھنے کے بعد اس بات کو فراموش نہیں کر سکتا کہ وہ بنیادی طور پر ایک خاص رجحان رکھنے والی ایسی رپورٹر ہے جسے سیاست متحرک کیے ہوئے ہے، وہ سکالر نہیں ہے اور نہ وہ کسی معاملے میں ماہر کا درجہ رکھتی ہے، اسے تو ایک سلجھا ہوا اور منضبط مصنف بھی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اس کی کتاب میں دلائل اور نظریات کے بجائے ایسے طویل انٹرویو سمو دیئے گئے ہیں جنھوں نے اس کے زیادہ تر حصے کو سمیٹ لیا ہے، یہ انٹرویو قابل رحم، مبہم اور خودغرض مسلمانوں اور ان پر کبھی کبھار تنقید کرنے والے افراد سے لیے گئے ہیں، اس کتاب میں بیان کیے گئے چھوٹے چھوٹے تاریخی واقعات سے گزر کر جب ہم آگے بڑھتے ہیں تو ہمارے سامنے ایسے بے ترتیب موڑ تیزی کے ساتھ آنے لگتے ہیں جن سے اس علاقے کے متعلق اس کی سچی معلومات تو ابھر کر سامنے نہیں آتیں، البتہ یہ تاثر ضرور قائم ہوتا ہے کہ اس نے بھرتی کے لیے بے شمار چیزوں کو اکٹھا کر لیا ہے، جن کا مصرف قاری کو بور کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں، اس کے اعلیٰ خیالات کا اظہار اس فقرے سے خوب ہوتا ہے کہ ''اور شامیوں کو جنگ وجدل سے پُر اپنی تاریخ کو (سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ کون سا ملک ہے جس پر جنگ وجدل کی بات صادق نہیں آتی) ذہن میں رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ وہ طوائف الملوکی کی طرف لوٹ جائیں یا اپنی کامیابی کو اقتدار کی ایک

طویل اور خونریز کشمکش میں تلاش کریں (کیا یہ صرف اس شام کے لیے ہی مخصوص ہے جو دوسری جنگ عظیم سے پہلے ایک نوآبادیاتی ریاست تھا یا یہ بات شام جیسی ان دوسری سینکڑوں ریاستوں پر بھی ٹھیک بیٹھتی ہے جو ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکا میں پھیلی ہوئی ہیں)......اور شاید زیادہ تر سیکولر ریاستوں میں بھی عسکریت پسند اسلام کی فتح (اس نے کسی تھرمامیٹر کے ذریعے یہ پیمائش کی ہے) بڑی تشویشناک ہے'' اس تحریر میں سے اگر زبان کا ناپسندیدہ انداز اور جبڑوں کو ہلا دینے والے، بازاری جھٹکوں کو نظرانداز کر بھی دیا جائے تو باقی جو بچتا ہے وہ کسی قسم کا کوئی خیال نہیں کہلا سکتا، بلکہ اسے ہم یوں بیان کر سکتے ہیں کہ غیر منطقی خیالات کے ایک سلسلے کو ایسے دعووں میں مدغم کر دیا گیا ہے، جن کی تصدیق نہیں ہو سکتی چنانچہ ان سے جو شکل سامنے آتی ہے وہ ملر کی کم اور ''شامیوں'' کے ''خیالات'' کی زیادہ ترجمانی کرتی ہے۔

ملر کی باتیں بڑی بودی اور غیر موثر ہوتی ہیں، چنانچہ ان میں جان ڈالنے کے لیے وہ'' میرے دوست'' جیسے جملے استعمال کرتی ہے اور اس طرح قارئین کو یہ یقین دلانا چاہتی ہے کہ وہ حقیقی معنوں میں نہ صرف بااثر لوگوں کو جانتی ہے بلکہ جو لکھتی ہے اس کے متعلق اسے علم ہوتا ہے کہ وہ کیا لکھ رہی ہے، اس سے وہ یہ تاثر بھی دینا چاہتی ہے کہ اس کے'' دوست'' اسے راز کی بڑی بڑی باتیں بتا دیتے ہیں اور ان سے ان باتوں کا اگلوانا اسی کا کمال ہے، لیکن دوستوں کے حوالے سے وہ جو باتیں تحریر کرتی ہے ان کا اور تو کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا البتہ اسلامی فکر کے شواہد سرے سے ہی غائب ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ صرف غلط بیانیاں رہ جاتی ہیں، یہاں تک کہ مقامی سیاست، سیکولر اداروں کی سرگرمیاں، یا اسلام پسندوں اور قوم پرستوں کے درمیان جاری مقابلے جیسے موزوں اور مناسب موضوع یا تو پس پردہ چلے جاتے ہیں یا نظرانداز ہو جاتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملر،[1] محمد ارکون یا محمد الجبری یا جارج تبریشی یا ایڈونس (Adonis) یا حسن حنفی یا ہشام دِیجات کے

1۔ یہ اصحاب اپنی تحریروں کے حوالے سے مغرب اور عرب دنیا میں بڑے معتبر ہیں، ان کی بے شمار کتابیں ہیں، یہ یورپ، امریکا، مشرق وسطی کی یونیورسٹیوں میں پڑھاتے بھی ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں، محمد ارکون الجزائری ہیں، انگریزی، فرانسیسی اور عربی پر انھیں عبور حاصل ہے، انھوں نے اسلام اور جدیدیت پر کئی کتابیں لکھی ہیں، یہ 1928ء میں پیدا ہوئے تھے اور سیکولرازم کے حامی ہیں، جارج تبریشی کا تعلق شام سے ہے 1939ء میں پیدا ہوئے، فرائیڈ، ہیگل، سارترے سمیت مغرب کے کئی فلسفیوں کے نظریات کا ترجمہ کر چکے ہیں، انھوں نے قوم پرستی اور مارکسزم پر بھی کتابیں لکھی ہیں، ایڈونس کا اصلی نام علی احمد سعید ہے شام کے رہنے والے ہیں اور 1930ء میں پیدا ہوئے، بنیادی طور پر شاعر ہیں اور انھوں نے جدیدیت پر بڑا کام کیا ہے، ان کی بیگم خالدہ سعید بڑی معروف ادبی نقاد ہیں، حسن حنفی مصری فلسفی ہیں، 1935ء میں پیدا ہوئے، 1978ء میں انقلاب ایران کے زبردست حامیوں میں شامل ہو گئے ہیں، انھوں نے مغربی دنیا کے لیے اسلامی اور عرب دنیا کے لیے مغربی فلسفے پر کتابیں لکھی ہیں، ہشام دِیجات تیونس کے رہنے والے ہیں اور مذہب کو حکومت سے الگ رکھنے کے قائل ہیں۔ (مترجم)

بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی، یہ وہ اصحاب ہیں جن کے نظریات اس وقت اسلامی دنیا میں بڑی سنجیدہ بحث کا موضوع بنے ہوئے ہیں۔

ملر نے اسرائیل کے لیے جو باب مختص کیا ہے، وہ علم اور تجزیے کی خوفناک ناکامی کا منھ بولتا ثبوت ہے، اول تو اس علاقے کو اسرائیل کہنا ہی غلط ہے کیونکہ یہ خطہ تاریخ کے ابتدائی ادوار سے ہی فلسطین کہلاتا چلا آیا ہے، پھر اس نے جو لکھا ہے وہ اسرائیل کے نہیں فلسطین کے بارے میں ہے مگر اس کی تحریر کا کمال یہ ہے کہ انتفادہ اور تین عشروں سے جاری اسرائیلی قبضے سے فلسطین میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں وہ انھیں نظرانداز کر دیتی ہے، اسی طرح اوسلو معاہدے اور یاسر عرفات کی شخصی حکمرانی سے عام فلسطینیوں کی زندگی پر جو برے اثرات مرتب ہوئے ہیں، ان کے متعلق بھی وہ کسی کراہت کا اظہار نہیں کرتی، پھر یہ بھی کوئی اتفاق نہیں ہے کہ امریکی پالیسی کی حمایت نے ملر کو دوسروں کے مقابلے میں حماس کا زیادہ دیوانہ بنا رکھا ہے، اسی لیے وہ اس علاقے کی خراب حالت کا تعلق حماس سے نہیں جوڑتی جس پر اسرائیل برسوں سے جبر کی حکمرانی کر رہا ہے، وہ تو اس بات کا بھی ذکر نہیں کرتی کہ غزہ کی اسلامی (حماس) یونیورسٹی فلسطینیوں کی وہ واحد یونیورسٹی ہے جسے فلسطینیوں کے سرمائے سے قائم نہیں کیا گیا، بلکہ اسے اسرائیل نے پی ایل او کے انتفادہ کو ناکام بنانے کے لیے قائم کیا تھا، ملر یہودیوں کے خلاف (حضرت) محمد (ﷺ) کے تحت اقدامات کا تو ذکر کرتی ہے مگر ''غیر یہودیوں'' کے متعلق اسرائیل کے عقائد، بیانات اور قوانین کو چھیڑتی بھی نہیں، حالانکہ سب جانتے ہیں کہ یہودیوں کے مذہبی پیشوا جسے ربی کہتے ہیں، اس کی اجازت سے ہی لوگوں کو اسرائیل سے ملک بدر کیا جاتا رہا ہے، لوگ قتل کیے جاتے ہیں، گھر مسمار ہوتے ہیں، زمینیں چھین لی جاتی ہیں اور علاقے زبردستی اسرائیلی مملکت میں ضم کر لیے جاتے ہیں، ہمارے لیے یہاں سارا رائے (Sara Roy) کا ذکر ضروری ہو جاتا ہے، غزہ کے معاملے میں اس کی رائے کو مستند مانا جاتا ہے اور وہ کہتی ہے کہ اس علاقے میں بڑے منظم طریقے سے معاشی بدحالی پیدا کی گئی ہے، ان حقائق کی چند بوندیں ملر نے سمیٹی ضرور ہیں لیکن وہ اس طرف نہیں آتی کہ اس علاقے میں بلاشبہ جو اسلامی جذبہ موجود ہے اسے شدید بنانے میں ان اسرائیلی اقدامات کا بھی ہاتھ ہے۔

ملر لوگوں کو متاثر کرنے کے لیے اپنے قارئین کو ہر ایک کے مذہب کے بارے میں بتاتی ہے، فلاں عیسائی ہے، سنی مسلم ہے، شیعہ مسلم ہے وغیرہ وغیرہ اس کے اس طرز عمل سے یہ نکتہ پیدا ہوتا ہے کہ جو شخص زندگی کے ان پہلوؤں کی طرف متوجہ ہو، وہ کس طرح حالات اور واقعات کی صحت کا خیال رکھ سکتا ہے، اس سے تو صرف دلچسپ شور و غوغا کی ہی توقع کی جا سکتی ہے، اس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ وہ ہشام شرابی کا ذکر

ایک ''دوست'' کی حیثیت سے کرتی ہے، لیکن اسے عیسائی بتاتی ہے، حالانکہ وہ سنی مسلمان ہے، اسی طرح وہ بدرالجج کو مسلمان لکھتی ہے جبکہ وہ مارونی (Maronite) مسیح ہے اگر وہ ہمیں متاثر کرنے کے لیے معلومات اور بے شمار لوگوں کے ساتھ اپنے بے تکلف رابطوں پر اتنا زیادہ اصرار نہ کرتی تو اس کی تحریر میں ان خامیوں کو نظر انداز کرنا ممکن تھا مگر اس نے اس بات کو یوں چھیڑ رکھا ہے اور نظریات کو ان میں اس طرح پرو دیا ہے کہ کسی بات کو فروگزاشت کر دینا ممکن نہیں رہا، ایک اور بات جسے مِلر کے اس مخصوص انداز نے اہم بنا دیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنے مذہبی پس منظر یا سیاسی جھکاؤ کے متعلق کچھ نہیں بتاتی، حالانکہ وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتی ہے وہ پوری طرح مذہبی اور نظریاتی جذبات سے پُر ہوتا ہے اور وہ اس بات کو تسلیم بھی کرتی ہے کہ اس کے موضوع اسی نوعیت کے ہوتے ہیں، اس صورت میں اس کے جھکاؤ کا واضح ہونا لازمی ہو جاتا ہے، میرے خیال میں وہ مسلمان یا ہندو تو ہے نہیں اور اس بات پر بھی یقین کرنے کو دل نہیں مانتا کہ اس کے نزدیک اس قسم کے موضوعات پر قلم اٹھانے کے لیے ذاتی مذہبی تعلق کے کوئی معنی نہیں ہوتے ہوں گے اس عالم میں یہ بات سوچنی پڑتی ہے کہ جن لوگوں سے اس نے معلومات اگلوائی ہیں کیا وہ جانتے تھے کہ وہ کس سے بات کر رہے ہیں اور ان میں سے کتنے ایسے ہیں جنھیں اب یہ اندازہ ہو گیا ہے کہ ان کے بارے میں کیا کہا گیا ہے۔

تاہم جب وہ صاحب اقتدار افراد اور بعض واقعات کے ساتھ اپنے جذباتی تعلق کا ذکر کرتی ہے تو اس کے انداز پر شرمندگی محسوس ہوتی ہے مثلاً وہ کہتی ہے کہ جب اردن کے شاہ حسین کے بارے میں یہ تشخیص سامنے آئی کہ انھیں کینسر ہو گیا ہے تو اس خبر نے اسے بہت ''غم زدہ'' کر دیا، شاہ کے لیے اتنے نازک جذبات رکھنے والے یہ خاتون شاذ ہی اس طرف آتی ہے کہ شاہ حسین نے ملک کو ایک ایسی ریاست میں بدل کے رکھ دیا تھا جہاں لوگوں کو اذیتیں پہنچائی جاتی تھیں، انصاف کی خلاف ورزی کرتے ہوئے قید کر دیا جاتا یا ٹھکانے لگا دیا جاتا تھا، وہ یہ بھی بتاتی ہے کہ جب اس نے لبنان میں عیسائیوں کے ایک چرچ کی بے حرمتی کے ثبوتوں کی ایک جھلک دور سے دیکھی تو اس کی آنکھیں ''غصے کے آنسوؤں سے بھر گئیں'' حیرت ہے کہ اسرائیل میں بے حرمتی کے واقعات کو وہ لائق توجہ بھی نہیں سمجھتی، مثال کے طور پر مسلمانوں کے قبرستان، شام، لبنان اور فلسطین کے وہ سینکڑوں دیہات جنھیں ملیامیٹ کر دیا گیا ہے، اس پر قطعی اثر انداز نہیں ہوتے، اور وہ اپنے انداز میں الٹی سیدھی ہانکتی رہتی ہے، درج ذیل پیرے میں اس نے متوسط گھرانے کی اس شامی عورت کا ذکر کیا ہے جس کی بیٹی تازہ تازہ مسلمان ہوتی ہے اور جس نے غلطی سے مِلر کو اپنا مہمان بنا لیا تھا: اس تحریر کا خاصہ یہ ہے کہ مِلر نے اس میں شامی خاتون سے منسوب کر کے جس قدر باتیں کی ہیں وہ سب اس کے اپنے خیالات اور اپنی خواہشیں

ہیں۔ وہ لکھتی ہے کہ:

> اسے کبھی کوئی ایسی چیز حاصل نہیں ہو سکے گی جس کی ایک متوسط طبقے کی ماں اپنی بیٹی کے لیے آرزو کرتی ہے، وہ اپنی بیٹی کی شادی پر بھلا کہاں شاندار دعوت کر سکے گی، شادی کا رسمی سفید جوڑا کیسے لائے گی، ہیروں سے جڑا ہوا تاج کیونکر اسے پہنا سکے گی، کیا دولہا جیکٹ اور دلہن گاؤن میں ملبوس ہو کر اپنی ازدواجی زندگی کے آغاز کی تصویر کھنچوا سکیں گے، اور کیا اس تصویر کو روپہلے فریم میں جڑ کر کافی کی میز یا انگیٹھی کے پیچھے پر سجانا ممکن ہوگا، اس شادی کی تقریب میں یہ بھی تو نہیں ہوگا کہ پہلے ڈانس سٹیج پر دھما چوکڑی مچائیں پھر سحر ہونے تک شمپین کے جام لنڈھائے جاتے رہیں، شاید نادینا کے دوستوں کی بھی ایسی بیٹیاں اور بیٹے ہوں گے جن کے ساتھ اسلام قبول کرنے پر تعلق توڑ لیا گیا ہو اور جن سے اسلام قبول کرنے پر اندر ہی اندر نفرت کی جا رہی ہو، شاید وہ اس سمجھوتے پر کڑھتے ہوں جو ان نوجوانوں نے اسد کی ظالم اور بے روح حکومت سے عنایات حاصل کرنے کی خاطر کر لیا ہے، شاید وہ یہ بھی سوچتے ہوں کہ دمشق کے بورژوا طبقے کے اگر یہ ستون طاقت کے آگے ٹوٹ کے بکھر سکتے ہیں تو پھر کون ایسا ہے جو طاقت کے اس سیلاب سے محفوظ رہ سکتا ہے؟

مِلر کی کتاب کے بارے میں سب سے دلچسپ سوال یہ ہے کہ اس نے اسے آخر تحریر کیوں کیا ہے، یقیناً اس نے اسے کسی کی محبت میں تو نہیں لکھا، اس لیے اس کا اگر دوسرے رخ سے جائزہ لیں تو ہمارے سامنے اس کے اپنے الفاظ آ جاتے ہیں وہ خود اس بات کا اعتراف کرتی ہے کہ وہ لبنان کو ناپسند کرتی اور اس سے ڈرتی ہے، شام سے اسے نفرت ہے، لیبیا کا وہ مذاق اڑاتی ہے، سوڈان کو مسترد کر دیتی ہے، مصر پر اسے افسوس ہوتا ہے اور وہ تشویش میں مبتلا ہو جاتی ہے جبکہ سعودی عرب سے اسے کراہت آتی ہے، ایسے جذبات کی مالک خاتون جب اس خطے کے متعلق لکھے گی تو کیا لکھے گی؟ وہ اپنے جذبات کی ترجمانی ہی کرے گی ناں، ذرا اس کی شدت پسندی کو دیکھیے کہ اس نے اس خطے کی زبان سیکھنے کی کوشش ہی نہیں کی پھر وہ جن منظم اسلامی عسکری قوتوں کے خطرات کے متعلق ایک تواتر سے لکھ رہی ہے ان کی تعداد میرے اندازے کے مطابق، ایک ارب افراد پر مشتمل اسلامی دنیا میں بمشکل پانچ فی صد بنتی ہے، اس قدر کم تعداد کے اعمال و افعال کو لے کر پوری اسلامی دنیا کی مخالفت پر چل نکلنا کہاں کی عقلمندی ہے وہ تو کھلم کھلا اس بات کا اظہار کرتی ہے کہ وہ اس بات کی

حامی ہے کہ مسلمانوں کو شدت کے ساتھ کچل دیا جائے، مگر وہ اذیت پہنچانے اور غیر قانونی'' ذرائع استعمال کرنے کی حمایت نہیں کرتی، اس کے اس بیان میں یہ واضح تضاد موجود ہے کہ کچلنے کے عمل میں اذیت بھی ہوتی ہے اور غیر قانونی ذرائع بھی استعمال ہوتے ہیں، مگر اس طرف اس کا دھیان نہیں جاتا کہ امریکا، مصر، اردن، شام اور سعودی عرب جیسے جن ممالک کی پشت پناہی کر رہا ہے، ان ممالک میں جمہوری اقدار کی نفی اور قانونی ضوابط سے لاتعلقی اسے اس لیے قطعی پریشان نہیں کرتی کہ اس طرز حکمرانی کا نشانہ مسلمان بن رہے ہیں، اس نے اپنی کتاب میں ایک واقعہ لکھا ہے، یہ سچا واقعہ ہے، اس میں اس نے جیل میں دہشت گردی کے ایک مسلمان ملزم سے اسرائیلی پولیس کی پوچھ گچھ کو بیان کیا ہے، یہ تحقیق اس نے نہ صرف خود دیکھی ہے بلکہ اس میں حصہ بھی لیا ہے، لیکن اس نے اپنی کتاب میں اسرائیلی پولیس کی ایذا رسانی کے منظم طریقوں، چھپ کر قتل کرنے کے انداز، نصف شب کی گرفتاریوں اور گھروں کے انہدام کی قابل گرفت کارروائیوں کو بڑی نرمی کے ساتھ نظر انداز کر دیا ہے، جبکہ ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے شخص سے وہ خود سوال پوچھنا پسند کرتی ہے۔

شاید ایک صحافی کی حیثیت سے اس کی سب سے بڑی اور مسلسل ناکامی اس بات کو قرار دیا جا سکتا ہے کہ اس نے اسلامی دنیا کی عسکریت اور دوسری صفات سے نفرت کا جو نظریہ اپنا لیا ہے اس کا تجزیہ بھی اسی نوعیت کا ہوتا ہے اور وہ رابطے بھی اسی حوالے سے کرنا پسند کرتی ہے، میرا اس عام نظریے سے قطعی کوئی اختلاف نہیں ہے کہ خاص طور پر عرب اسلامی دنیا بڑی بری حالت میں ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ پچھلے تین عشروں کے دوران میں نے یہ بات بار بار تحریراً اٹھائی بھی ہے، لیکن ملر عرب اسلامی دنیا کو اس حال تک پہنچانے میں اسرائیل اور امریکا کے کردار کی برائے نام درست تصویر بھی پیش کرنے سے قاصر ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ تو اس بات کا بمشکل ہلکا سا اعتراف کرتی ہے کہ امریکا کی ایک طے شدہ عرب اور اسلام دشمن پالیسی موجود ہے، اور یہ اعتراف بھی اتفاقاً افغانستان کے واقعہ میں اس وقت سامنے آ گیا تھا جب اس نے سرسری اور بڑے نرم انداز میں اس کا ہلکا پھلکا ذکر کر دیا تھا، اب لبنان کی مثال لیجیے وہ 1982ء میں بشیر جمائیل کے قتل کا حوالہ دیتے ہوئے یہ تاثر قائم کرتی ہے کہ اس نے انتخابات میں عوام کی زبردست حمایت سے کامیابی حاصل کر لی تھی، یہاں وہ اس حقیقت کو بیان نہیں کرتی کہ شتیلہ اور صابرہ کے مہاجر کیمپوں میں قتل عام کے سانحہ سے پہلے بشیر جمائیل کو اس وقت اقتدار میں لایا گیا تھا جب مغربی بیروت پر اسرائیلی فوج کا قبضہ تھا، پھر وہ یوری لبرانی (Uri Lubrani) جیسے ان تمام اسرائیلی ذرائع کو نظر انداز کر دیتی ہے جو اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ بشیر جمائیل کئی برسوں سے لبنان میں موساد کا نمائندہ تھا، ملر تو اس بات کو بھی نظر انداز کر دیتی ہے کہ وہ نہ صرف

قاتل بلکہ مانا ہوا ٹھگ بھی تھا،، اسی طرح اس نے اس بات پر بھی توجہ نہیں دی ہے کہ لبنان کے اقتدار کا موجودہ ڈھانچہ علائی ہوبی کا (Elie Hobeika) جیسے لوگوں سے بھرا ہوا ہے، یہ وہ لوگ ہیں جنھیں فلسطینی مہاجرین کے کیمپوں میں قتل عام کروانے کا مجرم قرار دیا گیا تھا، ملر جہاں سامی النسل سے عربوں کی دشمنی کی مثالیں دیتی ہے وہاں اسے چاہیے تھا کہ وہ اسرائیل کے اس نسلی مباحثے پر بھی توجہ کرتی جو عربوں اور مسلمانوں کے خلاف جاری ہے، اسی تناظر میں اگر ہم شہریوں کے خلاف اسرائیل کے جنگی اقدامات کی طرف آئیں تو ان کا سلسلہ بڑی دور تک پھیلا ہوا ہے، اسرائیل نے فلسطینیوں کے خلاف ایک منظم مہم جاری کر رکھی ہے جس کے تحت نہ صرف جنگی قیدیوں اور مہاجر کیمپوں میں رہنے والوں کے خلاف کارروائی ہوتی ہے بلکہ دیہاتوں پر تباہی نازل کی جاتی ہے، ہسپتال اور سکول بمباری کا نشانہ بنتے ہیں اور اس طرح جان بوجھ کر ہزاروں، لاکھوں پناہ گزین تیار کرنے کا سلسلہ جاری رہتا ہے مگر ان کا ذکر اگر کہیں ہوتا بھی ہے تو ہنسی اور ٹھٹھول میں، اس طرح یہ سب نظروں سے اوجھل رہتے ہیں، جو باتیں ملر کے طے شدہ نظریے کے کسی نہ کسی طرح خلاف جاتی ہیں، انھیں وہ تحقیر کی نظر سے دیکھتی ہے لیکن وہ اس طویل گفتگو کو پسند کرتی ہے جس کے ذریعے ایسے منصوبے سامنے آئیں جو امریکا کی حمایت سے یہ ثابت کر دیں کہ مسلمان اسی لائق ہیں کہ انھیں اسرائیلی تشدد کا نشانہ بنایا جائے، اس کی سوچ کا یہ انداز ہمیں یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ ملر نے مشرق وسطیٰ کی کوریج کے مرکزی دھارے میں ایک مثالی کردار کا مقام کیونکر حاصل کیا ہے۔

ملر کی کتاب سے کوئی بھی شخص یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ اسلامی دنیا میں اس وقت مشرق وسطیٰ اور اسلام کی ترجمانی اور نمائندگی ایک ایسا موضوع ہے جو سلگتا ہوا تنازع بن چکا ہے مگر یہ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے ذرائع کے انتخاب میں بڑی جانبداری کا مظاہرہ کرتی ہے، اور عرب قومیت کی سخت دشمن ہے اس نے اپنی کتاب میں کئی جگہ اس بات کا ذکر بھی کیا ہے کہ اس کی نظر میں عربوں کی قوم پرستی مر چکی ہے پھر وہ امریکا کی ان پالیسیوں کی بھی حامی ہے جو کئی اعتبار سے موجودہ حالات کو پیدا کرنے اور بگاڑنے کی ذمہ دار ہیں، وہ فلسطینیوں کی قوم پرستی کے ہر اس تصور کی کٹر دشمن ہے جو اس کے پہلے سے طے شدہ اصولوں اور ضابطوں پر پورا نہیں اترتا اور جس میں فلسطینی بغاوت کے جراثیموں سے پاک اور بے ضرر دکھائی نہیں دیتے، وہ اس کی بھی طرفدار ہے کہ اوسلو معاہدے کے تحت فلسطینیوں کے لیے اسی طرح کے علاقے مخصوص کر دیے جائیں جس طرح جنوبی افریقہ میں نسلی امتیاز کی پالیسی کے تحت سیاہ فاموں کے لیے مخصوص کیے گئے تھے اور جنھیں بنتستان (Bantustans) کہتے تھے، ان تمام ''خوبیوں'' سے اس کے متعلق کیا اندازہ لگایا جا سکتا ہے؟

میرے لیے ملر ایک سطحی صحافی ہے جس کی پانچ سو صفحات کی کتاب اس اعتبار سے بڑی طویل ہے کہ اس نے صرف یہ بات جتانے کے لیے اتنے صفحات برباد کر دیے ہیں کہ سوچے سمجھے اور چھان بین کیے بغیر اگر مفروضے جمع کر لیے جائیں اور میڈیا کے ذریعے ان کی تشہیر کر دی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔

یہ مفروضے اخباروں کی رپورٹنگ کو کس حد تک متاثر کر سکتے ہیں، یہ بات ڈرامائی انداز میں ایک ریڈیو پروگرام کے ذریعے کھلی، اس پروگرام کا موضوع'' اوراب جمہوریت'' (Democracy Now) تھا، اس کا اہتمام 5 رمئی 1996ء کو پیسیفک ریڈیو (Pacifica Radio) نے کیا تھا، اوراس میں بیت المقدس میں نیو یارک ٹائمز کے بیورو چیف سرجی شمیمان (Serge Schmemann) اور رابرٹ فسک (Robert Fisk) نے شرکت کی تھی، فسک برطانوی اخبار انڈی پینڈنٹ (Independent) کے لیے لبنان سے لکھتا تھا، اسرائیل نے جب اپریل 1996ء میں لبنان پر حملہ کیا تو ان دونوں نے سرحد کی دو مختلف اطراف سے اس واقعہ کی رپورٹنگ کی تھی، اس کے باوجود ان کی رپورٹوں اور ریڈیو پر ان کے مباحثے سے جو بات ابھر کر سامنے آئی وہ صحافت کے اصولوں پر پوری نہیں اترتی، اس سلسلے میں امریکی صحافی نے شاید لاشعوری طور پر وہی طرزِ عمل اختیار کیا جو ملر کا تھا، اس نے پہلے یہ بتایا اور پھر اسے درست ثابت کرنے کی کوشش کی کہ 1982ء سے اسرائیل نے جنوبی لبنان کی ایک پٹی پر قبضہ کر کے اسے حفاظتی علاقہ قرار دے رکھا ہے اور اس مقبوضہ علاقے میں اس نے کرائے کی ایک لبنانی فوج قائم کر رکھی ہے، جنوبی لبنان پر قبضے اور اس میں تعینات اسرائیل کی لبنانی فوج کی مزاحمت حزب اللہ کر رہی ہے، جو ایک نام نہاد خدا کی پارٹی ہے، یہ پارٹی اسرائیلی قبضے کو ختم کروانا چاہتی ہے، اس کے چھاپہ مار جنوب میں ہی رہتے ہیں اور یہیں سے اس لیے جنگ کرتے ہیں تاکہ ان کے متعلق یہ بات مشہور ہو سکے کہ یہ چھاپہ ماروں کا ایک ایسا گروپ ہے جو اپنے ملک پر غیر قانونی قبضے کے خلاف لڑ رہا ہے، اس تفصیل کو بیان کرنے کے بعد شمیمان نے یہ نکتہ پیش کیا تھا کہ امریکی پریس میں ایک تو حزب اللہ کے مذہب پر بہت زور دیا جا رہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس مفروضے کو بھی اٹھایا جا رہا ہے کہ حزب اللہ چونکہ اسرائیل سے نبرد آزما ہے اس لیے یہ دہشت گرد تنظیم ہے۔

یکم اپریل 1996ء کو دی ٹائمز (The Times) نے خبر دی تھی کہ اسرائیل نے جنوبی لبنان پر گولہ باری کی ہے جس سے دو شہری جاں بحق ہو گئے ہیں، اس پر'' خدا کی عسکریت پسند پارٹی نے جوابی کارروائی کی دھمکی دی ہے'' یہ رپورٹ کسی سے موسوم نہیں کی گئی تھی بلکہ اس کا حوالہ گمنام تھا اور اس میں بتایا گیا تھا کہ'' پچھلے ماہ سے اب تک چھ اسرائیلی فوجیوں کو جنوبی لبنان کی اس سرحدی پٹی میں ہلاک کر دیا گیا ہے جس پر اسرائیل کا قبضہ ہے،

اس سے سرحد کے دونوں جانب کشیدگی بہت بڑھ گئی ہے'' اس میں کوئی شک نہیں کہ عام حالات میں چھاپہ ماروں کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ قابض فوج سے مقابلہ کریں، لیکن یہاں اس مسئلے کا بنیادی حوالہ'' عسکریت پسند'' اسلامی پارٹی ہے جس کے سامنے آتے ہی امریکی قارئین کے دماغ میں بنیاد پرستی اور اسلامی خطرہ جیسی دوسری باتیں آ جاتی ہیں اور وہ حزب اللہ کا تعلق ان سے جوڑ دیتے ہیں، یہاں اس بات کا ذکر کرنا بھی ضروری بنتا ہے کہ 10 راپریل کو دی ٹائمز کے اسرائیلی نمایندے جوئیل گرین برگ (Joel Greenberg) نے اپنی رپورٹ میں حزب اللہ کے متعلق یہ فقرہ لکھا کہ'' ایران کی شیعہ حکومت کے حمایت یافتہ'' اس کے بعد سے لبنان کے جنگی محاذ سے دی ٹائمز میں جو خبر یا مضمون شائع ہوا اس میں یہ فقرہ ضرور موجود ہوتا تھا، جب دو ہفتوں بعد اسرائیلی حملہ تمام ہوا تو اس کے ساتھ ہی یہ فقرہ بھی اس زمانے کی رپورٹوں سے خارج ہو گیا، اس سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک اسرائیل کا تعلق ہے دی ٹائمز کی خواہش یہ ہے کہ وہ اس بات کو خوب پھیلائے کہ حزب اللہ جنوبی لبنان پر قبضے کی مزاحمت کرنے والے نہیں ہیں بلکہ وہ اس ملک کے دشمن اور عسکریت پسند مسلمان ہیں اور یہ بہت جلد دہشت گرد بن جائیں گے، بارہ اپریل کو شمیمان حزب اللہ کا ذکر'' شیعہ مسلمانوں کی عسکریت پسند تنظیم جسے ایران کی حمایت حاصل ہے''، کے طور پر کرتا ہے اس کی تحریر کا انداز کچھ ایسا ہے جیسے وہ خبردار کر رہا ہو کہ پاگل مسلمان پھر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور حسبِ معمول یہودیوں کو قتل کر رہے ہیں، شمیمان اپنی اس کہانی میں'' قریہ شمعون کے خوفزدہ اسرائیلی باشندوں'' کا ذکر تو کرتا ہے لیکن اس بیروت شہر کا کوئی تذکرہ نہیں کرتا، جو اس وقت اسرائیلی بمباری سے خوفزدہ شہریوں سے بھرا ہوا تھا۔

حقائق کی شکست و ریخت اور ان کے مقابلے میں نظریے کی فتح کا نمونہ اسی دن کے دی ٹائمز کا اداریہ ہے اس کی سرخی'' دہشت کو اسرائیل کا جواب'' (Israeli Answer to Terror) رکھی گئی ہے اور اس میں یہ الزام عائد کیا گیا ہے کہ'' جنوبی لبنان میں دہشت گردوں کے ٹھکانوں پر اسرائیل کے ہوائی حملے اگرچہ محدود مگر درست اقدام تھے.......... لبنان پر گزشتہ روز کے حملے اور سرحد کے دونوں جانب ایک ہفتے سے جاری بے مقصد لڑائی میں ہونے والی اموات کی ذمہ داری حزب اللہ کے دہشت گردوں، بیروت اور دمشق کی حکومتوں پر عائد ہوتی ہے۔ مسٹر پیریز نے اس معاملے میں صرف اسرائیل کے دفاع کا حق استعمال کیا ہے'' یہ بیانات اس وقت جاری ہوئے جب اسرائیلی فوج جنوبی لبنان پر فضا، زمین اور سمندر سے بمباری کرنے کے بعد اس علاقے میں رہائش پذیر دو لاکھ افراد کو بے گھر کرنے کے عمل سے گزر رہی تھی، اس صورتِ حال میں یہ بات یاد دلانا ضروری ہو جاتا ہے کہ...... جنگ کے قوانین کے مطابق جس علاقے پر غیر ملکی فوج کا قبضہ ہو وہاں کے

باشندوں کو مزاحمت کا حق حاصل ہوتا ہے، مگر یہاں پہلے تو اس لیے پانسہ پلٹ دیا گیا کہ معاملہ اسرائیل کا تھا، پھر اس لیے کہ یہ ''اسلام'' ہی ہے جو ''خطرہ'' بنا ہوا ہے، 18 /اپریل وہ دن ہے جب اسرائیل نے قانا میں اقوام متحدہ کی چوکی پر گولہ باری کر کے ایک سو سے زائد لوگوں کو ہلاک کر دیا تھا، یہ چوکی لبنانی شہریوں کو جنگ سے بچانے کے لیے قائم کی گئی تھی، اور اقوام متحدہ سے تعلق ہونے کی بنا پر اسے زیادہ نمایاں کر کے رکھا گیا تھا، اس واقعہ کی رپورٹنگ کرتے ہوئے دی ٹائمز نے لکھا کہ امریکا اور شمعون پیریز دونوں نے جانی ضیاع پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اس کی ذمہ داری اس لیے حزب اللہ پر عائد کی کہ اس نے ''کسی اشتعال کے بغیر 1993ء کا معاہدہ توڑ دیا تھا'' یہ دونوں بیان 21 /اپریل کو شائع ہوئے، مزید برآں اسرائیل کی لبنان کے خلاف کارروائی کے دوران ادارتی یا اس کے سامنے والے صفحہ پر اسرائیل یا امریکی حکومت کے نکتہ نظر سے ہٹ کر کوئی بات شائع نہیں ہوئی، اس معلوم صورت حال میں ایک اور کھٹکنے والی بات یہ ہے کہ مجبور لبنانیوں یا حزب اللہ کی بہ نسبت اس وقت بھی شام اور ایران کو اس طرح زیادہ اہمیت دی جا رہی تھی، جیسے جنوبی لبنان میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ قبضے اور اس پر ردعمل سے بڑھ کے کچھ بھی نہیں ہے، یہ اس بات کا کھلا اشارہ تھا کہ اس کے پس پردہ اسلام بمقابلہ مغرب کا تصور کارفرما ہے۔

اس طرز عمل سے رپورٹنگ اور کوریج میں جو بگاڑ پیدا ہوا، اسے رابرٹ فسک نے کھول کے بیان کیا، اس نے اپنی توجہ اس بات پر مرکوز رکھی کہ اصل واقعات کیا ہیں، اس لے ساتھ ساتھ اس نے خود کو اسرائیلی یا امریکی حکام کے اس دباؤ سے بھی بچائے رکھا جو لکھنے والوں پر اس لیے ڈالا جاتا ہے تا کہ دنیا کو صرف وہی بات بتائی جائے، جو یہ دونوں ملک بتانا چاہتے ہیں، فسک نے اس ضابطے کی نفی نہیں کی کہ غیر ملکی قبضے کے خلاف چھاپہ مار جنگ لڑنا جائز ہے اور نہ اس نے اس سے اتفاق کیا کہ جنوبی لبنان کی لڑائی کو مغرب اور دہشت گرد مسلمانوں کے درمیان لڑائی تصور کرنا چاہیے، چنانچہ قانا کے سانحے کو بیان کرتے ہوئے وہ بڑے مؤثر انداز میں یہ بتانے میں کامیاب رہا کہ 1993ء کی جنگ بندی کے بعد سے اسرائیل نے سوچ سمجھ کر ایک پالیسی بنا رکھی ہے جس کے تحت بیس ایسے واقعات ہو چکے ہیں جن میں حزب اللہ کو باہر آنے پر مجبور کیا گیا تھا، اور اس کے بعد لبنان اور شام پر دباؤ ڈالنے کے لیے پوری قوت کے ساتھ حزب اللہ پر ''جوابی'' حملہ کیا گیا تھا، یہ باتیں فسک نے شمیمان کے منہ پر کہیں اور ان سے فسک کی آزادروی کے مقابلے میں شمیمان کی طرف سے دی ٹائمز کی ادارتی لائن کو آگے بڑھانے میں وفاداری یا شاید دانشمندی ڈرامائی انداز میں زیادہ نمایاں ہو گئی، ریڈیو پروگرام میں انٹرویو کرنے والے نے شمیمان سے یہ کہہ کر رہی سہی کسر بھی پوری کر دی کہ آپ نے لکھا ہے کہ

''اسرائیل نے لبنان میں بڑی گنی چنی اور نپی تلی طاقت استعمال کی ہے'' آپ کسی تنقیدی تبصرے کے بغیر یہ لکھ دیتے ہیں کہ ''اسرائیلی افسروں کا یہ اصرار تھا کہ اسرائیلی توپچیوں کو قانا کیمپ میں پناہ گزینوں کی موجودگی کا علم نہیں تھا'' آپ جان بوجھ کر یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اسرائیل شہریوں کو نشانہ نہیں بنا رہا تھا جبکہ رابرٹ فسک نے صورت حال کو جس طرح بیان کیا ہے وہ قطعی مختلف تصویر پیش کرتا ہے''۔

انٹرویو کے اس مرحلے پر فسک نے اس موقف کی تردید کے لیے کہ اسرائیل نے جان بوجھ کے گولہ باری نہیں کی تین شہادتیں پیش کیں، ان شہادتوں کی بنیاد پر ہی اس نے 19 اور 22 /اپریل کو انڈی پینڈنٹ میں قانا کے قتل عام کی تفصیلات درج کی تھیں، اس سے پہلے اس نے 15 /اپریل کو جنوبی لبنان سے ایک بڑی خبر دی تھی جس میں اس نے اسرائیل کے عزائم کو اس طرح بے نقاب کیا تھا کہ ''یہ صرف فوجی کارروائی نہیں ہے بلکہ ایک ملک کو چُور چُور کرنا اس کا بنیادی مقصد ہے'' فسک نے جو شہادتیں پیش کیں ان میں ایک یہ تھی کہ قانا پر حملے سے انیس گھنٹے پہلے اقوام متحدہ کے حکام نے اسرائیلی فوجی کمان کو آگاہ کر دیا تھا کہ اقوام متحدہ کی اس چوکی میں شہریوں کو پناہ دی گئی ہے، دوسری یہ تھی کہ جس وقت گولہ باری ہو رہی تھی قانا کے اوپر بغیر پائلٹ کے ایک اسرائیلی طیارہ توپچیوں کی رہنمائی کر رہا تھا، تیسری شہادت اس نے یہ پیش کی کہ اس لاف زنی کے باوجود کہ اسرائیل ٹھیک ٹھیک نشانے لگانے اور بروقت اپنا ہاتھ روک لینے کی صلاحیت رکھتا ہے، آخر ایسا کیوں ہوا کہ جنوبی لبنان میں ناقورہ سے اقوام متحدہ کے حکام جب ''گولہ باری روک دینے کی التجا کر رہے تھے'' تو ان کی اپیل کو نظر انداز کر کے دیر تک گولہ باری کو جاری رکھا گیا اس کے جواب میں شمیمان کا کہنا یہ تھا کہ ''یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اسرائیل آخر شہریوں کو جان بوجھ کے کیوں نشانہ بنائے گا'' یہ اس کی ایسی رائے تھی جس پر وہ پورا پورا ایمان رکھتا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس سے امریکی میڈیا کا یہ عام تصور بھی منکشف ہوتا ہے کہ جہاں تک مسلم دہشت گردوں کا تعلق ہے وہ تو معصوم لوگوں کے خلاف جان بوجھ کر حملہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں مگر اسرائیل، جو ہماری (امریکا) ہی طرح ہے کسی صورت ایسی حرکت نہیں کر سکتا، اسرائیل اسی امریکی عوامی سوچ کی انگلی پکڑ کر اپنا کام دکھا رہا ہے، فسک اس معاملے میں شمیمان سے اتفاق کرتا ہے کہ جنوبی لبنان کے بجائے اسرائیل سے رپورٹنگ کرتے ہوئے وہ ان واقعات کی ہی رپورٹ کر رہا ہے جو وہاں پیش آ رہے ہیں، اور اس معاملے میں شعوری طور پر وہ اپنی رائے کو اپنی رپورٹنگ میں شامل نہیں کر رہا، یقیناً یہ بات بڑی حد تک درست ہے کہ ''رپورٹر اور کالم نویس دونوں جو کچھ لکھتے ہیں وہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے'' لیکن یہ سوال اپنی جگہ ہے کہ رپورٹر کا دائرہ کار کیا ہے اور وہ کس نوعیت کے واقعات کا سلسلہ کس طرح کے بیانات

کے ساتھ جوڑ رہا ہے، فسک جب لبنان کے واقعات کو لے کر چلتا ہے تو اس کا سلسلہ وزیر خارجہ ایہود براک (Ehud Barak) کے اس بیان سے جوڑتا ہے جو اس نے 3 جنوری 1996ء کو دیا تھا، براک اپنے اس بیان میں خبردار کرتا ہے کہ اگر حزب اللہ پر مزید حملے ہوئے تو ''اسرائیلی فوج کے ان حملوں کو لبنان پر حملہ سمجھا جائے گا اور اس سے جس قدر لوگ لبنان کی سرحد کے اندر ہلاک ہوں گے انھیں لبنانی تصور کیا جائے گا۔''

مختصر یہ کہ جب حزب اللہ کے متعلق یہ مفروضہ قائم کرلیا گیا ہے کہ یہ بنیادی طور پر دہشت گرد ہیں اور اس شیعہ عسکریت پسند گروہ کی پشت پناہی ایران کر رہا ہے تو بات یہیں تک محدود نہیں رہتی بلکہ اسلام کے خلاف وہ تمام نظریات جن میں جدیدیت کے خلاف اشتعال، بلاجواز تشدد پسندی کا رجحان اور اسی طرح کے دوسرے الزام شامل ہیں ان سب کو اس مفروضے میں سمیٹ لیا جاتا ہے تو اس کی شکل کچھ سے کچھ بن جاتی ہے اور الزامات کا یہ طومار بذات خود اس بات کی تصدیق کر دیتا ہے کہ اسرائیل نے لبنان پر حملے کے دوران بڑی احتیاط کے ساتھ یہ جواز گھڑ لیا تھا کہ لبنانی چھاپہ ماروں کے ساتھ وہی سلوک کیا جارہا ہے جس کے وہ حقدار ہیں اس لیے قانا پر گولہ باری نہیں روکی گئی، اس بات کو جوڈتھ ملر نے سی این این پر اور دی نیویارک ٹائمز نے اپنے اداریے میں اچھالا تھا کہ حزب اللہ ایک دہشت گرد تنظیم ہے، ملر نے تو ایک دفعہ یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ان چھاپہ ماروں کا تعلق جنوبی لبنان سے نہیں بلکہ بیقا سے ہے ''میں اس بات کو اس لیے جانتی ہوں کہ میں وہاں سے ہوکر آئی ہوں، اور یہ چھاپہ مار انتہائی بے رحمی کے ساتھ عورتوں اور بچوں کو اس لیے گولیوں کی بوچھاڑ کے سامنے کر دیتے ہیں تاکہ وہ یہ ثابت کر سکیں کہ اسرائیلی قاتل ہیں'' یہ خاتون رپورٹر، سنگدلی اور تعصب کا اس سے زیادہ بہتر مظاہرہ نہیں کر سکتی، اس کے برعکس الیگزینڈر کاک برن (Alexander Cockburn) کا 20 رمئی 1996ء کو دی نیشن (The Nation) میں ایک کالم شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے ''اسرائیل کا برق رفتار حملہ'' (Israel's Blitzkrieg) جس میں اس نے لبنان کے بحران کے دوران میڈیا کی کوریج کا مزید تجزیہ کیا ہے۔

کسی حقیقی یا تاریخی حوالے کے بغیر اسلام کو تشدد اور فہم و فراست سے عاری مذہب قرار دینا اور یہ الزام عائد کرنا کہ یہ مذہب لوگوں کو اسرائیل کے خلاف جارحیت پر اکساتا ہے دراصل ان واقعات کو چھپانے کی ایک کوشش ہے جو وقوع پذیر ہو رہے ہیں، چنانچہ رپورٹنگ کو اس انداز میں بگاڑ پیدا کر دینے سے یہ حوالے بھی نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں کہ اسلام آسانی سے سمجھ میں آنے والا اور انسانیت کے بہت قریب ہے، اسی طرح چھاپہ ماروں کو ''ایران کے حمایت یافتہ شیعہ عسکریت پسند'' قرار دینے کا بھی مقصد یہ ہے کہ انھیں انسانیت کی سطح سے گرا ہوا اور ان کی سرگرمیوں کو غیر قانونی ظاہر کیا جا سکے، شمیمان اپنے 28 راپریل کے کالم

میں اسرائیلی حملے کے آخری مرحلے کے بارے میں کوئی معقول جواز پیش کرنے میں ناکام رہا ہے اور اپنی ناکامی کو وہ اس واقعہ پر یہ سرخی جما کر ظاہر کرتا ہے کہ ''مشرق وسطیٰ میں چکرا دینے والے کھیل کا خاتمہ'' اور یہ بات قبول کرتا ہے کہ ''یہ مشرق وسطیٰ ہے...... یہ جملہ اس پرانے محاورے کو ظاہر کرتا ہے جو کسی ایسی صورت حال کے لیے بولا جاتا تھا جس کی وضاحت کرنا ممکن نہ ہوتی تھی، اور جو عام منطق کو رد کر دیتی تھی، اگر اس ہئیت کی دانش کو ثابت کرنے کی کوئی ضرورت بنتی تھی تو پچھلے ہفتے کے واقعات نے اس دانش کو نچوڑ کر رکھ دیا ہے''۔

اسلام کی تصویر کو جس طرح بگاڑ دیا گیا ہے اور اس کے متعلق جتنی غلط فہمیاں پھیلا دی گئی ہیں اس نے نہ تو اس مذہب کو سمجھنے اور نہ سننے اور دیکھنے کی ہی خواہش رہنے دی ہے کہ اس میں سننے اور دیکھنے لائق کیا باتیں ہیں، قطع نظر اس کے کہ اسلام کے متعلق جو الٹا سیدھا کہا گیا اسے کہنے والے لوگ اناڑی تھے یا علمیت سے عاری تھے، مغرب میں جو لوگ خبروں سے دلچسپی رکھتے ہیں میڈیا انھیں سمجھانے کے لیے اسے تصویروں کے ساتھ جوڑ کر یوں پیش کرتا ہے کہ جس سے دشمنی اور لاعلمی پھیلتی چلی گئی ہے اس کا بڑا خوبصورت تجزیہ نوم چومسکائی (Noam Chomsky) نے اپنی کتابوں کے ایک طویل سلسلے میں کیا ہے، جن میں ایڈورڈ ایس ہرمن (Edward S.Herman)، کے ساتھ مل کر انھوں نے ''رضامندی وضع کرنا'' (Manufacturing consent) لکھی۔ اس کے علاوہ ان کی کتابوں میں ''دہشت گردی کا کلچر'' (The Culture of Terrorism) اور ''جمہوریت کو خائف کرنا'' (Deterring Democracy) خاص طور پر قابل ذکر ہیں، بہرکیف ہم اس صورت حال کی چاہے کوئی بھی توجیہ پیش کریں بات وہیں جا پہنچے گی کہ 1980ء میں کورنگ اسلام جب پہلی بار شائع ہوئی تھی تو اس کے بعد سے حالات بہتر ہونے کی بجائے زیادہ خراب ہی ہوئے ہیں، مکالمہ اور تبادلہ خیال کے سلسلے میں یہ حقیقت بڑی قیمتی ہے کہ...... مکالمہ اور تبادلۂ خیال، دونوں کا دانشمندانہ مباحثوں، فنی تخلیق، ایک عام کاروباری انسان کے لین دین، میل ملاپ، ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرنے اور باتیں بنانے میں بھی عمل دخل ہوتا ہے، اور اسے ایسی عوامی ملکیت بنا دیا گیا ہے جس پر ذرائع ابلاغ چھایا ہوا ہے، سنسنی خیزی، غیر ملکیوں سے بھونڈے انداز میں نفرت اور شعور سے عاری جنگ آج کا چلن ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ''ہم'' اور ''وہ'' کی خیالی سرحدوں کے دونوں جانب ایسے اثرات مرتب ہو رہے ہیں جن کی اصلاح کی کوئی گنجائش ممکن ہی نہیں ہے، میں نے یہ بات صرف اس مقصد کے تحت لکھی ہے کہ میں نہ صرف ان باتوں کی نشاندہی کروں جو غلط ہیں بلکہ لوگوں کو اس غور و فکر کی طرف لاؤں کہ انھیں آگاہی اور تحقیق و تلاش کے ذریعے منفی اثرات کے اتنے بڑے ذخیرے کو کم کرنے کے لیے کیا کرنا ہے۔

اس نئے ایڈیشن پر نظر ثانی کرنے اور اسے حالات کے مطابق بنانے میں میرے دوست نوبار ہوسی پیان (Noubar Hovsepian) نے میری بڑی مدد کی، ماریو اورٹز روبلز (Mario Ortiz Robles) اور اینڈریو روبن (Andrew Rubin) نے کتابوں کے حوالے مرتب کرنے میں میرے ساتھ تعاون کیا ہے، زینب استرآبادی (Zaineb Istrabadi) کی معاونت بھی بڑی اہم تھی اور شیلے وینگر (Shelley Wanger) نے مجھے اپنی اعلیٰ ادارتی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔

ای ڈبلیو ایس
31/اکتوبر 1996ء نیویارک

تعارف

یہ اس سلسلے کی تیسری اور آخری کتاب ہے جس کا مقصد آج کے جدید دور میں ایک طرف عالم اسلام، عربوں اور مشرق کو اور دوسری طرف مغرب یعنی فرانس، برطانیہ اور بالخصوص امریکا کو رکھ کر ان دونوں کے تعلقات کا جائزہ لینا تھا، اس سلسلے کی میری پہلی کتاب اورینٹل ازم (شرق شناسی) عام نوعیت کی ہے، اس میں تعلقات کے مختلف ادوار کا احاطہ کیا گیا ہے، یہ ادوار مصر پر نپولین کے حملے سے شروع ہوتے ہیں، پھر اس میں نو آبادیات کے اہم مراحل کا ذکر آتا ہے اور بات یورپ میں شرق شناسی کی اس جدید عملی تحقیق تک جا پہنچتی ہے، جس کا آغاز انیسویں صدی میں ہوا تھا، یہاں سے آگے اس کتاب میں دوسری جنگ عظیم کے بعد کے مشرق کی بات آتی ہے، برطانوی اور فرانس کے اقتدار کا خاتمہ اور اس دم توڑتے اقتدار میں سے امریکا کے ابھرنے کی داستان آجاتی ہے، اورینٹل ازم (شرق شناسی) میں دراصل میں نے علم اور طاقت کے ادغام کی کہانی بیان کی ہے، اس سلسلے کی اپنی دوسری کتاب ''فلسطین کا مسئلہ'' (The Question of Palestine) میں، میں نے اسرائیل کا روپ دھار لینے والی صیہونی تحریک کے ساتھ ان مقامی عربوں کے ٹکراؤ کو بیان کیا ہے، جن میں اکثریت فلسطین کے مسلمان باشندوں کی ہے، اس کتاب میں، میں نے اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھایا ہے کہ اس کشمکش میں فلسطین کے ''مشرقی" حقائق سے نمٹنے کے لیے صیہونی تحریک نے جو طریقہ کار اختیار کیا اس کا ماخذ مغرب ہی تھا، فلسطین کے اس مطالعے میں، میں نے اورینٹل ازم (شرق شناسی) کی بہ نسبت زیادہ باریک بینی سے کام لیا تھا اور مشرق کے متعلق مغرب کے خیالات کی سطح کے نیچے چھپے ہوئے عزائم کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے پھر اس پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ فلسطین کی حق خود ارادیت کی قومی جدوجہد کے متعلق مغرب کا اصل نکتہ نظر کیا ہے۔

موجودہ کتاب جس کا نام ''کورنگ اسلام'' (Covering Islam) ہے، اس میں، میں نے ہم عصر دنیا کو موضوع بحث بنایا ہے اور اسلامی دنیا سے متعلق مغرب خاص طور پر امریکا کے اس طرز عمل کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے جو ستر کے عشرے میں سامنے آنے لگا تھا، اگرچہ یہ موقع سے بڑی مناسبت رکھتا ہے لیکن اس

کو نہ صرف نفرتوں نے گھیر رکھا ہے بلکہ یہ مسائل سے بھی پر ہے، مغرب کے اس طرزِ عمل یا ردِ عمل کی یوں تو کئی وجوہ ہیں لیکن حقیقت میں یہ اس وقت ظاہر ہوا جب توانائی کی سپلائی میں زبردست کمی واقع ہوئی اور تمام تر توجہ عربوں، خلیج فارس کے تیل کے ذخائر، اوپیک اور اُن اضافی بلوں پر مرکوز ہوگئی، جن بلوں نے افراطِ زر اور تیل کے حوالے سے مغربی معاشرے کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا، اس کے ساتھ ہی ایران کا انقلاب رونما ہوا پھر یرغمالیوں کا بحران سامنے آیا اور ان دونوں کی دہشت نے مغرب کو یہ سوچنے اور سمجھنے پر مائل کیا کہ ''اسلام پھر ابھرنے لگا ہے'' ان واقعات کے بعد اسلامی دنیا میں پرتشدد قوم پرستی نے سر اٹھایا اور بدقسمتی سے بڑی طاقتوں کے درمیان محاذ آرائی بھی اس قوم پرستی کے ساتھ جڑ گئی، پرتشدد قوم پرستی کی مثال ایران عراق جنگ کی شکل میں ہمارے سامنے ہے جبکہ بڑی طاقتوں کی محاذ آرائی کی مثال ہمیں افغانستان میں سوویت یونین کی مداخلت اور امریکا کی طرف سے ایسے فوجی دستوں کی تیاری سے ملتی ہے جنھیں تیزی سے خلیج کے علاقے میں پہنچانا ممکن ہو۔

یہ کتاب ''کورنگ اسلام'' کتنی ذو معنی ہے یہ بات اس کا مطالعہ کرنے والوں پر بخوبی کھل جائے گی، لیکن ابتدا میں اس کی کچھ وضاحت کر دینا مناسب ہے، اس وضاحت کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جس طرح ''اسلام'' کی اصطلاح کو آج استعمال کیا جا رہا ہے، اس سے تو بظاہر بڑے سادہ معنی نکلتے ہیں، لیکن یہ محل استعمال اتنے سادہ معنی کے لیے نہیں ہے بلکہ اس طرح مغرب نے اس مذہب کو جسے اسلام کہتے ہیں کچھ تو افسانوی رنگ دینے اور کچھ اس پر نظریاتی لیبل چسپاں کرنے کی کوشش کی ہے، چنانچہ مغرب میں ''اسلام'' کو جن معنوں میں لیا جاتا ہے، اس کا زندگی کے ان مختلف طور طریقوں سے کوئی تعلق نہیں ہے، جو اس اسلامی دنیا کے اندر نظر آتے ہیں جو، اسی کروڑ سے زیادہ لوگوں پر مشتمل ہے اور جو ایشیا اور افریقہ کی حد تک لاکھوں مربع میل میں پھیلی ہوئی ہے، اس اسلامی دنیا میں درجنوں معاشرے اور ریاستیں ہیں، ان کی اپنی اپنی تاریخ ہے، جغرافیہ ہے اور ثقافتیں ہیں اور یہ ایک دوسرے کے ساتھ مناسبت بھی نہیں رکھتی ہیں، دوسری طرف آج کے مغرب میں ''اسلام'' خاص طور پر صدمہ پہنچانے والی ایک خبر کی حیثیت رکھتا ہے، اس کتاب میں اس پر بھی بحث کی جائے گی کہ اسلام کے متعلق مغرب کے اس تاثر کی وجہ کیا ہے؟ پچھلے کچھ برسوں کے دوران خاص طور پر، جب ایران کے واقعات نے یورپ اور امریکا کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کیا تھا، اس وقت سے، امریکی میڈیا نے اپنی نشریات میں اسلام کو بھی شامل کر لیا ہے، وہ اپنے انداز میں اس کی تصویر کشی کرتا ہے، اس کے وصف بیان کیے جاتے ہیں، اس کا تجزیہ کیا جاتا ہے، اس کے مطالعے کے لیے نصاب پیش ہوتے ہیں اور اس

طرح امریکی میڈیا نے اسلام کو ''معروف'' کر دیا ہے۔

تاہم میڈیا پر اسلام کی اس طرح کی کوریج اور اس کے ساتھ ساتھ، علمی ماہرین کی طرف سے اسلام کی وضاحتیں، جغرافیائی سیاست کی وہ حکمتِ عملی جو ''بحران کے ہلال'' کی بات کرتی ہے، وہ ثقافتی مفکر جو ''مغرب کے زوال'' کا نوحہ لکھتے ہیں، یہ سب مل کر اسلام کے متعلق صرف گمراہی پھیلاتے ہیں، اس طرح اگرچہ خبریں سننے والوں کو تو یہی احساس ہوتا ہے کہ انھیں اسلام سمجھ آ گیا ہے لیکن انھیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ بڑی محنت سے تیار کیا ہوا جو پروگرام انھیں دکھایا جا رہا ہے اس کے زیادہ تر حصے کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ اس کے لیے ٹھوس مواد تک ہی رسائی حاصل کی گئی ہے۔ ایسی کئی مثالیں موجود ہیں جو اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ ''اسلام'' کے متعلق سچائی بیان کرنے کی بجائے اس کے متعلق جگہ جگہ ایسی گروہی، ثقافتی اور نسلی منافرت کو ہوا دی گئی، جو نہ صرف بڑی گہری ہے بلکہ بڑا جارحانہ انداز لیے ہوئے پوری طرح آزاد ہے، ستم ظریفی یہ ہے کہ ان سب باتوں کو اسلام کی منصفانہ، متوازن اور ذمہ دارانہ کوریج کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جو اس بات سے قطع نظر کہ اس طرح کا جذباتی سلوک نہ تو اس عیسائیت اور نہ یہودیت سے ہی روا رکھا جاتا ہے جو احیایا ''واپسی'' کے دور سے نمایاں انداز میں گزر رہے ہیں، اس میں شک کی قطعی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اس وقت اسلام کے متعلق یہ مفروضہ کارفرما ہے کہ اسلام کو بیان کرنے اور سمجھانے کے لیے بڑی لاپروائی کے ساتھ جو مقولے تیار کر لیے گئے ہیں انھیں بار بار استعمال کر کے لامحدود زمانے تک اسلام کی کردار نگاری کی جا سکتی ہے، ان مقولوں کو سامنے لاتے ہوئے ہمیشہ یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ جس اسلام کی بات کی جا رہی ہے، وہ ایک حقیقی اور پائیدار چیز ہے، جو وہاں پائی جاتی ہے، جہاں مغرب کو تیل فراہم کرنے والے ذخائر موجود ہیں۔

اس طرح کی کوریج میں ایسے بے شمار شگاف ہوتے ہیں جنھیں چھپانے کی ضرورت پیش آتی ہے، اس بات کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ جب دی نیویارک ٹائمز نے عراق کے تابڑ توڑ حملوں کے خلاف ایران کی حیرت انگیز اور مضبوط مزاحمت کی وضاحت کرنا چاہی تو اس نے ''شیعوں کے شوقِ شہادت'' کے فارمولے کو استعمال کیا، اگر شوقِ شہادت کے اس جملے کا سرسری انداز میں جائزہ لیں تو یہ کسی حد تک معقول معلوم ہوگا لیکن میرے نزدیک اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ مغربی ماہرین نے اس جملے کے ذریعے ان تمام باتوں کو چھپانے کی کوشش کی ہے، جن کا انھیں کوئی ادراک نہیں تھا، دراصل اس سارے قصے میں اس بات کو پیشِ نظر نہیں رکھا گیا کہ علاقائی زبان کو نہ سمجھنا لاعلمی کا ایک بڑا ذریعہ بن جاتا ہے، اس طرح کی کوریج میں ہوتا یوں ہے کہ رپورٹر کو بغیر کسی تیاری کے ایک اجنبی ملک میں بھیج دیا جاتا ہے، اسے اس طرح کی صورتِ حال سے نمٹنے

کا کوئی تجربہ نہیں ہوتا اور اس کی صرف خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ چوکس ہوتا ہے اور حالات کو جلد سمجھ لینے کی صلاحیت رکھتا ہے یا پھر وہ اس علاقے کے قریب ہوتا ہے، جہاں اخبار کے صفحہ اول پر اہم مقام پانے والی خبریں وجود میں آ رہی ہوتی ہیں، اس صورت حال میں رپورٹر اس ملک کے متعلق کچھ جاننے کی بجائے اس چیز کو استعمال میں لاتا ہے جو دستیاب ہوتی ہے، جن مقولوں کا میں نے ذکر کیا ہے اس صورت حال میں ان کا استعمال اسے سہل معلوم ہوتا ہے، ان کے ساتھ جب وہ کچھ نہ کچھ صحافیانہ دانشمندی کا استعمال بھی کرتا ہے تو اسے یقین ہوتا ہے کہ وہ جو مضمون یا خبر پیش کر رہا ہے، اسے اس کے وطن کے قارئین میں سے کوئی چیلنج نہیں کرے گا، اس بات کو یوں سمجھیے کہ جس وقت ایران میں یرغمالیوں کا مسئلہ کھڑا ہوا تو ابتدائی دنوں میں تین سو کے لگ بھگ مغربی رپورٹر تہران میں موجود تھے اور ان میں سے کوئی ایک بھی فارسی نہیں جانتا تھا، اس لیے یہ کوئی حیران کن بات نہیں ہے کہ ایران سے امریکی میڈیا کو جو خبریں موصول ہو رہی تھیں ان میں کوئی نیا پن نہیں تھا اور ایران میں ہونے والے واقعات کے متعلق بار بار ایک ہی جیسی باتیں دہرائی جا رہی تھیں، اس وقت ایران میں یرغمالیوں سے ہٹ کر بھی واقعات ہو رہے تھے جو سیاسی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتے تھے لیکن ان کی طرف اس لیے توجہ نہیں دی گئی کہ انھیں اسلامی ذہنیت یا امریکا دشمنی کا رنگ نہیں دیا جا سکتا تھا۔

اسلام کی ''کوریج'' اور اسلام پر ''پردہ ڈالنے'' کی ان سرگرمیوں کے درمیان اس ناخوشگوار صورت حال کا ذکر قریب قریب غائب ہو گیا ہے، جس کی یہ علامتیں ہیں، اس سلسلے میں عام قسم کی مشکل ایک ایسی دنیا کو جاننا پھر اس میں رہنا ہے جو عام فہم و فراست کے لیے پیچیدہ اور متنوع ہو چکی ہے، جبکہ مغرب میں اسلام کی نہ صرف بڑی پرانی تاریخ موجود ہے، بلکہ اسے اچھی طرح بیان بھی کر دیا گیا ہے، اس بات نے اسے دوسروں سے ممتاز کرنے کے ساتھ ساتھ ایک عجیب رنگ بھی دے دیا ہے؛ دراصل میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ نو آبادیاتی دور کے خاتمے کے بعد کی دنیا میں اسلام نہ تو یورپ کا حصہ رہا ہے، اور نہ جاپان کی طرح اس کا شمار ان اقوام میں ہوتا ہے، جو ترقی یافتہ صنعتی گروپ کی شکل اختیار کر چکے ہیں، چنانچہ اسے ایک مخصوص ''ترقیاتی تناظر'' میں دیکھا جاتا ہے جو اس پیچیدہ اور متنوع دنیا میں اسے سب سے الگ کر دیتے ہیں، اور اس کی پسماندگی کو لے کر مغربی دانشور یہ نسخہ تجویز کرتے ہیں کہ اسلامی معاشروں کو کم از کم تین عشروں تک ''جدیدیت'' کی ترتیب کے مراحل سے گزرنا ہوگا، تب جا کر اس کا تہذیب یافتہ دور میں داخلہ ممکن ہوگا، جدیدیت کے اسی نظریے کی روشنی میں اسلام کو پرکھنے کا انداز یہ بن گیا تھا کہ اس کے عروج کی علامت کے طور پر شاہ ایران کی شخصیت کو پیش کیا جاتا تھا، چنانچہ جب شاہ ایران کا زور تھا تو اس وقت بھی اور جب اس کی حکومت کا خاتمہ ہوا تو اس وقت بھی اسے

مغرب نے ''جدید'' حکمران قرار دیا اور اس کے زوال کا ذمہ دار، مذہب پرستی اور دقیانوسی تعصب کو ٹھہرایا تھا۔

دوسری طرف ''اسلام'' کو ہمیشہ مغرب کے لیے ایک خاص قسم کا خطرہ بنا کر پیش کیا جاتا رہا ہے، اس کی وجوہ میں اپنی کتاب اورینٹل ازم میں پیش کر چکا ہوں، اور اس کتاب میں دوبارہ ان کا تجزیہ کروں گا، حیرت کی بات یہ ہے کہ جس دعوے کے ساتھ یہ بات کہہ دی جاتی ہے کہ اسلام مغربی تہذیب کے لیے خطرہ ہے اتنا کھل کر کسی دوسرے مذہب یا کسی دوسرے ثقافتی گروہ کے متعلق ایسی کوئی بات نہیں کہی جاتی اور پھر اس بات پر غور بھی نہیں کیا جاتا کہ اس وقت مسلم دنیا میں جو اضطراب بپا ہے اور ہلچل مچی ہوئی ہے، اس کا اسلام سے اتنا تعلق نہیں ہے، جتنا کہ سماجی، اقتصادی اور تاریخی معاملات سے ہے اور یہ کوئی اتفاق بھی نہیں ہے کہ اس اضطراب اور ہلچل نے سادہ لوح مستشرقین کی کم مائیگی کو کھول کر رکھ دیا ہے، سب کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ جب یہ مستشرقین اس نکتے کو اٹھاتے ہیں کہ مسلمان ''تقدیر'' پر ایمان رکھتے ہیں تو ان کے پاس پرانی مثالوں کو دہرانے کے سوا کچھ نہیں ہوتا، چنانچہ وہ بات کو گھما پھرا کر ان ایام کی طرف لے جاتے ہیں، جب برصغیر ہندوستان سے لے کر شمالی افریقہ کے ساحلی علاقے تک یورپی فوجوں کی حکمرانی تھی، اسی نسبت سے حالیہ دور میں وہ کتابیں، رسالے اور عوامی شخصیات بڑی مقبول ہوتی ہیں جو نہ صرف خلیج کے علاقے پر پھر سے قبضہ کر لینے پر زور دیتی ہیں بلکہ اسلامی بربریت کو بھی اچھالتی رہتی ہیں، ان کی مقبولیت کے پس پردہ بھی اسلام سے خطرے کا چھپا ہوا احساس ہی ہے، یہاں یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ زمانے نے نیوزی لینڈ کے اس جے بی کیلی (J.B.Kelly) کو امریکا میں مشہور ''ماہرین'' کی صف میں ابھرتے ہوئے دیکھا ہے جو کبھی وسکانسن (Wisconsin) میں شاہی تاریخ کا پروفیسر ہوا کرتا تھا، پھر ایک زمانے تک ابوظبی کے شیخ زید کا مشیر بھی رہا اور اب نہ صرف مسلمانوں پر، بلکہ اسلام کے متعلق نرم رویہ رکھنے والے مغربی باشندوں پر بھی کڑی تنقید کرنے والوں میں شامل ہو چکا ہے، وہ ان نرم خو مغربی باشندوں کے متعلق کہتا ہے کہ انھوں نے خود کو تیل کے لیے عربوں کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے، کیلی کی کتاب پر کبھی کبھار ہونے والے جو تبصرے سامنے آتے ہیں ان میں سے کسی میں اس کتاب کے اس آخری پیراگراف کے متعلق کچھ نہیں لکھا گیا، جس میں اس نے شاہی فتوحات کی آرزو کی ہے اور نسل پرستی کے اپنے رویئے کو چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی، وہ لکھتا ہے کہ:

> سویز کے مشرق میں پھیلے ہوئے اس علاقے کو جو جنگی اعتبار سے اہم اور مغربی یورپ کی وراثت ہے، پھر سے حاصل کرنے اور محفوظ کر لینے کے لیے مغربی یورپ کے پاس کتنا وقت ہے، اس کی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی، جب تک انیسویں صدی کے

چوتھے یا پانچویں عشرے سے لے کے اس صدی کے وسط تک اس علاقے پر برطانوی قبضہ برقرار رہا، اُس وقت تک مشرقی سمندروں اور مغربی بحر ہند کے ساحلوں پر امن وسکون کا راج رہا، اگر چہ ان علاقوں پر وہ سکون آج بھی کسی حد تک قائم ہے جو انھیں شاہی نظم و نسق نے دیا تھا مگر یہ آہستہ آہستہ درہم برہم ہو رہا ہے، اگر پچھلے چار یا پانچ سو سال کی تاریخ کسی بات کی نشاندہی کرتی ہے، تو وہ یہی ہے کہ یہ کمزور امن زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا، اس کمزوری کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ ایشیا کا زیادہ تر علاقہ بڑی تیزی کے ساتھ شخصی حکومت کی طرف لوٹ رہا ہے جبکہ افریقہ میں بربریت کا راج ہونے لگا ہے، مختصر یہ کہ وہی حالات پھر سے رونما ہو چکے ہیں جو اس وقت تھے جب واسکوڈے گاما تیزی کے ساتھ راس امید کے پاس سے گزرا تھا، راس امید کے سمندری راستوں پر حکمرانی کی کنجی آج بھی اسی طرح اومان کے پاس ہے جس طرح بحیرہ احمر کے راستے کا کلید بردار عدن ہے۔ مغربی طاقتیں پہلے ہی ان کنجیوں میں سے ایک کو پھینک چکی ہیں، تاہم دوسری تک ان کی رسائی آج بھی ممکن ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس کنجی کو اپنی گرفت میں لینے کے لیے ان کے پاس ویسی جرأت اور دلیری ہے جیسی بہت پہلے پرتگال کے کیپٹن جنرل میں دیکھنے میں آئی تھی۔

اگر چہ کیلی کا یہ تجویز کرنا بڑا عجیب لگتا ہے کہ پندرھویں اور سولھویں صدی کا پرتگالی نوآبادیاتی نظام آج کے زمانے کے مغربی سیاستدانوں کی رہنمائی کے لیے انتہائی موزوں ہے، لیکن اس کا تاریخ کو اسی طرح سادہ کر کے پیش کرنے کا انداز، آج کے مزاج کی بہترین ترجمانی کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نوآبادیاتی نظام امن وسکون لے کر آیا تھا، جس کے معنی یہ نکلتے ہیں کہ اس کے نزدیک کروڑوں لوگوں کو محکوم بنا لینے کے معنی ایک دلکش صورت حال سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہیں اور وہ محکومی کو ان کے لیے بہترین ایام قرار دیتا ہے، جن کے جذبات اور احساسات کو روندا گیا، جن کی تاریخ کو مسخ کیا گیا، جن کے مقدر کو تلخ بنا دیا گیا تھا، اس تمام کرب کو وہ کوئی اہمیت نہیں دیتا اور یہ فلسفہ پیش کرتا ہے کہ جب تک ''ہمیں'' وہ حاصل ہوتا رہے گا جو ''ہمارے'' لیے مفید ہے، یعنی اس خطے کے قیمتی وسائل، جغرافیائی اور سیاسی اعتبار سے اہم علاقے اور سستے مقامی مزدوروں کی بھاری تعداد، جب تک مغرب کو دستیاب رہے گی تب تک یہی سمجھا جائے گا کہ سب اچھا ہے، صدیوں تک نوآبادیاتی نظام کی غلامی سے گزرنے کے بعد افریقہ اور ایشیا کے ممالک کی آزادی کو کیلی نے یہ

کہہ کے مسترد کر دیا ہے کہ ان ممالک کو پھر سے بربریت اور شخصی حکمرانی کے دور میں دھکیل دیا گیا ہے، اس کے نزدیک مغرب کا پرانا شاہی نظام ایک بزدلانہ موت کو گلے لگا چکا ہے، اس لیے صرف ایک ہی راستہ کھلا رہ گیا ہے کہ پھر سے حملہ کیا جائے، کیلی مغرب کو جب یہ راہ دکھاتا ہے کہ وہ دوبارہ اس پر قبضہ کر لے جو جائز طور پر مغرب کا ہے، تو اس کی تہ میں ایشیا کی مقامی اسلامی ثقافت کے لیے اس کی نفرت گہری حقارت کی صورت میں موجود ہوتی ہے اور اس سے کیلی کی یہ خواہش جھلکتی ہے کہ کاش ''ہم'' اس ثقافت پر پھر سے حکمرانی کر سکیں۔

کیلی نے اپنی تحریروں میں وقت کے دھارے کو پیچھے موڑنے کی جو منطق پیش کی ہے، اسے امریکا کے دائیں بازو کے دانشور ولیم ایف بکلے (William F. Buckley) سے لے کر نیوری پبلک جریدے تک نے سراہا ہے۔ اس لیے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں دریا دلی سے کام لیتے ہوئے، اس منطق کو ایک طرف رکھ دینا چاہیے اور اس بات پر توجہ دینا چاہیے کہ اس کے نزدیک دوسری تمام چیزوں پر ان مسائل کو ترجیح حاصل ہے، جن سے سراسیمگی پھیلتی ہے اور جو ہر چیز کو چوپٹ کر کے رکھ دیتے ہیں چنانچہ وہ یہ بتاتا ہے کہ انھیں حل کرنے یا ان پر قابو پانے کے لیے انھیں کس طرح ڈھانپ کر دوسروں کی نگاہوں سے اوجھل کر دینا چاہیے، ان مسائل کا ذکر کرتے ہوئے جب وہ ''اسلام'' تک آتا ہے تو اس کے خلاف پوری قوت کے ساتھ کارروائی کرنے کی سفارش کرتا ہے، اس کی اس سوچ کے دھارے سے جو سب سے دلچسپ بات ابھرتی ہے اس کی مثال کچھ یوں ہے کہ یمن کے اندر کیا ہو رہا ہے، اس کی تو کوئی بات نہیں کرتا، ترکی یا بحیرہ احمر کے اس پار سوڈان، موریطانیہ، مراکش یہاں تک کہ مصر کے اندر ہونے والی سرگرمیوں کا کہیں کوئی ذکر نہیں آتا، اس پریس میں ان سب کے متعلق خاموشی ہوتی ہے جو ایران میں یرغمالیوں کے بحران کی خبریں پیش کر رہا ہے، ان اکیڈمیوں میں بھی اس معاملے پر خاموشی چھائی ہوتی ہے جو تیل کی صنعت اور حکومت کو یہ مشورہ دینے میں مصروف ہیں کہ خلیج کے رجحانات کے متعلق کیسے پیشین گوئی کرنا ہے۔ حکومت بھی خاموش ہے اور ان اطلاعات کی متلاشی اور منتظر ہے جن کے متعلق اسے شاہ ایران اور انور السادات جیسے اس کے دوست بتائیں گے کہ اس نے ان اطلاعات کو کہاں تلاش کرنا ہے۔ چنانچہ اس منظرنامے سے جو تشریح ابھرتی ہے اس کے مطابق ''اسلام'' اُسے کہتے ہیں جس نے مغرب کے لیے تیل کے وسائل کو سنبھال رکھا ہے، اسلام کی اس تشریح سے ہٹ کر دوسری تمام باتیں بے معنی ہو جاتی ہیں اور کوئی چیز توجہ کے لائق نہیں رہتی۔

اس وقت اسلام کے علمی مطالعہ کی جو صورت ہے، اُسے درست کرنے کی کوئی گنجایش موجود نہیں ہے، بعض حالتوں میں تو یہ شعبہ بحیثیت مجموعی عام ثقافت کے ساتھ برائے نام تعلق رکھتا ہے، جبکہ دوسری طرف

اس کی یہ صورت بھی ہے کہ اسے حکومت اور کارپوریشنیں آسانی کے ساتھ قبول کر لیتی ہیں، عام طور پر اس کا یہ نتیجہ بھی ہوا ہے کہ اس نے اسلام کی اس طرح کی کوریج کو روک دیا ہے جس سے اسلامی معاشروں کی سطح کے نیچے موجود باتوں کے متعلق ہمارے علم میں اضافہ ہو سکے، اس کے علاوہ بھی کئی ادبی اور استدلالی مسائل موجود ہیں، جو راستے کی رکاوٹ بنے ہوئے ہیں اور جن کا حل ہونا بہت ضروری ہے، یہ مسائل اس نوعیت کے سوالوں سے متعلق ہیں کہ کیا اسلامی رویہ نامی کسی چیز کا کوئی وجود ہے؟ مختلف اسلامی معاشروں میں عقیدے کی جو سطح ہے اور روزمرہ کی اسلامی زندگی کی جو سطح ہے ان دونوں کا کہاں جا کر اسلام کے ساتھ ملاپ ہوتا ہے؟ ''اسلام'' مراکش اور سعودی عرب، شام اور انڈونیشیا کے درمیان تعلق قائم کرنے والے نظریے کے طور پر کس حد تک مفید ثابت ہو سکتا ہے؟ اگر ہم اس بات کی طرف آئیں کہ حال ہی میں کئی سکالروں نے یہ بات محسوس کی ہے کہ اسلامی نظریہ بیک وقت سرمایہ دارانہ نظام کے ساتھ ساتھ سوشلزم کو، فوجی قوت کے ساتھ ساتھ تقدیر پر بھروسا کرنے کو، اتحاد اور صلح جوئی کے ساتھ ساتھ دوسروں میں خود کو ممتاز کرنے کو، بھی درست قرار دیتا ہے، تو اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اسلام کی جو ادبی وضاحت ہے اور جسے بنیاد بنا کر امریکی میڈیا پر بلاشبہ بگڑے ہوئے خاکے پیش کیے جاتے ہیں اس میں اور ان مخصوص حقائق میں بڑا فرق ہے جو اسلامی دنیا میں پائے جاتے ہیں۔

اس حقیقت حال کے سامنے آ جانے کے باوجود بھی اس بات پر اتفاق رائے پایا جاتا ہے کہ دنیا کے نئے سیاسی، سماجی اور اقتصادی رجحانات کے متعلق مغرب جس بات کو بھی پسند نہیں کرتا، اسے اسلام کے سر تھوپ دیتا ہے، چنانچہ مغرب میں دائیں بازو والوں کے لیے اسلام بربریت کی علامت ہے جبکہ بائیں بازو والوں کے لیے اسلام بدستور قرون وسطیٰ کی مذہبی حکومت بنا ہوا ہے، ان دونوں نظریاتی گروہوں کے درمیان جو گروہ ہے اس کے نزدیک اسلام ایک ایسی بزدلانہ چیز ہے، جس نے دوسروں کے تصورات کو اپنا رکھا ہے، ان تینوں گروہوں کے درمیان اس بات پر اتفاق پایا جاتا ہے کہ اسلامی دنیا کے متعلق اگرچہ انھیں بہت کم معلوم ہے اس کے باوجود وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی دنیا میں پسند کے لائق کچھ بھی نہیں ہے اور اسلام میں قابل قدر بات صرف یہ ہے کہ اصولی طور پر یہ کمیونزم کے خلاف ہے، اس سوچ کی روشنی میں یہاں یہ کہنا بڑا ضروری ہو گیا ہے کہ اسلامی دنیا میں کمیونزم کی مخالفت دراصل امریکا کی وہ ہم نوا حکومتیں ہی کرتی ہیں، جنھوں نے ظلم و جبر کو روا رکھا ہوا ہے، پاکستان کے ضیاالحق اس کی ایک عمدہ مثال ہیں۔

اسلام اور اسلام کی مخالفت ایک بڑا وسیع موضوع ہے اور اس کا تمام پہلوؤں سے احاطہ کرنا میرے

لیے ممکن نہیں تھا، پھر میں نے اس کتاب میں گفتگو کے لیے اسلام کی کوریج کو لیا ہے اور اس کے ذریعے یہ واضح کرنے کی کوشش ضرور کی ہے کہ مغرب کے نزدیک ''اسلام'' کے کیا معنی ہیں، یہ بھی بڑا وسیع موضوع ہے اور اسے چھیڑتے ہوئے میں اس طرف آیا ہوں کہ اسلامی معاشروں کے لیے اسلام کا کیا مطلب ہے اور مغرب ان مطالب تک کیونکر پہنچ سکتا ہے۔ میری اس وضاحت سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ مغرب میں اسلام کی بے حرمتی پر تنقید کا قطعی یہ مطلب نہیں کہ اسلامی معاشروں میں اسلام کا درست تصور موجود ہے، حقیقت یہ ہے کہ زیادہ تر بلکہ بہت زیادہ اسلامی معاشروں میں لوگوں کو دبانے، شخصی آزادی کو کچلنے، غیر نمائندہ اور اکثر و بیشتر اقلیتی طبقے کی حکومت قائم کرنے کا جو رجحان پایا جاتا ہے، اسے یا تو غلط بیانیوں سے درست قرار دیا جاتا ہے یا اسے جائز قرار دینے کے لیے غلط اسلامی حوالے دیئے جاتے ہیں، حالانکہ اسلام اس معاملے میں اتنا ہی بری الذمہ ہے جتنا کہ کوئی دوسرا عالمی مذہب ہو سکتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی کہنا ضروری ہے کہ اسلام کے غلط استعمال کا تعلق کئی صورتوں میں مرکزی ریاستوں کی حد سے بڑھی ہوئی قوت اور ان کی عوام پر گرفت سے بھی جڑا ہوا ہے۔

میرا یہ ایمان ہے کہ اگر ہم اسلامی دنیا کی ہر برائی کی ذمہ داری مذہب پر نہ ڈالیں تو ہم یقیناً وہ تعلق تلاش کر لیں گے جو اسلام کے متعلق مغرب کی باتوں اور اس کے ردعمل کے طور پر ان اقدامات میں ہے جو کچھ مختلف مسلم معاشرے اختیار کرتے چلے آئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اسلامی دنیا میں مغرب کو ایک مقام حاصل ہے، اس کے اس مقام کا تعلق یا تو سابق نوآبادیاتی طاقت کے حوالے سے اور یا موجودہ دور کی تجارتی شراکت سے بنتا ہے، چنانچہ ان روابط نے جو چیز پیدا کر دی ہے، اسے تھامس فرینک (Thomas Frank) اور ایڈورڈ وس بینڈ (Edward Weisband) نے ''عالمی سیاست'' (World Politics) کا نام دیا ہے۔ اس کتاب کا مقصد اس بات کا تجزیہ کرنا اور اس کی وضاحت پیش کرنا بھی ہے کہ ہم مغرب اور اسلام کے درمیان جس کشمکش کو دیکھتے چلے آئے ہیں، ان دونوں کا کبھی آگے اور کبھی پیچھے ہونا، چیلنج کرنا اور چیلنج کا جواب دینا، کبھی کسی موضوع پر مبالغہ آمیز گفتگو کا آغاز کرنا اور دوسرے موضوع پر ایسی گفتگو کو بند کر دینا، یہ سب ''عالمی سیاست'' کا حصہ ہیں، ان کے ذریعے اسلام اور مغرب دونوں ہی مخصوص حالات پیدا کرتے ہیں، اپنے اقدامات کو درست قرار دیتے ہیں، مختلف راستے بند کرتے ہیں اور ایک دوسرے پر اپنی مرضی کا متبادل راستہ ٹھونستے ہیں، چنانچہ جب ایرانیوں نے تہران میں امریکی سفارتخانے پر قبضہ کیا، تو وہ نہ صرف امریکا میں ایران کے سابق شہنشاہ کے داخلے کے خلاف کارروائی کر رہے تھے بلکہ توہین اور تذلیل کی اس لمبی تاریخ کا بھی جواب دے رہے تھے، جو انھوں نے امریکا کی بالادست قوت کے ہاتھوں اٹھائی تھی، ان کے نزدیک ماضی میں امریکا جو قدم اٹھاتا رہا

ہے، وہ سب کے سب ان کی زندگیوں میں مداخلت کے مترادف تھے، یوں انھیں یہ احساس تھا کہ انھیں ان کے اپنے ہی ملک میں قیدی بنا کے رکھا گیا تھا، چنانچہ انھوں نے امریکیوں کو قیدی بنالیا اور تہران کے امریکی سفارتخانے میں جوان کے نزدیک امریکی علاقہ تھا، اس علاقے میں انھوں نے امریکیوں کو یرغمالی بنا کر رکھا، اگر چہ اس کارروائی سے ہی ایرانیوں کے نکتہ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے، لیکن زیادہ گہرائی میں اتر کے دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ الفاظ کی بوچھاڑ اور طاقت کی وہ نقل و حرکت ہی تھی، جس کی ہلکی سی جھلک دکھا کر ایرانیوں نے اس راستے کو ہموار کیا اور جس نے اس تمام کارروائی کو ممکن بنا دیا۔

میرے نزدیک یہ طرزِ عمل اس لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ یہ اس حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ سیاست اور اس کے دوران استعمال ہونے والی زبان میں گہرا تعلق ہوتا ہے، کم از کم اسلام کو زیر بحث لانے کے معاملے میں یہ بات درست ہے، اسلام کے ماہرین سے جو بات منوانا سب سے زیادہ مشکل ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایک سکالر کی حیثیت سے جو بات کرتے اور کہتے ہیں وہ بڑی حد تک اور بعض حالتوں میں ناگوار سیاسی ضرورتوں کے ساتھ منسلک ہوتی ہے، چاہے ماہرین اور عام لوگ اسلام کے متعلق جو کچھ کہتے ہیں اور کرتے ہیں اس کے متعلق وہ اس حقیقت کا اعتراف کریں یا نہ کریں، مگر یہ بات سچ ہے کہ معاصر مغربی دنیا میں اسلام کا جس قدر مطالعہ ہو رہا ہے اس پر سیاسی اہمیت کی چھاپ لگی ہوئی ہے، پھر ہر چیز کا کوئی مقصد ہوتا ہے اور خیال یہ کیا جاتا ہے کہ جب دوسرے معاشروں کی بات کی جاتی ہے تو وہ چاہے مغربی ہوں یا اسلامی، غیر ملکی ہوں، اجنبی ہوں اور مختلف ہوں، ان تمام صورتوں میں مقصدیت ان پر ہونے والی عملی گفتگو کے اندر موجود ہوتی ہے اور سیاست، اخلاقیات اور مذہب کی طویل تاریخ کے معاشروں پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں، وہ گفتگو میں مقصدیت کے اظہار کو نہیں روکتے، مثال کے طور پر یورپ میں مستشرقین روایتی طور پر نوآبادیاتی اداروں سے وابستہ رہے ہیں اور ان کے متعلق حال ہی میں ہمیں یہ معلوم ہونے لگا ہے کہ نوآبادیاتی نظام کی براہ راست فوجی فتوحات سے ان کا کتنا گہرا تعلق تھا، مشہور ڈچ مستشرق سی۔ سناؤک ہیوگینونجی (C.Snouck Hurgroonje) کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ اس نے مسلمانوں کا اعتماد صرف اس لیے حاصل کیا تھا تاکہ وہ سماٹرا کے اجہنسی (Atjehnese) قبائل پر ڈچ فوج کے بے رحم حملے کی منصوبہ بندی کرنے اور اسے عملی جامہ پہنانے میں اس کی مدد کر سکے، اس مثال سے مستشرقین کے متعلق ہمارے علم میں اضافہ ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے کردار پر مایوسی بھی ہوتی ہے، لیکن اس جانکاری کے باوجود ایسی نئی کتابیں اور مضامین کی بھرمار دیکھنے میں آتی ہے جو مغرب کی علمی تحقیق کو غیر سیاسی قرار دیتے، اسے مستشرقین کی کاوشوں کا نتیجہ ٹھہراتے اور اسے ''بامقصد'' ماہرانہ

رائے کا مقام دیتے ہیں، اس تعریف اور توصیف کے باوجود صورت حال یہ ہے کہ مشکل سے ہی ''اسلام'' پر کوئی ایسا ماہر ہوگا جسے مشیر کا درجہ نہ دیا گیا ہو یا اسے حکومت، مختلف کارپوریشنوں اور میڈیا میں ملازمت نہ ملی ہو، اس بات کو کہنے سے میرا مطلب یہ ہے کہ نہ صرف اخلاقی وجوہ کی بنیاد پر، بلکہ علمی وجوہ کی بنیاد پر بھی، اس تعاون کو نہ صرف نظر میں رکھنا ضروری ہے، بلکہ اس کا اعتراف کرنا بھی ضروری بنتا ہے۔

مجھے کہنے دیجیے کہ اسلام پر گفتگو نے اگر اسلام کو مکمل طور پر بگاڑ نہیں دیا تو اسے اس سیاست، معیشت اور ادبی ماحول میں ضرور رنگ دیا ہے، جس میں یہ ابھر کے سامنے آتا ہے، یہ ایک ایسی سچائی ہے جو مشرق اور مغرب دونوں مقامات پر درست بیٹھتی ہے اور کئی وجوہ سے یہ ظاہر کرتی ہے کہ یہ کہنے میں بہت زیادہ مبالغہ آرائی نہیں ہے کہ اسلام پر جس قدر مباحثے ہوئے ہیں ان کی کسی نہ کسی اتھارٹی یا قوت میں دلچسپی ضرور ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی نہیں کہہ رہا کہ ان وجوہ کی بنیاد پر اسلام کے متعلق تمام تحریریں اور علمی تحقیق غیر ضروری ہوتی ہیں بلکہ اس کے برعکس میرا یہ خیال ہے کہ یہ بہت مفید ہوتی ہیں اور یہ اس حقیقت سے پردہ اٹھاتی ہیں کہ ان کے ذریعے کن مفادات کی تسکین کا سامان ہو رہا ہے، میں یہ بات پورے یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ انسانی سوسائٹی سے جن معاملات کا تعلق ہے، ان کے بارے میں کیا مکمل سچ جیسی یا ہر اعتبار سے مکمل اور سچی معلومات جیسی کوئی چیز موجود ہے، بلکہ مجھے تو یہ سوچ زیادہ درست معلوم ہوتی ہے کہ ان کا حقیقی نہیں، خیال کی دنیا سے تعلق ہے، اس سلسلے میں میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آج کی حقیقت یہ ہے کہ اسلام سے متعلق معاملات کے بارے میں سچ کا تعلق اس سے ہے جو انھیں پیش کر رہا ہے، یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ سچ کی اس کیفیت کی بھی درجہ بندی کی جا سکتی ہے، اسے اچھا، برا اور لاتعلق قرار دیا جا سکتا ہے اور جو کچھ کہا گیا ہے، اس کے درست ہونے کے امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، یہ صورت حال صرف اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ''اسلام'' پر جو کوئی بھی گفتگو کرنا چاہتا ہے، اسے یہ بات اپنے سامنے رکھنی چاہیے کہ علم و ادب کے مطالعے کی ابتدا کرنے والا طالب علم کیا جانتا ہے، پھر اسے اس بات کا بھی ادراک ہونا چاہیے کہ انسانی حقیقتوں کے متعلق جب لکھا اور پڑھا جاتا ہے، تو اس سے کئی ایسے دوسرے امور بھی مطالعے میں شامل ہوتے چلے جاتے ہیں، جن کے لیے ''مقصد'' جیسے لیبلوں کا جواز نکل آتا ہے، یا ان سے محفوظ رہنا ممکن ہو جاتا ہے۔

اسی لیے میں اس صورت حال کی نشاندہی کرنے کی تگ و دو کرتا ہوں، جس سے بیانات پھوٹتے ہیں اور یہ بتانا چاہتا ہوں کہ معاشرے میں موجود جو مختلف گروپ ''اسلام'' میں دلچسپی لے رہے ہیں، انھیں پہچاننا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں عمومی طور پر مغرب اور خاص طور پر امریکا کے متعلق یہ بات نوٹ

کرنے کی ہے کہ اس نے اپنی طاقت کا تمام تر زور اسلام پر ڈال رکھا ہے، یہ اکیڈمیاں، کارپوریشنیں، میڈیا اور حکومت اس کی اسی قوت کی مختلف شکلیں ہیں اور ان میں سے کوئی بھی اسلام کے متعلق اپنے ان بے سروپا اور پرانے خیالات سے دور ہٹنے کو تیار نہیں ہے، جنھیں اس نے خود تخلیق کیا ہے، اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ''اسلام'' کو بیان کرنے کا ایک ایسا سیدھا سادہ طریقہ ان کے پاس آ گیا ہے، جس کے ذریعے ان کے جوڑ توڑ کے مختلف مقاصد پورے ہو سکتے ہیں، چنانچہ ان کی یہ خواہش کہ سرد جنگ کو پھر سے شروع کیا جائے، نسلی منافرت کو پھیلایا جائے، ممکنہ حملے کے لیے لوگوں کو تیار کیا جائے، عربوں اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کے سلسلے کو جاری رکھا جائے، ان کے اس جوڑ توڑ میں چھپی ہوئی ہے جسے یہ اسلام کو ایک مخصوص طریقہ سے بیان کر کے حاصل کرنا چاہتے ہیں، چنانچہ یہ جو باتیں کرتے ہیں، ان میں سے بہت کم کا تعلق سچ سے ہوتا ہے، اس لیے اپنے جوڑ توڑ سے وابستہ مقاصد کی اصل حقیقت سے ان کا انکار ایک عام فہم بات بن جاتی ہے، مگر اس صورت حال میں ان کا کمال یہ ہے کہ یہ اپنے مقاصد کو چھپانے کے لیے ان پر علمی اور بعض اوقات سائنسی ماہرین کے بیانات کا پردہ ڈال دیتے ہیں، اسی کا یہ بڑا دلچسپ نتیجہ ہے کہ جب مسلم ممالک عرب اور اسلامی علوم کے مطالعے کے لیے امریکی یونیورسٹیوں کو مالی مدد فراہم کرتے ہیں تو امریکی یونیورسٹیوں میں غیر ملکی مداخلت کی چیخ و پکار سنائی دیتی ہے لیکن جب جاپان یا جرمنی عطیہ دیتے ہیں تو اس طرح کی کوئی شکایت سننے میں نہیں آتی۔ جہاں تک یونیورسٹیوں پر اداروں اور تنظیموں کے دباؤ کا تعلق ہے، اسے ان کی الگ تھلگ حیثیت سے جوڑ دیا جاتا ہے۔

اس سے پہلے کہ میں آسکر وائلڈ (Oscar Wilde) کے اس نظریے کی تقلید کرتا ہوا دکھائی دوں کہ خشک مزاج شخص اسے کہتے ہیں جو ہر چیز کی قیمت تو جانتا ہے مگر اس کی قدر نہیں کرتا، مجھے یہ کہہ دینا چاہیے کہ میں باخبر ماہرانہ رائے کی ضرورت کو تسلیم کرتا ہوں، میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ امریکا ایک بڑی طاقت کی حیثیت سے ایسا رویہ اپنا سکتا ہے، ایسی پالیسیاں اختیار کر سکتا ہے جو چھوٹی قوتیں اختیار نہیں کر سکتیں اور میں یہ امید بھی رکھتا ہوں کہ اس وقت کے خراب حالات کو بہتر بنایا جا سکتا ہے تاہم کئی ماہرین، پالیسی ساز اور عام دانشور بہتری کے لیے ''اسلام'' کے تصور پر جس قدر پختہ یقین رکھتے ہیں میرا یقین اتنا پختہ نہیں ہے، اس کے برعکس میں اکثر یہ سوچتا ہوں کہ ''اسلام'' نے اس بات کو سمجھانے میں تو کوئی مدد نہیں دی کہ معاشروں اور عوام کو کیا چیز متحرک رکھتی ہے بلکہ الٹا اس بات کی تہ تک پہنچنے کی راہ میں رکاوٹ ہی ڈالی ہے۔ البتہ میں جس چیز پر یقین رکھتا ہوں وہ تنقیدی احساس اور اس احساس کا اُن باشندوں میں موجود ہونا ہے، جو نہ صرف لائق ہیں بلکہ یہ خواہش بھی

رکھتے ہیں کہ ''اسلام'' کو اس طرح استعمال کیا جائے کہ ماہرین کے خصوصی مفادات اور ان کے افکار سے آگے کی منزل تک پہنچنا ممکن ہو جائے، اس میں کچھ کلام نہیں کہ ایک اچھے تنقیدی قاری کی مہارت استعمال کر کے مقصدیت اور نامعقولیت میں امتیاز کیا جا سکتا ہے، صحیح سوال اٹھا کر اور ان کے معقول جواب حاصل کر کے کوئی بھی ''اسلام'' یا اسلامی دنیا، اس کی ثقافتوں اور ان مردوں اور عورتوں کے بارے میں جان سکتا ہے، جو اسلامی دنیا میں رہتے، اس کی زبان بولتے، اس کی ہواؤں میں سانس لیتے ہیں اور جن سے تاریخ اور معاشرے جنم لیتے ہیں، انسان شناسی کا علم اسی نکتے سے شروع ہوتا ہے اور اسی سے فرقہ وارانہ ذمہ داریاں اٹھتی اور دامن گیر ہوتی ہیں، میں نے یہ کتاب اسی بات کو سمجھانے کے لیے لکھی ہے۔

اس کتاب کے باب اول اور دوم کے کچھ حصے ''دی نیشن'' اور ''کولمبیا جرنلزم ریویو'' (Columbia Journalism Review) میں شائع ہو چکے ہیں، ان کے لیے میں رابرٹ مناف (Robert Manoff) کا شکر گزار ہوں جن کا بحیثیت ایڈیٹر کولمبیا جرنلزم ریویو سے تعلق اگرچہ بہت مختصر مدت کے لیے تھا مگر اس عرصے میں انھوں نے اسے ایک دلکش اشاعت بنا دیا تھا، اس کتاب کے مختلف حصوں کا مواد جمع کرنے میں ڈگلس بالڈون (Douglas Baldwin) اور فلپ شیہادی (Philip Shehade) نے میری بڑی مدد کی ہے اور پال لپاری (Paul Lipari) نے اپنی ادبی مہارت اور قابلیت سے کام لیتے ہوئے اس کتاب کے مسودے کو حتمی شکل دی اور البرٹ سعید (Albert Said) نے جس خلوص کے ساتھ میری مدد کی میں اس کا بھی شکر گزار ہوں۔

میں اپنے ساتھی اقبال احمد کا خاص طور پر شکریہ ادا کروں گا، اقبال ایک چلتی پھرتی انسائیکلوپیڈیا ہیں اور انھوں نے مجھ جیسے کئی اصحاب کو اپنے مشوروں اور حوصلہ افزائی کے ذریعے ابتر اور مشکل حالات سے نکالا ہے۔ جیمز پیک (James Peck) نے اس کتاب کا ابتدائی مسودہ پڑھا تھا اور اس پر نظر ثانی کرنے کے لیے مجھے کئی اچھی تجاویز دی تھیں، اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کتاب میں جو کمی یا خامی رہ گئی ہے اس کی ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے، انھوں نے بلاشبہ میری ایسی مدد کی ہے جسے بھلایا نہیں جا سکتا، میں ان کا بھی شکر گزار ہوں، پینتھین بکس (Pantheon Books) کی جینی مارٹن (Jeanne Morton) نے بڑی مہارت اور چابکدستی کے ساتھ اس مسودے کی ایڈیٹنگ کی ہے وہ بھی شکریے کی حقدار ہیں، ساتھ ہی ساتھ میں آندرے شیفرن (Andre Schiffrin) کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

یہ کتاب مریم سعید کے نام معنون کی گئی ہے اور ان کی خوبی یہ ہے کہ جس وقت یہ کتاب لکھی جا رہی

تھی اس وقت انھوں نے اس کے مصنف کو حقیقی معنوں میں زندہ رکھا، ان کی محبت، ان کی رفاقت اور ان کی ہمت بندھائے رکھنے والی موجودگی کا میں دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

ای ڈبلیو ایس

اکتوبر/1980ء نیویارک

تعارف (اضافہ)

تہران کے امریکی سفارتخانے میں جن باون امریکیوں کو قیدی رکھا گیا تھا وہ 444 دن قیدی رہنے کے بعد بالآخر 20/جنوری 1981 کو آزاد ہو کر ایران چھوڑ چکے ہیں، رہائی کے چند دن بعد جب وہ امریکا پہنچے تو یہاں حقیقی معنوں میں سچی خوشی کا اظہار کیا گیا، ان کی آمد کو ''یرغمالیوں کی واپسی'' کا نام دیا گیا اور ہفتہ بھر تک میڈیا نے اس پر خوب تبصرے کیے ان ''واپس آنے'' والوں کو ایران سے پہلے الجزائر، پھر جرمنی اس کے بعد ویسٹ پوائنٹ سے واشنگٹن لایا گیا اور یہاں سے آخر کار انھیں ان کے اپنے اپنے قصبوں میں بھیج دیا گیا۔ اس دوران اکثر یہ بھی ہوا کہ ٹیلی وژن پر دوسرے پروگرام روک کر ان کے متعلق رلا دینے والی باتیں کی گئیں، کئی اخباروں اور قومی ہفت روزہ سالوں نے ان کی واپسی پر خصوصی ضمیمے شائع کیے تھے، جن میں اس معاہدے کا علمی تجزیہ کیا گیا تھا جو ایران اور امریکا کے درمیان ہوا تھا اور جس کے تحت ان کی رہائی ممکن ہوئی تھی، پھر ان ضمیموں میں امریکا کی جرأت اور بہادری اور ایران کی بربریت کو اجاگر کیا گیا تھا اور درمیان میں کہیں کہیں یرغمالیوں کے ابتلا کی کہانیاں بھی دی گئی تھیں اور ان میں من چلے صحافیوں نے خوب رنگ بھرا تھا، سب سے زیادہ تشویشناک بات نفسیاتی معالجوں کا بڑی بھاری تعداد میں سامنے آنا اور یہ بتانے کو بے تاب ہونا تھا کہ واپس آنے والے یرغمالی کس کیفیت سے گزر رہے ہیں، ان یرغمالیوں نے پیلے رنگ کے ربن لگا رکھے تھے جو ایران میں ان کی قید کی علامت تھے، اس قید سے پہلے اور اس کے بعد آئندہ کے متعلق جو سنجیدہ گفتگو ہوئی، اس کے انداز اور اس کی حدود کو نئی انتظامیہ نے متعین کیا تھا، ماضی کے جس قدر تجزیے پیش کیے گئے ان میں اس بات کو زیر بحث لایا گیا تھا کہ کیا امریکا کو ایران کے ساتھ معاہدہ کرنا چاہیے تھا اور کیا اسے اس معاہدے کی پابندی کرنا چاہیے، اسی سلسلے میں نیوری پبلک نے اپنی 31/جنوری 1981ء کی اشاعت میں ''تاوان'' کی ادائیگی اور دہشت گردوں کی شرائط ماننے پر کارٹر انتظامیہ کو تنقید کا نشانہ بنایا، اس کے ساتھ اس نے نہ صرف ایران سے معاملہ کرنے سے متعلق تمام ''زیر بحث قانونی تجاویز'' کی مذمت کی، بلکہ الجزائر کی ثالثی پر اعتراض کرتے ہوئے یہ نکتہ اٹھایا کہ یہ ملک "دہشت گردوں کو پناہ دینے اور وہ جو تاوان حاصل کرتے ہیں، اسے جائز

بنانے کے کاموں میں ملوث ہے" جہاں تک اس سلسلے میں مستقبل کی گفتگو کا تعلق تھا، ریگن انتظامیہ نے دہشت گردوں کے خلاف جنگ کا اعلان کر کے اسے لگام ڈال دی تھی، پھر ریگن انتظامیہ کے اس اعلان سے یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ اب امریکا کی نئی ترجیحات میں انسانی حقوق کو نہیں بلکہ دہشت گردی کو اولیت حاصل ہوگی اور اس سلسلے میں امریکا اس حد تک جائے گا کہ وہ "درمیانے درجے کی ان جابرانہ حکومتوں" کی حمایت بھی کرے گا جو اس کی اتحادی ہوں گے۔

پیٹر۔سی سٹووارٹ (Peter C.Stuart) نے کرسچن سائنس مانیٹر (Christian Science Monitor) کی 29 رجنوری 1981ء کی اشاعت میں لکھا ہے کہ کانگریس میں سماعت شروع ہونے کا امکان ہے، جس میں "یرغمالیوں کی رہائی کی شرائط .... یرغمالیوں کے ساتھ سلوک .... سفارتخانے کی سیکیورٹی .... (اور بعد میں اس کا خیال آیا) امریکا ایران تعلقات کا مستقبل" جیسے معاملات پر غور ہوگا، اس بحران کے دوران میڈیا نے جن مسائل کی چھان بین کی اس کا دائرہ بہت محدود تھا، اس بات پر کوئی توجہ نہیں دی گئی کہ اس سارے ہنگامے سے ایران کا کیا مقصد تھا، اس سے مستقبل پر کیا روشنی پڑتی ہے اور اس سے کیا سیکھنا چاہیے، تاہم لندن کے سنڈے ٹائمز نے اپنے 26 رجنوری کے شمارے میں یہ انکشاف ضرور کیا کہ صدر کارٹر نے اپنے عہدے سے رخصت ہوتے ہوئے دفتر خارجہ کو یہ ہدایت کی تھی کہ "ایرانیوں کے خلاف غم وغصے کی نئی لہر پیدا کرنے کے لیے عوام کی توجہ اس واقعہ پر مرکوز رکھی جائے" صدر کارٹر سے منسوب یہ بات درست تھی یا نہیں اس کے متعلق یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا، تاہم اس دوران میں یہ بات ضرور ہوئی ہے کہ سرکاری افسروں، کالم نگاروں اور صحافیوں کی کسی مختصر جماعت نے بھی اس طویل امریکی تاریخ میں دلچسپی نہیں لی کہ ایران اور اسلامی دنیا کے دوسرے حصوں میں امریکا کتنی بار مداخلت کر چکا ہے، اس کے بجائے اس طرح کی باتیں عام ہونے لگیں کہ مشرق وسطیٰ میں امریکی فوج کو تعینات کیا جائے، اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب جنوری کے آخری ہفتے میں طائف میں اسلامی سربراہ کانفرنس منعقد ہوئی تو امریکی میڈیا نے اسے مکمل طور پر نظر انداز کر دیا۔

میڈیا نے یرغمالیوں کی ابتلا اور ان کی فاتحانہ واپسی کے واقعات میں اس بات کو شامل کر لیا تھا کہ امریکا خود کو منوانے کے لیے نہ صرف فوجی قوت کا مظاہرہ کرے، بلکہ بدلہ بھی لے، پھر دیکھتے ہی دیکھتے یرغمالیوں کو ہیرو اور آزادی کی علامت بنا دیا گیا اور انھیں قیدی بنانے والوں کو انسانیت سے گرے ہوئے حیوان قرار دیا گیا، یہ بات آسانی سے سمجھ آ جاتی ہے کہ اس سے ان فوجیوں اور سابقہ جنگی قیدیوں کی دلآزاری ہوئی جنھوں نے اپنے ملک کی بڑی خدمت کی تھی، اس سلسلے میں نیویارک ٹائمز نے اپنے 22 رجنوری کے

اداریے میں لکھا کہ "یرغمالیوں کی رہائی کے ان ابتدائی دنوں میں اشتعال اور نفرت کے جذبات کا ہونا لازمی ہے" پھر یوں لگتا ہے کہ اپنے اس موقف پر غور کرنے کے بعد 28 رجنوری کو اس نے یہ سوال اٹھایا کہ اس صورت حال میں کیا کیا جانا چاہیے تھا؟ کیا بندرگاہوں کو بارودی سرنگوں سے بند کر دینا چاہیے تھا یا یہاں میرینز کو اتارا جانا چاہیے تھا، یا کچھ بم گرا کر سمجھ دار دشمن کو خوفزدہ کیا جا سکتا تھا، مگر اس سے سوال یہ اٹھا کہ کیا ایران سمجھدار تھا اور سمجھدار ہے؟ فریڈ ہالی ڈے (Fred Halliday) لاس اینجلس ٹائمز کی 25 رجنوری کی اشاعت میں اس صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتا ہے کہ ایران، اس کے مذہب اور نہ ختم ہونے والے انقلابی ہنگاموں پر تنقید کی بڑی گنجائش موجود ہے کیونکہ اس نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ ایک ایسی جدید ریاست کا اہل نہیں ہے جو حالات کے مطابق روزانہ ایسے فیصلے کر سکے جن سے عوام کی اکثریت کو فائدہ پہنچے، عالمی سطح پر ایران نہ صرف تنہا ہے بلکہ کمزور بھی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قیدیوں کے ساتھ سفارتخانے میں طلبہ نے کوئی نرم رویہ اختیار نہیں کیا لیکن ان باون یرغمالیوں میں سے کسی ایک نے بھی خود یہ بات نہیں کہی کہ اسے تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا یا ان کے ساتھ بڑے منظم انداز میں وحشیانہ سلوک کیا گیا تھا یہ بات ان کی اس پریس کانفرنس کے ریکارڈ میں موجود ہے جو انھوں نے ویسٹ پوائنٹ پر کی تھی اور اسے نیویارک ٹائمز کی 28 رجنوری کی اشاعت میں دیکھا بھی جا سکتا ہے۔ الزبتھ سوفٹ (Elizabeth Swift) جو یرغمالیوں میں سے ایک تھیں انھوں نے کھلم کھلا اس پریس کانفرنس میں یہ بات کہی ہے کہ انھوں نے جو کہا تھا نیوز ویک نے اس کی جھوٹی کہانی بنائی اور اس میں جبر وتشدد کو اپنی طرف سے شامل کر دیا جبکہ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی اور نہ ہی اس کا حقائق سے کوئی تعلق ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یرغمالیوں والا واقعہ بڑا ناخوشگوار تھا، اس سے بہت بے چینی پھیلی اور انھیں کافی طویل قید کاٹنا پڑی، جب ان کی واپسی ہوئی تو میڈیا اور ثقافتی حلقوں کو اس کی چھوٹ مل گئی کہ وہ ایران اور اسلام کے خلاف باتیں کریں، دوسرے الفاظ میں ایک پیچیدہ تاریخی تجربے سے جو سیاسی قوت حرکت میں آئی تھی، سارا زور اسے بھلانے پر لگا دیا گیا، اور ہم پھر پرانی بنیادوں کی طرف لوٹ گئے۔ باب انگل (Bob Ingle) نے 23 رجنوری کو اٹلانٹا کانسٹی ٹیوشن میں ایرانیوں کو "بنیاد پرست متلون مزاج" (Fundamentalist Screwballs) قرار دیا، کلیئر سٹرلنگ (Claire Sterling) نے 23 رجنوری کو واشنگٹن پوسٹ میں یہ دلیل پیش کی کہ ایران کی داستان "خوف کے عشرے" کا ایک حصہ ہے اور یہ دہشت گردوں کی طرف سے تہذیب کے خلاف جنگ ہے، اس اخبار کے اسی صفحے پر بل گرین (Bill Green) کا مضمون "ایرانیوں کی گندی حرکتیں" (the Iranian obscenity) بھی شائع ہوا جس میں اس نے اس امکان کی طرف اشارہ کیا کہ "پریس کی آزادی" کے تحت ایران کے متعلق

جو خبریں پیش کی جا رہی ہیں۔ اس آزادی کو "ایک ایسا ہتھیار بننے سے روکنا پڑے گا جس کے ذریعے امریکا کی قوم پرستی اور ذاتی وقار کے دل کا نشانہ لینا ممکن ہو" گرین نے اعتماد اور عدم تحفظ کو ایک ہی لڑی میں پرونے کا یہ بہترین نمونہ پیش کیا تھا جس کے تاثر کو کم کرنے کے لیے اس نے چند دن بعد یہ سوال اٹھایا کہ کیا پریس نے "ایرانی انقلاب" کو سمجھانے میں "ہماری" مدد کی ہے۔ اس کا جواب بڑی آسانی سے مارٹن کونڈری (Martin Kondracke) نے 29 /جنوری کے وال سٹریٹ جرنل میں یوں دیا کہ قریب قریب تمام "امریکی ٹیلی وژن چینلوں نے ایرانی بحران کو یا تو اس طرح بنا کر دکھایا کہ یہ خود کو کوڑے مارنے اور ہوا میں مکے لہرانے والوں کا کھیل تماشا ہے یا پھر اسے اوپرا سوپ (Opera Soap) بنا دیا ہے"۔

تاہم اس منظر نامے میں کچھ صحافی ایسے بھی تھے جنھوں نے صحیح معنوں میں اس صورت حال پر غور کیا۔ ان میں سے ایچ ڈی ایس گرین وے (H.D.S. Greenway) نے 21 /جنوری کو بوسٹن گلوب (Boston Globe) میں اس بات کا اعتراف کیا کہ "امریکیوں نے یرغمالیوں کے بحران کے خبط میں مبتلا ہو کر جن دوسرے اہم مسائل کو پس پشت ڈالا، اس سے امریکی مفادات کو نقصان پہنچا ہے"۔ کھل کر یہ بات کہنے کے ساتھ ساتھ گرین وے نے اس صورت حال سے یہ واضح نتیجہ بھی اخذ کیا کہ "مختلف اقوام سے وجود میں آنے والی، اس دنیا کے حقائق نہیں بدلیں گے اور نئی انتظامیہ کو بیسویں صدی کے اواخر تک اس بات کا ادراک ہو جائے گا کہ طاقت کے استعمال کی بھی ایک عملی حد موجود ہے" اسی دن گلوب میں لکھتے ہوئے سٹیون ارلینگر (Steven Erlanger) نے صدر کارٹر کی تعریف کی کہ انھوں نے بحران کی شدت کو کم کیا اور اس طرح ملک میں جاری بحث کو "جذباتی کم اور دانشمندانہ زیادہ" بنا دیا، اس پر نیوری پبلک نے 31 /جنوری کی اپنی اشاعت میں اس طرح اس کی کھچائی کی کہ "گلوب تو اپنے صفحات پر ہر ایک کے لیے گنجایش نکال لیتا ہے" اس فقرے کا مطلب یہ تھا کہ تعمیر نو کے عمل سے گزرنے اور کمیونزم سے لڑنے کے لیے امریکی طاقت پر لازم ہے کہ وہ ایران کے ساتھ منحرف ہو جانے والوں جیسا سلوک کرے، اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک لڑاکا سوچ تھی، جسے نیم سرکاری امریکی نظریے کا درجہ دے دیا گیا تھا۔

فارن افیئرز کے 81-1980ء کے موسم سرما ایڈیشن میں رابرٹ ڈبلیو ٹکر (Robert W.Tucker) کا مضمون "امریکی طاقت کے مقاصد" شائع ہوا ہے جس میں اس نے کہا کہ ایک طبقہ یہ چاہتا ہے کہ "امریکا دنیا پر چھا جائے" جبکہ دوسرے کی خواہش ہے کہ "امریکا دنیا سے الگ تھلگ رہے" لیکن جہاں تک اس کی اپنی ذات کا تعلق ہے وہ خود ان دونوں طبقوں کو ایک نئے راستے کی طرف دھکیل رہا ہے" اس دعوے کے باوجود

ٹکر نے ہی یہ تجویز پیش کی کہ خلیج فارس اور وسطی امریکا میں بلا تکلف فوجی مداخلت کی پالیسی کو اختیار کر لیا جائے، اس نے یہ بھی کہا کہ یہ اس لیے ضروری ہے کہ امریکا نہ تو ان ممالک کے اندرونی نظام میں تبدیلی کی اور نہ وہاں کمیونزم کے اثرات کو پھیلنے کی "اجازت" دے سکتا ہے، یعنی دونوں حالتوں میں یہ فیصلہ امریکا کے اختیار میں ہوگا کہ کس کے لیے کون سی تبدیلی قابل قبول ہے اور کون سی نہیں ہے، چنانچہ ہاورڈ کے رچرڈ پائپس (Richard Pipes) نے جو ایک ہم خیال ساتھی ہیں یہ تجویز کیا کہ امریکا کی نئی انتظامیہ کو چاہیے کہ وہ دنیا کو کمیونسٹوں کی حامی اور کمیونسٹوں کی مخالف اقوام میں تقسیم کر دے۔

اگر سرد جنگ کے پھر شروع ہونے سے ایک طرف نظم و ضبط اور حکم آتا ہے تو دوسری طرف اس سے خود فریبی کا دور بھی واپس آ جاتا ہے، پھر اس طرح ہر وہ شخص جو کسی گناہ کے احساس سے نہیں بلکہ خود آگاہی کی وجہ سے یہ نکتہ اٹھائے گا کہ مغرب اپنے ماضی پر نظر کرے تو اس کا شمار دشمنوں میں ہونے لگے گا، میرے خیال میں ایسے لوگوں کو نظر انداز کر دینا ہی بہتر ہے، اس طرز عمل کی بڑی طاقتور علامتی مثال ہمیں ویسٹ پوائنٹ کی پریس کانفرنس میں اس وقت نظر آتی ہے جب سامعین میں سے ایک شخص کہتا ہے کہ پہلوی دور میں خود امریکا شاہ کو یہ ترغیب دیتا رہا ہے کہ مخالفت کرنے والے ایرانیوں کے اعضا کاٹ دیے جائیں، ایسے میں جب "امریکی حکومت یرغمالیوں پر تشدد کی بات کرتی ہے تو اسے منافقت کی انتہا کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا" اس پریس کانفرنس میں ایک تماشا یہ بھی ہوا کہ بروس لین جن (Bruce Laingen) جو ایران میں امریکا کا سینئر سفارتکار اور تہران کے سفارتخانے میں نائب سفیر تھا، اس نے دو دفعہ یہ کہا کہ اسے سوال سنائی نہیں دیا لیکن پھر سوال سننے کا انتظار کیے بغیر تیزی سے، وہ ایرانی بربریت اور امریکی معصومیت کے اپنے پسندیدہ موضوع کی طرف آ گیا۔

کسی ماہر نے، میڈیا سے متعلق کسی شخصیت یا سرکاری افسر نے اس پر غور نہیں کیا کہ امریکی سفارتخانے پر غیر قانونی قبضے پر توجہ مرکوز کرنے، اسے ڈرامائی انداز دینے، اسے بیان کرنے، اور یرغمالیوں کی واپسی پر پروگرام دکھانے کے لیے جو وقت صرف کیا گیا ہے، اگر اس کا بڑا معمولی حصہ سابق شاہ کی حکمرانی کے دوران ہونے والے جبر اور وحشیانہ تشدد کو دکھانے پر صرف کیا جاتا تو اس سے کیا نتیجہ سامنے آتا، پھر یرغمال بنائے جانے والے واقعہ پر معلومات حاصل کرنے کے لیے جو اتنا بڑا انتظام کیا گیا تھا، کیا اسے اس بات کا پابند کرنا ضروری نہیں بنتا تھا کہ وہ لوگ جن کی اس معاملے میں بے چینی جائز تھی، انھیں یہ بتایا جائے کہ ایران میں دراصل کیا ہو رہا ہے؟ اور پھر کیا یہ بہت ضروری تھا کہ وہاں کی اصل تصویر کو چھپانے کے لیے جو متبادل راستہ

اختیار کیا گیا، اسے حب الوطنی کے جذبات ابھارنے اور ایران کو پاگل قرار دیکر عوامی غم و غصے کو بھڑکانے کے لیے استعمال کیا جائے؟

اب جبکہ مبالغہ آمیز افسوسناک داستان تمام ہو چکی ہے تو یہ عام اور بے کار سوال نہیں رہے، اس لیے عالمی سیاست میں جو تبدیلیاں واقع ہو رہی ہیں، ان سے متعلق الجھاؤ کو اگر سلجھا دیا جائے تو اس سے عمومی طور پر مغرب اور خاص طور پر امریکا کو نہ صرف فائدہ پہنچے گا بلکہ ایک ایسی شکل سامنے آ جائے گی، جس میں عمل کرنا ممکن ہوگا، چنانچہ امریکا کو سوچنا یہ ہوگا کہ ''اسلام'' کو تیل سپلائی کرنے والے دہشت گردوں کے کردار تک محدود رکھا جائے؟ یا جرائد کو اور دوسرے تحقیق کرنے والوں کو، اپنی توجہ اس پر مرکوز کرنا چاہیے کہ ''ایران کو کس نے کھویا ہے'' یا مباحثوں اور غور و فکر کو ایسے موضوعات کی طرف موڑنا چاہیے جو عالمی برادری اور پُرامن ترقی کے لیے موزوں ہیں؟

اے بی سی نے 1981ء میں جنوری 22 سے 28 تک جو تین گھنٹے کا خصوصی پروگرام ''خفیہ مذاکرات'' کے نام سے نشر کیا، اس میں یہ اشارہ صاف ملتا ہے کہ عوام کو مطلع کرنے کے لیے میڈیا اپنی غیر محدود صلاحیتوں کو کیسے استعمال کر سکتا ہے، اس پروگرام میں ان تمام طریقوں پر سے پردہ اٹھایا گیا تھا، جو یرغمالیوں کو آزادی دلانے کے لیے اختیار کیے گئے تھے، اس نشریے میں ایسا مواد بھی پیش کیا گیا تھا جو اس سے پہلے سامنے نہیں آیا تھا اور بڑا موثر تھا، اس کا تھوڑا سا حصہ ہی بہت کچھ بتانے والا تھا اور اس سے وہ رویے جو نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تھے، وہ بھی روشن ہو گئے تھے۔

ایک ایسا ہی لمحہ تب آیا جب کرسچین بورگٹ (Christian Bourguet) نے مارچ 1980ء کے اواخر میں جمی کارٹر سے وائٹ ہاؤس میں ملاقات کی، بورگٹ ایک فرانسیسی وکیل تھا اس کے ایرانیوں کے ساتھ روابط تھے، اس نے امریکا اور ایران کے درمیان رابطے کا کام کیا تھا اور وہ اس لیے واشنگٹن آیا تھا کہ پاناما والوں کے ساتھ سابق شاہ کی گرفتاری کا بندوبست کر لیا گیا تھا لیکن معزول حکمران اچانک مصر چلا گیا، جس سے صورت حال پھر پہلے جیسی ہو گئی تھی۔

> بورگٹ بتاتا ہے کہ ایک خاص موقع پر (کارٹر نے) یرغمالیوں کی بات کی اور کہا کہ تم جانتے ہو کہ یہ یرغمالی امریکی ہیں اور معصوم ہیں، میں نے ان سے کہا کہ جی ہاں، جناب صدر میں سمجھتا ہوں کہ آپ انھیں معصوم کہہ رہے ہیں، لیکن میں یہ یقین رکھتا ہوں کہ آپ کو یہ بات سمجھنی چاہیے کہ وہ ایرانیوں کے لیے معصوم نہیں ہیں، اگرچہ ان

> میں سے کسی نے بھی ذاتی طور پر کوئی قدم نہیں اٹھایا مگر سفارتی عملہ ہونے کی وجہ سے، یہ اس لیے معصوم نہیں ہیں کہ یہ ایک ایسے ملک کی نمایندگی کرتے ہیں، جس نے ایران میں بہت کچھ غلط کیا ہے۔
>
> آپ کو یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ جو کارروائی کی جا رہی ہے، وہ ان افراد کے خلاف نہیں ہے، بلاشبہ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا گیا، انھیں زدوکوب نہیں کیا گیا، انھیں قتل کرنے کی کوئی کوشش نہیں ہوئی، آپ کو سمجھنا چاہیے کہ یہ ایک علامتی اقدام ہے اور اسے علامت کی سطح پر اس لیے برقرار رکھا گیا ہے تاکہ اس معاملے کے حقیقی پہلو پر غور کیا جا سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ کارٹر نے سفارتخانے پر قبضے کو علامتی معنی میں ضرور دیکھا ہوگا، لیکن اس نظر سے نہیں، جس نظر سے فرانسیسی وکیل اسے دیکھ رہا تھا، کارٹر کے پاس اس واقعہ کو دیکھنے کے لیے اپنے حوالے موجود تھے، اس کی نظر میں امریکی معصومیت کی اصطلاح پر پورے اترتے تھے اور ایک اعتبار سے تاریخ سے باہر تھے، کوئی دوسرا موقع ہوتا تو وہ یہ ضرور کہتا کہ امریکا سے ایران کی شکایات پرانی تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں اس لیے اب صرف یہ بات معنی رکھتی ہے کہ ایرانی دہشت گرد ہیں اور شاید ہمیشہ سے ہی ایک دہشت گرد قوم رہے ہیں، چنانچہ جو امریکا کو ناپسند کرتا ہے یا امریکیوں کو یرغمالی بناتا ہے وہ خطرناک ہی نہیں بلکہ بیمار بھی ہے، وہ عقل و خرد سے بیگانہ ہے، انسانیت سے گرا ہوا ہے اور شائستگی اسے چھو کر بھی نہیں گزری۔

کارٹر اس بات کو سمجھنے سے قاصر تھا کہ امریکا طویل مدت سے مقامی آمروں کی جو پشت پناہی کر رہا ہے، اس کے متعلق غیر ملکی کیا سوچتے ہیں اور اس کا تہران میں امریکیوں کو یرغمالی بنانے سے کیا تعلق ہے، چنانچہ کارٹر کا ایسا نہ کر سکنا، غیر معمولی حد تک علامتی مظہر ثابت ہوتا ہے، اگر کوئی اس بات کا سخت مخالف ہے کہ لوگوں کو یرغمالی بنایا جائے اور اگر کوئی یرغمالیوں کی واپسی کے متعلق صرف اچھے احساسات رکھتا ہے تو دونوں حالتوں میں بعض حقائق سے سرکاری قومی رجحان کا تغافل برتنا بڑا تشویشناک ہے اور اس سے بڑا سبق ملتا ہے، دراصل عوام اور قوموں کے درمیان تعلقات دوطرفہ ہوتے ہیں، کوئی بھی ''ہمیں'' حکم نہیں دے سکتا، کہ ہم پسند کریں یا ''انھیں'' درست قرار دیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ (الف) ''وہ'' وہاں ہیں اور (ب) جہاں تک ''ان کا'' تعلق ہے ''ہم'' وہ ہیں۔ جو ہم ہیں، اس کے ساتھ ساتھ انھیں ہمارا تجربہ ہو گیا ہے اور انھوں نے ہمیں جان لیا ہے، اس معاملے کا معصومیت یا گناہ سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ اس کا
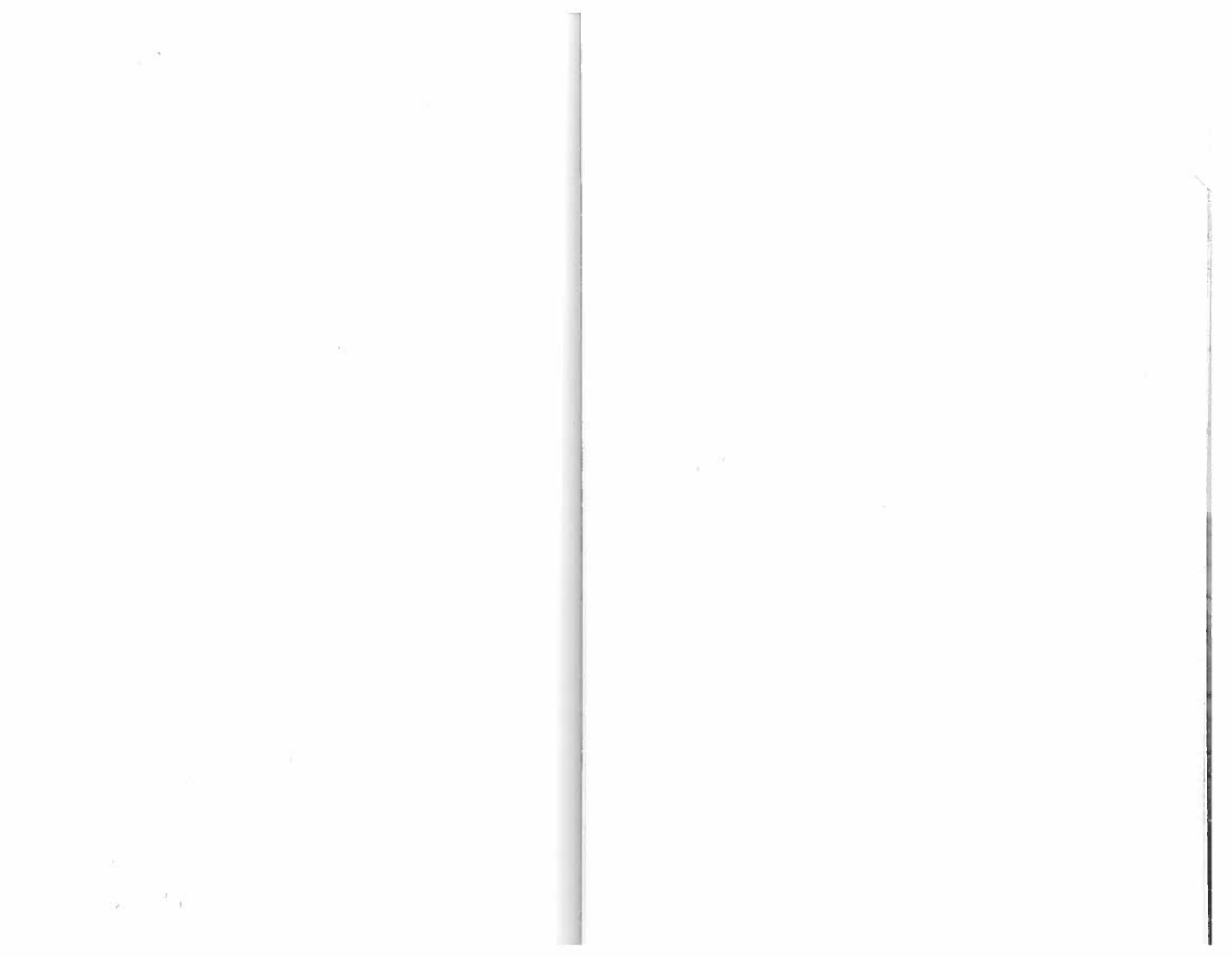
نے اس بات کو ناممکن بنا دیا ہے کہ وہ عمل کے اسباب کو سمجھ سکیں، ان کے نزدیک الفاظ اور حقائق کے درمیان کوئی تعلق نہیں ہوتا، ''ایران'' پر لین جن کے تاثرات اعتماد کے لائق نہیں ہیں کیونکہ اسے ''دوسرے فریق'' کا احساس ہی نہیں ہوتا، نہ اس میں اعتماد اور خیر سگالی کی خاصیت موجود ہے اور نہ اس کا کردار ایسا ہے کہ وہ وعدہ جو اس کے الفاظ کریں گے انھیں وہ پورا کرے گا۔

اس منکسرانہ تجویز کی شان یہ ہے کہ ایرانی یا مسلمانوں سے جو چیز کسی ثبوت کے بغیر منسوب کی جا سکتی ہے اس کا اطلاق اس نیم افسانوی "امریکی" پر بھی ہوتا ہے جس نے یہ پیغام بھیجا تھا اور جس کا نام ظاہر نہیں کیا گیا تھا یعنی لین جن، جہاں تک تاریخ اور حقائق کا تعلق ہے تو اس سے تو خود امریکی اس وقت انکار کر دیتے ہیں جب وہ یہ بات یک طرفہ طور پر کہتے ہیں کہ یہ دونوں ''ایران'' کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتے، آیئے اب ہم دیوان خانے میں درج ذیل کھیل کھیلتے ہیں، اس کھیل میں ہم نے یہ تلاش کرنا ہے کہ لین جن نے جو باتیں ''ایرانیوں'' سے منسوب کی ہیں ان کی حامل ثقافتی اور سماجی شخصیات ہمیں یہودیت اور عیسائیت میں کہاں ملتی ہیں اور کون سی ملتی ہیں، وہ حد سے بڑھی ہوئی انا پرستی کا ذکر کرتا ہے یہ روسو (Rousseau) میں تھی، حقیقت کو تسلیم کرنا بد اندیشی ہے، یہ سوچ کافکا(Kafka) کی تھی، وحدہ لاشریک خدا؟ قدیم اور جدید عہد نامے بھی اس کا ذکر کرتے ہیں، عمل کے اسباب کے احساس کا فقدان؟ بیکٹ (Beckett) کو دیکھیے، بازاری ذہنیت؟ نیویارک سٹاک ایکسچینج میں دکھائی دیتی ہے، یہ الفاظ اور حقیقت کا کنفیوژن (ابہام)؟ آسٹن(Austin) اور سرلی (Scarle) کو پڑھیے، مغرب جس طرح حد سے بڑھی ہوئی اپنی ستایش کرتا ہے اس کی تصویر کشی اس طرح بہت کم لوگ کر سکتے ہیں جس طرح کرسٹوفر لیش (Christopher Lasch) نے کی ہے، بنیاد پرست مبلغ کے الفاظ کی بہترین مثال افلاطون(Plato) اور کریٹائیلس (Cratylus) ہیں، ایک یادداشتہاری نغمے اور حقیقت کے مستقل اور مفید ہونے پر مغرب میں ایمان کی کمی کے اظہار کے لیے اووڈ(Ovid) کی اس میٹامارفوسس(Matamorphoses) کو لیا جا سکتا ہے جسے لیوٹیکس(Leviticus) کے منتخب اشعار سے سجایا گیا ہے۔

لین جن کا پیغام ایسی ہی تصویر کشی سے عبارت ہے، ایک مختلف سیاق وسباق میں یہ ایک بدوضع خاکہ دکھائی دے گا اور اگر بہت ہوا تو اسے ایسا حملہ قرار دیا جا سکے گا جو ناکام ہونے کے ساتھ ساتھ کوئی خاص نقصان پہنچانے کی اہلیت نہیں رکھتا، لین جن کا پیغام تو نفسیاتی حربے کے طور پر بھی موثر نہیں ہے کیونکہ اس سے مخالف کی نہیں، بلکہ لکھنے والے کی کمزوری زیادہ نمایاں ہوتی ہے، مثال کے طور پر اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف اپنے مخالفین کی تعداد سے گھبرایا ہوا ہے اور آئینے میں اسے اپنے عکس کے سوا کوئی دوسرا دکھائی ہی نہیں

دیتا، اس حالت میں یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس کے اندر ایرانی نکتہ نظر یا اسلامی انقلاب کو سمجھنے کی اہلیت رہ جائے، چنانچہ اس کیفیت کو اس ناقابل برداشت ایرانی جور و جبر کا براہ راست نتیجہ قرار دیا جا سکتا تھا جس میں جابرانہ حکومت کا تختہ الٹنے کی ضرورت ہے؟

جہاں تک مذاکراتی عمل کی دانشمندی کے ساتھ خیر سگالی اور اعتماد کا تعلق ہے اس سلسلے میں اگر 1953ء کے واقعات کا حوالہ نہیں دیا گیا پھر بھی اس کے متعلق بہت کچھ کہا جا سکتا ہے اور یہ بات بھی سامنے لائی جا سکتی ہے کہ جنوری 1979ء میں امریکی جنرل ہوسر (Huyser) نے ایرانی انقلاب کو ناکام بنانے کے لیے فوج کو اکسانے کی بھی کوشش کی تھی، پھر وہ مختلف امریکی بینک جو شاہ کی خوشنودی کے لیے اپنے قواعد وضوابط میں لچک پیدا کرنے تک کو تیار رہتے تھے، انھوں نے 1979ء میں ایران کے 1977ء میں جاری ہونے والے وہ قرضے اس بنیاد پر منسوخ کر دیے تھے کہ سود کی ادائیگی بروقت نہیں کی گئی، اس سلسلے میں لی مونڈے (Le Monde) کے ایرک رولی(Eric Rouleau) نے 25 اور 26 نومبر 1979ء کو اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ اس نے خود یہ ثبوت دیکھا ہے کہ ایران نے یہ سود وقت سے پہلے ادا کر دیا تھا، اگر اس صورت حال میں ''ایران'' یہ سمجھتا ہے کہ اس کے بالکل سامنے جو کھڑا ہے وہ اس کا دشمن ہے تو یہ کوئی غلط بات نہیں ہے، لین جن نے بھی بڑے واضح انداز میں کہا ہے کہ ایران نہ صرف ایک دشمن ہے بلکہ غیر محفوظ بھی ہے۔

تاہم ہمیں تسلیم کرنا چاہیے کہ مسئلہ منصف مزاجی کا نہیں بلکہ درست انداز میں پیش کرنے کا ہے، اور سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ جو امریکی موقع پر موجود ہیں اور واشنگٹن کو مشورے دے رہے ہیں، یہ مشیر اپنی معلومات کے لیے کس پر انحصار کر رہے ہیں؟ کیا وہ مستشرقین کی ان کہانیوں پر انحصار کر رہے ہیں جو سر الفریڈ لائل (Sir Alfred Lyall) کی ان تحریروں سے لی جا سکتی ہے جن میں انھوں نے مشرقی ذہن کو بیان کیا ہے یا لارڈ کرومر (Lord Cromer) کی اس کتاب سے لیا جا سکتا ہے جس میں اس نے بتایا ہے کہ مصریوں کے ساتھ کس طرح معاملہ کرنا چاہیے، اگر لین جن کے مطابق ابراہیم یزدی جو اس وقت ایران کے وزیر خارجہ تھے اس خیال کی مخالفت کرتے ہیں کہ ''امریکا میں ایران کے متعلق جو تاثر پایا جاتا ہے اس کی وجہ ایرانی طرز عمل ہے'' تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فیصلے کرنے والوں میں کون سا امریکی تھا جو اس بات کو پہلے سے قبول کرنے کو تیار تھا کہ امریکی طرز عمل نے ایران میں امریکا کے متعلق تاثر قائم کیا ہے؟ پھر شاہ کو امریکا میں آنے کی اجازت کیوں دی گئی؟ یا کیا ایرانیوں کی طرح امریکی بھی ''اپنے اقدامات کی ذمہ داری قبول کرنے سے گریز کرتے ہیں''؟

لین جن کا پیغام اس قوت کی پیداوار ہے جو بے خبر ہی نہیں بلکہ عقل و دانش سے عاری بھی ہے اور اس پیغام کو پڑھ کر یقیناً دوسرے معاشروں کے متعلق معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا پھر اس پیغام کے ذریعے جس طرح یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ امریکا کو کس طرح دنیا کا سامنا کرنا چاہیے اس سے وہ مقصد بھی پورا نہیں ہوتا اور نہ اس سے اعتماد پیدا ہوتا ہے، پھر اس میں جس طرح امریکا کی تصویر کشی کی گئی ہے وہ تمام تر تعریف و توصیف کے باوجود ہتک آمیز معلوم ہوتی ہے، ان سب باتوں کے بعد اس کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے؟ یہ پیغام ہمیں بتاتا ہے کہ کس طرح امریکا کے نمائندوں اور ان کے ساتھ کسی حد تک مستشرقین کے ادارے نے مل کر ایک ایسی حقیقت کو جنم دیا جس کا نہ تو ہماری دنیا اور نہ ایران سے ہی کوئی تعلق بنتا تھا، لیکن اگر اس سے یہ احساس اجاگر نہیں ہوتا کہ اس واقعہ کے متعلق جس قدر غلط بیانی کی گئی ہے اسے ہمیشہ کے لیے اٹھا کر پھینک دینا چاہیے تو امریکیوں کو مزید عالمی مشکلات کے لیے تیار رہنا چاہیے، اور یہ بات بڑی افسوسناک ہے کہ امریکیوں کی معصومیت کو بلاوجہ مجروح کیا جائے گا۔

ہم اس بات کو تسلیم کر لیتے ہیں کہ ایران اور امریکا بڑے تکلیف دہ اور ناخوشگوار حالات سے گزرے ہیں اور یہ بھی مان لیتے ہیں کہ امریکی سفارتخانے پر قبضہ کرنے کے نتیجے میں ایران ایک ایسی افراتفری میں دھنس گیا ہے جس سے کچھ حاصل وصول نہیں ہوگا اور جو اسے پسماندگی کی طرف دھکیل رہی ہے۔ تاہم اس بات کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ دلجمعی کے ساتھ حالیہ تاریخ سے اس دانشمندی کو چن کر الگ کر لیا جائے جو پہلے ہی برائے نام ہے، ایسا کرنا اس لیے بہتر ہے کیونکہ ''اسلام'' میں بھی اسی طرح کی تبدیلیاں آ رہی ہیں جس طرح کی ''مغرب'' میں رونما ہو رہی ہیں، تاہم ان دونوں کے طریقے اور رفتار ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن ان کے کچھ خدشات اور شکوک و شبہات ایک جیسے ہیں، ''اسلام'' اور مغرب، خاص طور پر ''امریکا'' کے حلقہ اثر میں جو چیخ و پکار بلند ہو رہی ہے اس سے دانشمندی کی بجائے اشتعال زیادہ پھیل رہا ہے، نئے حقائق سے مطابقت کا پیدا نہ ہونا اور نامطابقت کے برابر اور مخالف ردعمل کا ابھرنا، اس خدشے کو بڑھا رہا ہے کہ ''اسلام'' اور ''مغرب'' تجزیے کو تنازع میں اور تجربات کو توہمات میں بدل سکتے ہیں، دراصل ضرورت اس بات کی ہے کہ انسانی تجربات سے حاصل ہونے والی ٹھوس معلومات اور دوسروں کا ہمدردی سے جائزہ لینے سے حاصل ہونے والی سوجھ بوجھ کا احترام کیا جائے اخلاقی حدود میں رہتے ہوئے اور علمی دیانت کو کام میں لاتے ہوئے علم حاصل کیا جائے، یقیناً یہ آسان کام نہیں ہے لیکن ایک دوسرے سے ٹکرانے اور جارحیت کو

اپنانے کی بہ نسبت زیادہ بہتر اہداف ہیں، اگر اس عمل سے گزرتے ہوئے ہم اس نفرت سے جو دلوں میں بیٹھ چکی ہے اور ''مسلم'' ''ایرانی'' ''ترک'' ''عرب'' یا ''مغربی'' جیسے ناگوار لیبلوں سے چھٹکارا حاصل کر لیں تو یہ بہت بہتر ہوگا۔

ای ڈبلیو ایس

9/فروری 1981ء نیویارک

بابِ اوّل

اسلام خبروں میں

باب اوّل

اسلام اور مغرب

(حصہ اوّل)

ہم اپنی بات کو 1980ء میں اس وقت سے شروع کرتے ہیں جب نیویارک کے ایک تجارتی ادارے کنسالیڈیٹڈ ایڈیسن[1] (Consolidated Edison) نے جس کا نام اختصار سے کون ایڈ بنتا ہے ٹیلی وژن پر ایک غیر معمولی اشتہار دیا، بظاہر اس اشتہار کا مقصد امریکیوں کے لیے توانائی کے متبادل ذرائع پر لوگوں کی توجہ مرکوز کرنا تھا مگر اس اشتہار میں فلم کے جو ٹکڑے لگائے گئے تھے ان میں اوپیک کی ایسی شخصیات کو شامل کیا گیا تھا جنھیں فوری طور پر شناخت کر لینا کچھ مشکل نہ تھا، ان میں یمانی تھے، قذافی اور ان سے کم رتبے کے اصحاب تھے، ان سب کو عربی چوغے میں دکھایا گیا تھا، اس ابتدائیے کے بعد جب منظر بدلا تو تصویروں اور فلم کے ٹکڑوں کے ملاپ سے جو شخصیات ابھر کر سامنے آئیں ان میں خمینی، عرفات، حافظ الاسد شامل تھے اور ان سب کو تیل اور اسلام کی نمائندہ شخصیات کے طور پر پیش کیا گیا تھا، مگر اشارتاً یہ بات واضح کر دی گئی تھی کہ امریکا کے تیل کے وسائل پر ان قوتوں ہی کا کنٹرول ہے، فلم کے پس منظر سے جو سنجیدہ آواز ابھر رہی تھی اس نے یہ تو نہیں بتایا کہ پیش منظر میں دکھائی دینے والے لوگ کون ہیں یا کہاں سے آئے ہیں لیکن اپنے الفاظ سے دیکھنے والوں میں یہ احساس ضرور اجاگر کیا کہ یہ تمام حضرات وہ بدمعاش ہیں جنھوں نے امریکا کو ایسی اذیت ناک گرفت میں لے رکھا ہے جس کا کوئی توڑ نہیں ہے، کون ایڈ کا مقصد اس اشتہار کے ذریعے امریکیوں میں غصے، تاسف اور خوف کے ملے جلے جذبات کو ابھار کر تجارتی مفادات حاصل کرنا تھا، اس میں اسے اس لیے کامیابی ہوئی کہ فلم میں جن شخصیات کو دکھایا گیا تھا ان کا اخباروں یا ٹیلی وژن پر اس طرح نظر آنا جیسے اس اشتہار میں دکھایا گیا ہے امریکیوں کو مشتعل کرنے کے لیے کافی ہے، جذبوں کی اس بات کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک سال پہلے سٹوارٹ ائزن سٹاٹ (Sturart Eizenstat) نے جو صدر کارٹر کے داخلہ پالیسی کے مشیر تھے اور اب کلنٹن انتظامیہ میں سینئر افسر ہیں، صدر کارٹر کو مشورہ دیا تھا کہ ''ہمیں سخت اقدامات کے ذریعے قوم کو حقیقی بحران کے لیے تیار کرنا اور اوپیک کے رکن ممالک کو واضح طور پر دشمن قرار دینا چاہیے''۔

1۔ نیویارک اور اس سے ملحقہ علاقے کو بجلی اور گیس سپلائی کرنے والی کمپنی جس کے اثاثے 27 ارب ڈالر اور سالانہ آمدنی ایک ارب بیس کروڑ ڈالر کے لگ بھگ ہے، یہ کمپنی انیسویں صدی کے شروع میں قائم ہوئی تھی۔ (مترجم)

کون ایڈ کے اشتہار میں دو باتیں ایسی ہیں، جن کا اس کتاب کے موضوع سے تعلق بنتا ہے، ان میں سے ایک تو اسلام یا اسلام کا وہ تصور ہے جو مغرب اور خاص طور پر امریکا میں عام ہے، دوسرا مغرب اور بالخصوص امریکا میں اس تصور کو استعمال کرنے کا انداز ہے، آگے چل کر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ ان کے ذریعے بڑے بودے اور غیر دلچسپ انداز میں جس قدر انکشافات اسلام کے متعلق کیے جاتے ہیں اتنے ہی ان سے مغرب اور امریکا کے متعلق انکشافات ہو جاتے ہیں، مگر اس موجودہ صورت حال کا تجزیہ کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ اسلام اور مسیحی مغرب کے تعلقات کی تاریخ کا جائزہ لے لیا جائے۔

کم از کم اٹھارھویں صدی کے آخر سے لے کر ہمارے آج کے دور تک اسلام کے متعلق سوچنے کا جو انتہا پسندانہ انداز چلا آ رہا ہے اُسے آسان زبان میں علوم شرقیہ کا نام دیا گیا ہے، اس علم کے ماہرین کی سوچ کی بنیاد خیالی ہے، ان کے انداز میں کوئی لچک نہیں ہے اور انھوں نے انتہائی بے رحمی سے دنیا کو دو غیر مساوی حصوں میں تقسیم کر دیا ہے، ان دو حصوں میں سے بڑا حصہ جسے دوسروں سے ''مختلف'' قرار دیا جاتا ہے اُسے مشرق کہتے ہیں، جبکہ دوسرا حصہ جسے یہ ''ہماری'' دنیا کہتے ہیں افرنگ یا مغرب کہلاتا ہے، اس نوعیت کی تقسیم ہمیشہ اُس وقت وجود میں آتی ہے جب ایک سوسائٹی یا کلچر کا اپنے سے مختلف کسی دوسرے کلچر کے ساتھ موازنہ کرنا مقصود ہوتا ہے، چنانچہ مشرق اور مغرب کا جب یہ ماہرین موازنہ کرتے ہیں تو مشرق کو یہ لوگ جہاں دنیا کا انتہائی کمتر حصہ گردانتے ہیں وہاں اِسے مقابلتاً بڑا حصہ قرار دیتے ہوئے یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مغرب کے مقابلے میں مشرق میں طاقتور بننے، خاص طور پر تباہی کی قوت بننے، کی صلاحیت زیادہ ہے، یہ مستشرقین اسلام کو ہمیشہ مشرق کا حصہ قرار دیتے ہیں اور مشرقی ڈھانچے کی بات کرتے ہوئے، جب یہ اسلام تک آتے ہیں تو اُس کا پہلے اس طرح ذکر کرتے ہیں جس طرح یہ کوئی پتھر کے زمانے کی چیز ہو، پھر اس سے خوف اور نفرت کو باندھتے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ اِس اندازِ فکر کی کئی مذہبی، نفسیاتی اور سیاسی وجوہ ہیں لیکن یہ تمام وجوہ اس احساس سے پھوٹتی ہیں کہ اسلام نہ صرف مغرب کا زبردست مدِ مقابل ہے بلکہ عیسائیت کے خلاف بھی آخری چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔

قرونِ وسطیٰ کے زیادہ تر عرصے میں اور یورپ کی بیداری کے ابتدائی دور میں مغرب کا تاثر یہ تھا کہ اسلام تاریکی میں ڈوبے ہوئے مرتدوں اور کلمۂ کفر کہنے والوں کا شیطانی مذہب ہے، اُن کے اس خیال پر اس بات کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا تھا کہ مسلمان محمد (ﷺ) کو خدا نہیں بلکہ صرف پیغمبر سمجھتے ہیں، جبکہ عیسائی انھیں

پیغمبر کا درجہ بھی دینے کے قائل نہیں، محمد (ﷺ) کے متعلق اُن کی سوچ نظریاتی نہیں تھی تاہم حقیقی دنیا میں رونما ہونے والے واقعات نے اسلام کو ایک ایسی قوت بنا دیا تھا کہ جسے تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہیں رہا تھا، اس میں کچھ کلام نہیں کہ مسلم افواج[1] اور بحریہ صدیوں تک یورپ کے لیے خطرہ بنی رہی ہیں، انھوں نے یورپ سے باہر ان کی چوکیوں کو تباہ کر دیا اور اُن کے باجگزار علاقوں کو اپنی نو آبادی بنا لیا، اس سارے منظر نامے کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے عیسائیت کی ایک تازہ لہر، پورے جوش، جذبے اور قوت کے ساتھ مشرق سے اٹھی ہے، اس نے اپنے اندر قدیم یونان کے علوم کو سمیٹ رکھا ہے اور خود کو سادہ، بے خوف اور جنگی عقائد سے لیس بھی کر لیا ہے، یہ تازہ لہر موجودہ عیسائیت کو تباہ کرنے کی طرف بڑھ رہی ہے، انتہا یہ ہے کہ جس وقت اسلامی دنیا زوال پذیر تھی اور یورپ نے عروج کی طرف قدم بڑھانا شروع کر دیے تھے اُس وقت بھی محمڈن ازم کا خوف بدستور طاری تھا، اسلام دوسرے غیر مسیحی مذاہب کی بہ نسبت یورپ کے زیادہ قریب تھا، پھر اسلامی دنیا کا یورپ سے متصل ہونا، ان یادوں کو مسلسل رکھے ہوئے ہے کہ مسلمانوں نے اپنی حدوں سے باہر نکل کر یورپی نو آبادیات پر قبضہ کر لیا تھا اور یورپ کو مسلسل پریشان رکھا تھا، مشرق کی دوسری بڑی تہذیبوں جن میں چین اور ہندوستان شامل ہیں، ان کے متعلق یورپ میں ایسا پریشان کرنے والا تاثر کبھی نہیں ابھرا، انھیں تو شکست خوردہ اور یورپ سے دور ایسے ممالک سمجھا جاتا ہے، جو کبھی یورپ کے لیے مسلسل سر دردی کا باعث نہیں بن سکتے، لیکن اسلام کے متعلق یہ بات واضح ہے کہ اس نے کبھی مکمل طور پر خود کو یورپ کے حوالے نہیں کیا، چنانچہ جب 1970ء کے اوائل میں تیل کی قیمتوں میں اچانک ڈرامائی اضافہ ہوا، تو پورا یورپ کانپ اٹھا اور یوں سمجھا گیا کہ اسلامی دنیا ایک بار پھر اپنی سابقہ فتوحات کو دہرانے کے قریب آن پہنچی ہے، اِسی طرح 1980ء اور 1990ء کی دہائیوں میں ''اسلامی دہشت گردی'' نے یورپ کے خوف کو مزید گہرا کر دیا ہے۔

پھر 1978ء سے ایران نے مرکزی حیثیت حاصل کر لی، جس سے امریکی بہت پریشان اور جذباتی ہو رہے ہیں، امریکا سے دور اور مختلف چند ہی اقوام ایسی ہیں جنھوں نے امریکیوں کو اِس طرح گھیرا ہو گا، امریکی کبھی اتنے مفلوج نہیں ہوئے اور نہ ڈرامائی انداز میں رونما ہونے والے واقعات سے نمٹنے میں یوں بے بس دکھائی دیے ہیں، جتنا کہ ایران نے انھیں مفلوج اور بے بس کر رکھا ہے، یہ ملک دھڑلے کے ساتھ دخل اندازی کرتے ہوئے امریکیوں کی زندگی کی مختلف سطحوں سے اِس طرح متصادم ہے کہ امریکی ایران کو اپنے

1۔ مسلمانوں نے مغرب کے مغربی حصے میں سپین اور وسطی حصے میں بوسنیا تک کے علاقے کو اپنی مملکت کا حصہ بنا لیا تھا اور خیر الدین باربروسا کے زمانے میں بحیرۂ روم پر مسلم بحریہ کی مکمل حکمرانی تھی مسلمانوں کا یہ زور انیسویں صدی تک قائم رہا مگر اس میں زوال اسی وقت آنا شروع ہو گیا تھا جب 1492ء میں سپین مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ (مترجم)

دماغ سے نکال ہی نہیں سکتے، اب دیکھیے ناں جس دور میں توانائی کے وسائل کی قلت تھی اُس زمانے میں ایران کا شمار تیل سپلائی کرنے والے بڑے ممالک میں ہوتا تھا، پھر ایران دنیا کے ایسے حصے میں واقع ہے جو نہ صرف جنگی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے بلکہ متلاطم بھی ہے، ایک زمانے میں یہ امریکا کا بڑا اہم اتحادی تھا، پھر یہاں شہنشاہیت ختم ہوئی، اس کی پہلے والی فوج نہ رہی، پھر اکتوبر 1917ء کے بعد اتنے بڑے پیمانے پر انقلاب آیا کہ اِس کی مثال نہیں ملتی، امریکا نے دنیا کی جو درجہ بندی کر رکھی تھی، اس انقلاب نے ایک برس تک جو انقلابی اقدامات کیے، اُن سے اُس درجہ بندی میں ایران کی حیثیت کم ہو گئی اور اسلامی نظام نے جو شہنشاہیت کا مخالف اور بڑی حد تک ایران میں مقبول عام تھا، وجود میں آنے کی جدوجہد شروع کر دی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ، مغربی میڈیا پر آیت اللہ خمینی کی شبیہ چھا گئی مگر ان کے متعلق اِس کے سوا کچھ نہ کہا جا سکا کہ وہ بڑے ہٹ دھرم، بہت طاقتور ہیں اور امریکا سے بہت زیادہ خفا ہیں، ان سب باتوں کا آخر یہ نتیجہ نکلا کہ جب سابق شاہ نے 22/اکتوبر 1979ء کو امریکا میں قدم رکھا تو 4/نومبر کو طلبہ کے ایک گروپ نے تہران میں امریکی سفارتخانے پر قبضہ کر لیا، کئی امریکی یرغمال بنا لیے گئے اور کئی ماہ بعد اُن کی رہائی ممکن ہوئی۔

ایران میں جو واقعات پیش آئے، ان پر ظاہر ہونے والا ردِعمل کسی خلا سے وجود میں نہیں آیا تھا، بلکہ اسلام، عربوں اور عمومی طور پر مشرق جسے میں شرق شناسی کہتا رہا ہوں کے بارے میں اُس رویے نے اِس خیال کو جنم دیا جو ثقافتی حوالے سے لوگوں کے تحت الشعور میں ایک عرصے سے بہت گہرائی پر کہیں موجود تھا، اگر ہم دی ایس نائے پال (V.S.Naipaul) کا ناول ''دریا میں ایک موڑ'' (The Bend in the River) یا جان اُپ ڈائیک (John Updike) کا ناول ''انقلاب'' (The Coup) دیکھیں یا سکولوں میں تاریخ کی کتابوں پر نظر ڈالیں، مزاحیہ چٹکلوں، ٹیلی وژن کے سلسلہ وار پروگراموں، فلموں اور کارٹونوں کی طرف آئیں تو ہمیں اِن سب میں اسلام کی ایک جیسی تصویر ملے گی، سب جگہ ایک ہی منظر دکھائی دے گا، دراصل اِن سب تخلیقات میں اسلام کے متعلق مدتوں سے قائم طرزِ فکر کو بنیاد بنایا گیا ہے، اس لیے مسلمانوں کے ایسے تصویری خاکے سامنے آ گئے ہیں جن میں انھیں تیل سپلائی کرنے والے، دہشت گرد اور دوسروں کے خون کے پیاسے دکھایا جاتا ہے، دراصل مغربی باشندے یہ یقین رکھتے ہیں کہ مغرب سے ہٹ کر جس قدر لوگ دوسرے علاقوں میں رہتے ہیں اُن کا تہذیب و ثقافت سے برائے نام تعلق ہے، چنانچہ بحث مباحثوں اور تحریروں میں غیر مغربی باشندوں کے لیے بہت کم گنجایش رکھی گئی ہے، اِسی طرح اسلام اور اسلام سے متعلق چیزوں پر گفتگو کرتے ہوئے، سوچتے ہوئے اور ان کی نقشہ کشی کرتے ہوئے ہمدردی کا عنصر کہیں دکھائی نہیں دیتا، بلکہ اہل مغرب کی لاتعلقی کا یہ عالم ہے کہ

اگر اُن سے کہا جائے کہ وہ کسی مسلمان مصنف کا نام لیں تو ان کی اکثریت صرف خلیل جبران کا نام لے سکے گی (خلیل جبران مسلمان مصنف نہیں ہے)، عام لوگوں سے ہٹ کر اگر ان ماہرین کو لیا جائے، اسلام جن کا خاص موضوع ہے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ انھوں نے اِس مذہب اور اِس سے متعلق مختلف ثقافتوں کو جذبات کے ایک ایسے نظریاتی دائرے میں سمیٹ کر بیان کیا ہے جس نظریے کو انھوں نے خود ایجاد کیا اور جس کے ثقافتی اصول انھوں نے پہلے سے ہی طے کیے ہوئے ہیں، چنانچہ اِن کی تحریروں میں مدافعانہ تعصب بھی ملتا ہے اور بعض اوقات شدید نفرت بھی چھلکنے لگتی ہے، اِس نظریاتی دائرے کی بدولت اسلام کے متعلق سوجھ بوجھ پیدا کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے، اب اگر ان مطالعاتی رپورٹوں کو لیا جائے جو میڈیا نے بڑی عرق ریزی کے بعد ایرانی انقلاب پر تیار کی تھیں اور اُن انٹرویوز کو دیکھا جائے جو اِس سلسلے میں پیش کیے گئے تھے تو موسم بہار 1979ء کی اِن پیشکشوں سے ہمیں نہ تو امریکا کی شکست کا کوئی تاثر ملتا ہے اور نہ یہ بات سامنے آتی ہے کہ ایرانی انقلاب سے علاقے میں ایک اہم تبدیلی رونما ہوئی ہے ان مطالعاتی رپورٹوں میں تو یہ سوچ بھی نہیں ملتی کہ تاریکی پر روشنی نے فتح پائی ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ایرانی انقلاب نے اس خطے میں امریکا کو واضح شکست سے دوچار کیا ہے۔

امریکی میڈیا پر ایران کے خلاف گفتگو کا سلسلہ 1990ء تک جاری رہا، اُس کے بعد جب سرد جنگ ختم ہو گئی تو ایران کے ساتھ ''اسلام'' کو بھی امریکا کے لیے بڑا بیرونی خطرہ قرار دے دیا گیا، ایران کو اس لیے دہشت گرد ریاست قرار دیا جاتا ہے، کیونکہ یہ جنوبی لبنان میں حزب اللہ جیسے گروپوں کی پشت پناہی کرتا ہے، حزب اللہ لبنان پر اسرائیلی حملے کے بعد قائم کی گئی تھی اور اس کا بنیادی مقصد جنوبی لبنان کے اس علاقے کو لڑ کر آزاد کرانا تھا جس پر اسرائیل نے قبضہ کر رکھا ہے، اصل تکلیف اِسی بات کی تھی اور اِسی حوالے سے ایران پر دنیا میں بنیاد پرستی پھیلانے کا الزام عائد ہوا لیکن اِس ملک کا خوف طاری ہونے کی وجہ مشرقِ وسطیٰ خاص طور پر خلیج میں امریکا کی بالادستی کے خلاف اِس کی نہ جھکنے والی مزاحمت بنتی ہے، رابن رائٹ (Robin Wright) لاس اینجلس ٹائمز (Los Angeles Times) میں لکھتا ہے اور اِس اخبار میں اسلام کا سب سے اہم ماہر ہے، اس نے اپنے 26/جنوری 1991ء کے کالم میں لکھا ہے کہ امریکا اور مغرب کی دوسری حکومتوں کے کارپرداز ''اسلامی چیلنج'' کا مقابلہ کرنے کے لیے ابھی تک حکمتِ عملی کی تلاش میں ہیں، انھوں نے بش انتظامیہ کے ایک سینئر افسر کا نام ظاہر کیے بغیر اپنے اس کالم میں بتایا کہ اُس افسر کا کہنا ہے کہ ''تیس سے چالیس سال پہلے کمیونزم کے ساتھ جس ہوشیاری سے مقابلہ کیا گیا تھا، اسلام سے مقابلے میں اُس سے زیادہ ہوشیاری دکھانا ہو

گی'' اس خاتون کا مضمون پانچ کالم پر مشتمل تھا اُس میں مسلم ممالک کی ایک لمبی چوڑی فہرست کے متعلق یہ اشارہ تو کیا گیا تھا کہ انھیں آسان سمجھنے کی غلطی نہ کی جائے مگر اس تبصرے میں تصویر صرف آیت اللہ خمینی کی لگائی گئی تھی، مضمون نگار کی رائے میں آیت اللہ خمینی اور ایران دونوں کے اندر وہ تمام چیزیں موجود تھیں، جن پر اسلام کے حوالے سے اعتراض کیا جاتا ہے۔ دہشت گردی، مغربیت کی مخالفت کو ایران اور آیت اللہ خمینی سے جوڑتے ہوئے وہ لکھتی ہے کہ ''بڑی توحید پرست اقوام میں ایران واحد ملک ہے، جہاں نہ صرف سوسائٹی پر ایک ضابطے کے تحت حکومت کی جاتی ہے، بلکہ جہاں روحانی عقائد بھی منضبط ہیں'' اس تبصرے میں اس بات کا ذکر نہیں کیا گیا کہ خود ایران کے اندر یہ بحث جاری ہے کہ سوسائٹی کے لیے جو ضابطے نافذ ہیں، وہ کیا ہیں اور اس پر بھی گفتگو ہو رہی ہے کہ اسلام حقیقت میں کیا ہے، رائٹ نے اُس بحث کا ذکر بھی نہیں کیا، جس میں (امام) خمینی کی وراثت پر اعتراض ہو رہے ہیں، اُس کے نزدیک اتنا ہی کافی تھا کہ عالمی سطح پر امریکی جن امور کے متعلق فکر مند ہیں انھیں اسلام کے گرد لپیٹ دیا جائے، یہ طرزِ عمل جہاں خود بڑا سنگین ہے وہاں کلنٹن انتظامیہ نے ایک ایسا قانون منظور کر کے اِسے سنگین تر بنا دیا کہ جو ملک ایران کے ساتھ کاروبار کریں گے، انھیں امریکا اپنے عتاب کا نشانہ بنائے گا، کاروبار سے متعلق امریکا کی یہ ممانعت لیبیا اور کیوبا کے لیے بھی تھی۔

وی ایس نائے پال نے اسلام سے عام دشمنی کو واضح کیا ہے اور اس کا یہ کردار دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ اس کا ایک مضمون نیوز ویک انٹرنیشنل (Newsweek International) میں 18 / اگست 1980ء کو شائع ہوا ہے، اس میں اس نے بتایا ہے کہ وہ ''اسلام'' پر ایک کتاب لکھ رہا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ ''بنیاد پرستی کا کوئی عقلی جواز نہیں ہے، اس لیے اِس الزام کا ختم ہو جانا لازم ہے'' اُس نے اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ وہ خاص طور پر کس بنیاد پرستی کا ذکر کر رہا ہے اور اس کے ذہن میں کس نوعیت کا عقلی جواز ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اُس کا اشارہ ایران کی طرف تھا لیکن یہ اشارہ بھی اُس نے بڑے مبہم انداز میں کیا ہے۔ اُس نے شہنشاہیت کے خلاف تیسری دنیا میں اٹھنے والی لہر کا ذکر بھی بڑے مبہم انداز میں کیا ہے، اس لہر کے متعلق نائے پال نے اپنے آپ میں ایک ایسی شدید مخالفت پال لی ہے کہ اُس کے ناول ''خدا پرستوں کے درمیان ایک اسلامی سفر'' (Among the Believers : An Islamic Journey) میں اس عداوت کا واضح اظہار ملتا ہے، ''چھاپہ مار'' (Guerrillas) اور ''دریا میں ایک موڑ'' نائے پال کے تازہ ترین ناول ہیں، ان میں اسلام کا خاکہ اڑایا گیا ہے، نائے پال نے تیسری دنیا کے متعلق جن الزامات کو اپنے ناولوں کا عمومی حصہ بنایا ہے، وہ آزاد مغرب کے قارئین میں بڑے مقبول ہیں، ان الزامات کو ابھارنے کے لیے وہ چند بدچلن حکمرانوں کے کردار کو

پوری نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے دور سے جوڑ کر پیش کرتا ہے اور افریقہ اور ایشیا میں عقل و دانش کی ناکامی کا تاثر قائم کرنے کے لیے وہ نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد مقامی سوسائٹیوں کی تعمیر کی کوششوں کو مثال بناتا ہے، نائے پال کا فلسفہ یہ ہے کہ مغربی ہند کے قابلِ رحم چھاپہ مار چاہے اپنی کارروائیوں کے لیے اسلام کا نام استعمال کریں، چاہے افریقی غلاموں کی تجارت کا معاملہ ہو، اِن سب میں اسلام ایک بنیادی کردار ادا کرتا ہے، نائے پال اور اُس کے قارئین کے نزدیک ہر اُس چیز کا الزام ''اسلام'' پر دھرا جا سکتا ہے جو مہذب مغربی دانش کے لیے انتہائی ناپسندیدہ ہے۔

یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے مذہبی جذبوں، جائز مقصد کے لیے جدوجہد، عام انسانی کمزوریوں، سیاسی مقابلے اور مردوں، عورتوں اور معاشروں کی تاریخ کے درمیان امتیاز کو اُس وقت تک مردوں، عورتوں اور معاشروں کی تاریخ کے تناظر میں نہیں پرکھا جا سکتا جب تک کہ ایران اور مسلم دنیا کے دوسرے حصوں میں رائج اسلام کی وضاحت ناول نگار، رپورٹر، پالیسی ساز اور ماہرین نہ کر دیں، یوں معلوم ہوتا ہے کہ ''اسلام'' نے مسلم دنیا کے تمام متنوع پہلوؤں کو اپنے اندر سمو لیا ہے اور ان سے ایک ایسا جوہر تیار کر لیا ہے جو بد باطن اور ناقابل فہم ہے، مغرب نے اسلام کا تجزیہ کرنے اور اُسے سمجھنے کے بجائے، ''ہم بمقابلہ وہ'' کی انتہائی خام ترکیب اختیار کر لی ہے، نتیجہ یہ ہے کہ ایران یا مسلمان اپنے تصورِ انصاف، مظلومیت کی اپنی تاریخ اور اپنے معاشروں کے متعلق جس نکتہ نظر کو بیان کرتے ہیں اُسے کوئی اہمیت نہیں دی جاتی، بلکہ امریکا کے نزدیک اہم بات یہ بنتی ہے کہ اِس وقت ''اسلامی انقلاب'' کے زیر اثر کیا ہو رہا ہے۔ کمیتہ (Komitehs) نے کتنے لوگوں کو قتل کر دیا ہے، آیت اللہ اسلام کے نام پر کتنے اشتعال انگیز احکامات صادر کرتا ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جونز ٹاؤن کے قتل عام یا اوکلاہوما پر بمباری سے ہونے والی خوفناک تباہی یا انڈوچائنا کی بربادی کی ذمہ داری تو اس شدومد کے ساتھ عیسائیت، مغربی یا امریکی ثقافت پر عائد نہیں کی جاتی، اس نوعیت کی ذمہ داریوں کے متعلق جو سوچ ابھاری گئی ہے اُس سے اس نوعیت کے معاملات کی ذمہ داری صرف اسلام پر ہی عائد کی جا سکتی ہے۔

آخر ایسا کیوں ہے کہ سیاسی، ثقافتی، سماجی اور اقتصادی واقعات کو آسانی کے ساتھ اسلام کے کھاتے میں ڈالا جا سکتا ہے؟ اسلام میں ایسا کیا ہے کہ جس سے بڑی جلدی اشتعال پیدا ہو جاتا ہے اور اِس ردِعمل کو کیوں لگام نہیں دی جا سکتی؟ سوال یہ ہے کہ ''اسلام'' اور اسلامی دنیا کس طرح مغرب والوں کے لیے تیسری دنیا کے دوسرے ممالک سے اور سرد جنگ کے زمانے کے سوویت یونین سے مختلف ہے؟ یہ آسان سوال نہیں ہیں، اس لیے ان میں سے ہر ایک کا جواب الگ الگ دینا ہوگا اور اس میں کئی دلائل آئیں گے اور

کئی امتیازی صورتیں بنیں گی۔

بہت بڑی اور نہایت پیچیدہ حقیقتوں کو جو لیبل دیے جاتے ہیں وہ شرمناک حد تک غیر واضح ہوتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ ناگزیر بھی ہوتے ہیں اگر یہ بات درست ہے کہ ''اسلام'' ایک ایسا لیبل ہے جس میں غلط سلط باتوں اور نظریات کی بھرمار کر دی گئی ہے تو یہ بات بھی درست ٹھہرتی ہے کہ ''مغرب'' اور ''عیسائیت'' بھی ہنگامے کھڑے والوں میں سے ہیں، ان ہر دو لیبلوں اور ان جیسے دوسرے لیبلوں سے بچ نکلنے کا کوئی آسان طریقہ نہیں ہے کیونکہ مسلمان اسلام کی اچھائی بیان کرتے ہیں، عیسائی، عیسائیت کی، اہلِ مغرب اپنے مغرب کی، یہودی، یہودیت کی اور یہ سب دوسروں کے متعلق ایسی باتیں کرتے ہیں جو مدلل بھی ہوتی ہیں اور درست بھی معلوم ہوتی ہیں، چنانچہ ہمیں اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیے کہ یہ لیبل نہ صرف موجود ہیں، بلکہ ثقافتی تاریخ کا ایک حصہ بھی بن چکے ہیں، اس لیے ان سے بچ نکلنے کی ترکیبیں تجویز کرنے کے بجائے ان کی مقصدیت پر غور کرنا زیادہ بہتر ہوگا، اس باب میں آگے چل کر میں اُن لیبلوں کی تشریحات پر بات کروں گا جنھیں تشریح کرنے والے گروہوں نے اپنے دفاع اور ایک دوسرے کی مخالفت میں وضع کیا ہے، ان لیبلوں کو دیکھتے ہوئے ہمیں یہ بات سمجھ لینا چاہیے کہ ''اسلام'' ''مغرب'' اور ''عیسائیت'' کے الفاظ کم از کم دو مختلف سطحوں پر کام کرتے ہیں اور جب ان الفاظ کا استعمال ہوتا ہے، ان سے کم از کم دو مختلف معنی پیدا ہوتے ہیں، سب سے پہلے یہ الفاظ سادہ تعارف پیش کرتے ہیں، مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ خمینی ایک مسلمان ہیں یا پوپ جان پال دوم ایک عیسائی ہیں تو ہمارا یہ کہنا دوسری تمام باتوں کے برخلاف ایک مختلف تعارف بن جاتا ہے اور اس سے ہم ایک مسلمان اور ایک عیسائی کے درمیان اُسی طرح امتیاز کر سکتے ہیں جیسا کہ ہم ایک سنگترے اور ایک سیب کے درمیان کرتے ہیں۔ سنگترے اور سیب کے متعلق ہم جانتے ہیں کہ یہ دو مختلف پھل ہیں اور مختلف قسم کے درختوں پر اگتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

ان لیبلوں کا دوسرا کام یہ ہے کہ یہ زیادہ سے زیادہ پیچیدہ معنی پیدا کریں، جیسا کہ آج جب مغرب میں ''اسلام'' کی بات کی جاتی ہے تو اُس سے ذہنوں میں فوری طور پر، وہ ناگوار باتیں آ جاتی ہیں، جن کا میں ذکر کرتا آیا ہوں، پھر اس بات کا بہت کم امکان ہے کہ ''اسلام'' کے معنی وہی ہوں جو معنی کسی شخص نے براہ راست اور با مقصد طریقے سے اخذ کر لیے ہوں، یہی بات ''مغرب'' کے لیے بھی درست بیٹھتی ہے، سوچنے کی بات ہے کہ غصے یا بڑے دعوے کے ساتھ ان لیبلوں کو استعمال کرنے والے کتنے لوگ ایسے ہیں جو مغربی روایات یا اسلامی فلسفہ قانون یا اسلامی دنیا کی حقیقی زبانوں کے تمام پہلوؤں کو سمجھتے اور ان پر پوری

گرفت رکھتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ بہت کم لوگ اِس صلاحیت کے مالک ہیں، لیکن یہ کم علمی لوگوں کو پورے اعتماد کے ساتھ ''اسلام'' اور ''مغرب'' کا تجزیہ کرنے سے نہیں روکتی اور نہ اُن کو اس طرف لاتی ہے کہ وہ سوچیں کہ وہ کیا بات کر رہے ہیں۔

یہ وجوہ ان لیبلوں کو سنجیدگی کے ساتھ لینے کو لازم قرار دیتی ہیں، کیونکہ ایک مسلمان جو ''مغرب'' کے متعلق بات کرتا ہے یا ایک امریکی جو ''اسلام'' کی بات کرتا ہے اُس کے لیے دور تک پھیلی ہوئی عمومی باتیں اپنے اندر وہ پوری تاریخ رکھتی ہیں جو انھیں بیک وقت متحرک بھی کرتی ہے اور غیر متحرک بھی بنا دیتی ہے، یہ لیبل نظریات کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں پھر انھیں بڑے طاقتور جذبات وجود میں لائے ہیں، اس لیے ان میں نئے واقعات، اطلاعات اور حقائق سے مطابقت کرنے کی صلاحیت ہے، اِس وقت ''اسلام'' اور ''مغرب'' نے ہر جگہ ایک نئی ہنگامی صورت اختیار کر لی ہے، اس لیے ہمیں سب سے پہلے اس بات کو جان لینا چاہیے کہ اسلام کے مقابلے پر عیسائیت نہیں بلکہ مغرب ہے، ایسا کیوں ہے؟ ایسا اس لیے ہے کہ ''مغرب'' جہاں عیسائیت سے بڑا ہے، وہاں یہ اپنے بنیادی مذہب عیسائیت سے بہت آگے نکل چکا ہے جبکہ مختلف قسم کے معاشروں، مختلف تاریخ رکھنے والے ممالک اور مختلف زبانوں سے تشکیل پانے والی اسلامی دنیا ابھی تک مذہب، قدامت پرستی اور پسماندگی میں ڈوبی ہوئی ہے، اس لیے مغرب ماڈرن ہے، اپنے مختلف حصوں کے خیالات کے مجموعے سے بڑا ہے، اس میں ایسے تضادات بھرے پڑے ہیں جو سوچ کے کئی دروازے کھول دیتے ہیں اس کے باوجود اس کی ثقافتی شناخت ''مغرب'' ہے، دوسری طرف اسلامی دنیا ''اسلام'' سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں ہے، جس طرح مغرب میں تضادات اور مختلف نوعیت کے تجربات بکثرت ملتے ہیں اسی طرح تضادات اور مختلف نوعیت کے تجربات اسلامی دنیا میں سر اُٹھاتے ہیں مگر اسلامی دنیا کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ان تضادات اور تجربات کے نتائج کو گھٹا کر ان کے وجود کو اتنا مختصر کیا جا سکتا ہے کہ یہ برائے نام رہ جاتے ہیں۔

میں جو کہنا چاہتا ہوں اُس کی مثال اُس مضمون سے ملتی ہے جو سنڈے نیویارک ٹائمز کی 14 ستمبر 1980ء کے ''ہفتہ بھر کی خبروں کے جائزے'' میں شائع ہوا، یہ مضمون اُس جان کیفنر (John Kifner) کا لکھا ہوا ہے جو بیروت میں ٹائمز کا باصلاحیت نامہ نگار ہے اور اس مضمون میں اُس نے اس بات کو موضوع بنایا ہے کہ سوویت یونین کس حد تک مسلم دنیا پر چھا گیا ہے، اس مضمون کی سرخی ہے کہ ''مارکس اور مسجد ایک دوسرے کے لیے پہلے سے بھی زیادہ ناموافق ہو گئے ہیں'' (Marx and Mosques Are less Compatible Than Ever) اور اس

سرخی سے ہی یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ کیفر کیا تجزیہ پیش کرنا چاہتا ہے مگر توجہ طلب بات یہ نہیں بلکہ یہ ہے کہ اُس نے ایک تصوراتی اور ایک وسیع تر پیچیدہ حقیقت کے درمیان براہ راست اور غیر مشروط تعلق ثابت کرنے کے لیے اسلام کو اِس طرح استعمال کیا ہے جو کسی صورت بھی قابل قبول نہیں ہو سکتا، اگر یہ بات مان لی جائے کہ دوسرے تمام مذاہب سے ہٹ کر اسلام مطلق العنان ہے، وہ دین اور سیاست کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتا یا مذہب اور روزمرہ کی زندگی میں تفریق نہیں کرتا، تو بھی اِس میں کوئی بات دوسروں سے الگ ضرور ہے اور شاید اس مضمون میں ایسا جان بوجھ کر کیا گیا ہے اگرچہ صاحب مضمون کا انداز بڑی حد تک روایتی ہے مگر وہ خود بھی بے خبر ہے اور ذیل میں اُس کے مضمون سے جو بیانات لیے گئے ہیں ان کے متعلق وہ خود بھی کچھ بتانے سے قاصر ہے، وہ لکھتا ہے کہ:

> ماسکو کے گھٹتے ہوئے اثر ورسوخ کی وجہ بڑی سادہ ہے۔ مارکس اور مسجد ایک دوسرے کے ساتھ نہیں چل سکتے (کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مارکس اور چرچ یا مارکس اور مندر ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ مطابقت رکھتے ہیں؟) تاریخ اور ادب کی ترقی کے اصلاحی دور نے مغربی ذہن کو ایک ایسے سانچے میں ڈھالا ہے جس نے رفتہ رفتہ مذہب کے کردار کو کم کر دیا ہے، اس لیے اُن کے لیے اُس قوت کو سمجھنا مشکل ہے جو اسلام میں ہے (نہ تو تاریخ اور نہ ادب نے ہی اسلام پر ایسے اثرات مرتب کیے ہیں کہ اُس کی حیثیت میں تبدیلی رونما ہو جائے)، صدیوں سے اسلام اِس علاقے میں زندگی کی بنیادی قوت چلا آ رہا ہے اور کم از کم آج کے دور میں اِس کی قوت بڑھتی ہوئی ہی معلوم ہوتی ہے۔
>
> اسلام میں دین اور ریاست کو ایک دوسرے سے الگ کرنے کا کوئی تصور نہیں ہے، یہ ایک مکمل نظام ہے، یہ عقیدے تک محدود نہیں ہے بلکہ اِس میں عمل کے قواعد بھی موجود ہیں اور روزمرہ زندگی کے ضوابط بھی، اِس میں نجات کے لیے یہ کشش بھی موجود ہے کہ مسلمان کافروں کے ساتھ لڑیں یا انھیں اپنے دین میں لے آئیں، چنانچہ گہرے مذہبی جذبات رکھنے والوں خاص طور پر دانشوروں اور مذہبی عالموں کے لیے ہی نہیں بلکہ عوام کے لیے بھی (دوسرے الفاظ میں کسی کو بھی خارج نہیں کیا گیا ہے)، مارکس اپنے خالص سیکولر نظریات کی بدولت نہ صرف اجنبی ہے بلکہ مسلمان اِسے ملحدانہ بھی تصور کرتے ہیں۔

کیفر نے نہ صرف تاریخ کو نظر انداز کر دیا ہے، بلکہ اُن پیچیدگیوں پر بھی نظر نہیں کی جن کے متعلق یہ اعتراف تو کیا جاتا ہے کہ یہ بڑی محدود ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی تسلیم کیا جاتا ہے کہ مارکسزم اور اسلام کے درمیان ایک بڑا دلچسپ متوازی سلسلہ بھی قائم ہے، میکسم روڈن سن نے اپنی ایک کتاب میں اِس بات کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے کہ پچھلے چند برسوں میں مارکسزم اسلامی معاشروں میں اپنا راستہ بناتا ہوا کیوں معلوم ہوتا ہے، کیفر کی توجہ اِس بات پر بھی مرکوز نہیں ہے بلکہ وہ جو دلائل پیش کر رہا ہے اُن میں دراصل ''اسلام'' اور مغرب کا موازنہ چھپا ہوا ہے، اِس سے بڑھ کر یہ کہ اُس کی دلائل ایک سادہ قدامت پرست اور مطلق العنان اسلام سے ہٹے ہوئے اور بے بنیاد ہیں، دلچسپ بات یہ ہے کہ کیفر نے جو بات کہی ہے وہ اُسے اِس خوف سے بے نیاز ہو کر کہہ سکتا ہے کہ کوئی اُسے غلط یا اُس کے باتوں کو بے سروپا قرار دے گا؟ تبصرے اور تجزیے کے اِس میدان میں سارا مسئلہ ہی یہ ہے کہ کیفر جیسے تبصرہ نگار اسلام کو محض تصوراتی قرار دے کر چھلانگ لگاتے ہیں تو اُن کے نزدیک یہ مذہب ایک بڑی اور پیچیدہ حقیقت بن جاتا ہے اس کے باوجود بھی وہ ایک لمحے کے لیے اپنے اِس تضاد پر غور و فکر نہیں کرتے۔

اسلام بمقابلہ مغرب وہ میدان ہے جو تضادات کے بہترین نمونے پیش کرتا ہے، یورپ بمقابلہ اسلام کسی طور بھی امریکا بمقابلہ اسلام سے کم نہیں ہے، لیکن مغرب کو بحیثیت مجموعی بڑے مختلف مگر ٹھوس تجربات کا سامنا کرنا پڑا ہے جس نے اُس کے کردار کو اہم بنا دیا ہے چنانچہ ضرورت اِس بات کی ہے کہ اسلام کے متعلق امریکیوں اور یورپی باشندوں کی آگاہی میں فرق کو تلاش کیا جائے مثال کے طور پر فرانس اور انگلینڈ کچھ عرصہ پہلے تک مسلم مملکتوں کے بڑے حصے پر قابض تھے، اِس لیے اِن دونوں مُمالک کے پاس اسلامی دنیا کے ساتھ براہ راست تجربات کی ایک طویل روایت موجود ہے، اِن دونوں سے کچھ کم درجہ اٹلی اور ہالینڈ کو حاصل ہے یہ بھی مسلم نو آبادیات کے مالک رہے ہیں، ایک اور اہم بات یہ ہے کہ افریقہ اور ایشیا کے لاکھوں مسلمان آج فرانس اور برطانیہ کے بڑے شہروں میں رہائش اختیار کیے ہوئے ہیں، اِن ہی دو باتوں نے یورپ کے علوم شرقیہ کو ایک ممتاز علمی سانچے میں ڈھال دیا ہے، یہ کیفیت نہ صرف اُن ممالک میں جھلکتی ہے جو مسلم نو آبادیوں کے مالک رہے ہیں بلکہ جرمنی، سپین اور انقلاب سے پہلے کے روس میں بھی ملتی ہے یہ تینوں یا تو مسلم علاقوں پر قبضہ کرنے کے خواہشمند تھے یا مسلم علاقوں کے قریب تھے یا کبھی مسلم مملکت کا حصہ رہے تھے۔ آج روس اور اُس میں شامل ریاستوں میں پانچ کروڑ مسلمان آباد ہیں اور 1979ء سے 1988ء تک سوویت یونین کا مسلم افغانستان پر فوجی قبضہ رہا ہے، اگرچہ امریکا میں مسلمانوں کی تعداد مسلسل بڑھ رہی ہے اور آج سے پہلے بھی

اتنے زیادہ امریکیوں نے اسلام کے متعلق نہیں لکھا، نہ سوچا اور نہ گفتگو کی مگر اس کے باوجود امریکا کا مسلمانوں سے وہ تعلق نہیں ہے جو یورپی ممالک کا رہا ہے۔

امریکا کا ماضی میں اسلامی دنیا کے ساتھ کوئی نوآبادیاتی تعلق نہیں رہا ہے، پھر ہمیں امریکا کی اسلام پر کوئی دیرینہ ثقافتی توجہ بھی نہیں ملتی، اِن دونوں باتوں کی روشنی میں اسلام کے متعلق امریکا کا خبط بڑا عجیب، بڑا غیر واضح اور بڑا گھٹیا لگتا ہے، اگر ہم تقابلی جائزہ لیں تو ہمیں بہت کم امریکی سچے مسلمانوں کے ساتھ تعلق قائم کرتے ہوئے ملیں گے جبکہ فرانس کی کیفیت یہ ہے کہ وہاں مسلمانوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اِس ملک میں اسلام دوسرے نمبر پر آتا ہے، مسلمانوں کی اِس کثرت نے اگرچہ فرانس میں اسلام کی مقبولیت کو کم کیا ہوگا مگر اِس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فرانس میں اسلام کو بہتر انداز میں سمجھا جاتا ہے، دراصل جدید یورپ میں اسلام میں بہت زیادہ دلچسپی پیدا ہونے کی وجہ ''مشرق کی نشاۃ ثانیہ'' کو قرار دیا جاتا ہے، مشرق کی نشاۃ ثانیہ اٹھارھویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے شروع میں اُس وقت ہوئی جب فرانسیسی اور برطانوی دانشوروں نے مشرق کو نئے سرے سے دریافت کیا، یہ مشرق ہندوستان، چین، جاپان، مصر، میسوپوٹیما اور ارض مقدس پر مشتمل تھا، اِس دریافت میں اسلام کو بری اور بھلی دونوں کیفیتوں میں مشرق کے ایک حصے کے طور پر لیا گیا، اور اِسے مشرق کے سربستہ رازوں، اجنبیت پرستی، بدعنوانی اور مخفی قوتوں میں شریک خیال کیا گیا، اِس میں کوئی شک نہیں کہ آج سے پہلے صدیوں تک اسلام یورپ کے لیے براہ راست ایک فوجی خطرہ بنا رہا ہے، اور یہ بات بھی درست ہے کہ قرونِ وسطیٰ میں نشاۃ ثانیہ کے ابتدائی دور میں اسلام عیسائی مفکروں کے لیے ایک مسئلہ بنا ہوا تھا، لیکن اِس حالت میں بھی اسلام کم از کم بے شمار یورپی باشندوں کے نزدیک مذہبی اور ثقافتی چیلنج بنا رہا جس نے یورپی سامراج کو اپنے علاقے میں ادارے قائم کرنے سے نہیں روکا، اگرچہ اسلام اور یورپ میں بڑی دشمنی تھی لیکن اِس کے ساتھ ساتھ تعلقات کے براہ راست تجربات بھی ہوتے رہے اور گوئٹے (Goethe)، جیرارڈ ڈی نروال (Gerard de Nerval)، رچرڈ برٹن (Richard Burton)، فلیوبرٹ (Flaubert) اور لوئیس ماسکینن (Louis Massignon) جیسے شاعروں، ناول نگاروں اور دانشوروں کے بارے میں نہ صرف ذہن کھلے رکھے گئے بلکہ ان سے لطافت بھی آئی۔

تاہم اِن شخصیات اور اِن جیسی دوسری شخصیات کے اثر و رسوخ کے باوجود اسلام کو یورپ میں کبھی خوش آمدید نہیں کہا گیا، تاریخ میں جن بڑے فلسفیوں کا ذکر آتا ہے اُن میں ہیگل (Hegel) سے سپنگلر (Spengler) تک نے اسلام کو کسی جوش و جذبے کے ساتھ نہیں لیا۔ البرٹ ہورانی (Albert Hourani) نے

اپنے غیر جذباتی اور جامع مضمون ''اسلام اور فلسفۂ تاریخ'' (Islam and Philosophy of History) میں ایک تسلسل کے ساتھ نمایاں طور پر ایمان کے نظام کے طور پر اسلام کی ناقدری پر بحث کی ہے، وہ لکھتا ہے کہ کبھی کبھار کسی صوفی لکھاری یا بزرگ میں دلچسپی لینے سے ہٹ کر یورپ میں ''مشرق کی دانش'' کے متعلق جو طریقہ کار اختیار کیا گیا تھا اُس میں کسی دانا مسلم بزرگ یا شاعر کا ذکر بھی شاذ ہی ملتا ہے، آج کا تعلیم یافتہ یورپ جن مسلم شخصیات سے واقف ہے ان میں عمر خیام، ہارون الرشید، سندباد، الہٰ دین، حاجی بابا، ملکہ شہرزاد، صلاح الدین کے سوا کوئی ایک زیادہ یا ایک نام کم ملے گا، مسلم دانش سے لاتعلقی کا یہ عالم ہے کہ کارلائل[1] (Carlyle) جیسا شخص بھی (حضرت) محمد (ﷺ) کو مغرب میں مقبولیت نہ دلا سکا اور جہاں تک اُس ایمان کا تعلق ہے جس کی (حضرت) محمد (ﷺ) نے تبلیغ کی تھی وہ یورپی باشندوں کے لیے عیسائیت کے زیر اثر علاقے میں قابل قبول نہیں تھا مگر اسی بنیاد پر وہ اس میں دلچسپی لینے پر مجبور بھی تھے، انیسویں صدی کے آخر میں جب ایشیا اور افریقہ میں اسلامی نیشنلزم کا زور بڑھا تو اس کے ساتھ ساتھ اس خیال کو بھی تقویت ملی کہ مسلم نوآبادیوں کا یورپی تسلط میں رہنا نہ صرف اس لیے ضروری ہے کہ ان سے یورپ کو فائدہ پہنچ رہا ہے بلکہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ یہ پسماندہ ہیں پھر انھیں مغربی نظم و ضبط کی بھی ضرورت ہے، بات چاہے کچھ بھی رہی ہو اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ گاہے بگاہے مسلم دنیا کو نسل پرستی اور جارحیت کا نشانہ بنایا گیا اور یورپی باشندوں نے کافی جوش و جذبے کے ساتھ اس بات کا اظہار کیا کہ اُن کے نزدیک اسلام کی کیا حقیقت ہے؟ چنانچہ اٹھارھویں صدی کے آخر سے آج کے زمانے تک پورے یورپ میں علم و ادب، آرٹ، لٹریچر، موسیقی اور یورپی ثقافت پر عام گفتگو میں اسلام کو نمائندگی ضرور مل گئی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ یورپ کی کئی حکومتوں نے مسلم اور عرب دنیا کے ساتھ ثقافتی اور روحانی امور پر بات چیت کی پالیسی بھی اختیار کی، اس کے تحت سیمینار ہوئے، کانفرنسیں منعقد کی گئیں اور کتابوں کے ترجمے سامنے آئے، امریکا میں ایسا نہیں ہوا، امریکا کے نزدیک اسلام کے معنی یہ ہیں کہ خارجہ تعلقات کی کونسل اپنی پالیسی مرتب کرتے ہوئے اس بات کو دھیان میں رکھے کہ اسلام ایک ''خطرہ'' ہے یا اس کی حقیقت ایک ایسے

1۔ کارلائل (1881ء–1795ء) برطانوی فلسفی، جس کے افکار سوشلزم کی بنیاد بنے، اس نے اپنی کتاب میں حضرت محمد (ﷺ) پر ایک مکمل باب لکھا ہے جس کا عنوان اس نے ''پیغمبر کے روپ میں ہیرو'' رکھا ہے اور انھیں بے مثال بنا کر یہ تصور پیش کیا تھا کہ ''افراتفری پر قابو پانے کے لیے ضروری ہے کہ ایسے ہیرو سامنے آئیں جو معاشرے کو تباہ کرنے والی متحارب قوتوں کو کنٹرول کر سکیں''۔ (مترجم)

فوجی چیلنج کی ہے جس کی مثال اُن اقوام اور بے شمار ثقافتوں میں نہیں ملتی جن کے ساتھ امریکا نے تعلقات استوار کر رکھے ہیں۔

یورپ میں اسلام کے متعلق جو پختگی پائی جاتی ہے اس کے آثار ہمیں اسلام کے متعلق امریکا کے تجربات میں نظر نہیں آتے، جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ انیسویں صدی میں امریکا کا اسلام کے ساتھ بڑا محدود رابطہ ہوا تھا، اس سلسلے میں ہم مارک ٹوین (Mark Twain) اور ہرمن میل ول (Herman Melville) کا ذکر کر سکتے ہیں جنھوں نے گاہے بگاہے سفر اختیار کیا یا عیسائی مبلغوں کی بات چھیڑ سکتے ہیں یا شمالی افریقہ کی ان فوجی مہموں کو سوچ سکتے ہیں جو بہت کم مدت میں ختم ہو گئیں، ان سے ہٹ کر اُس دور میں امریکی رابطے کی کوئی اور شکل سامنے نہیں آتی، ثقافتی اعتبار سے غور و فکر کیا جائے تو دوسری جنگِ عظیم سے پہلے امریکا میں اسلام کو کوئی نمایاں مقام حاصل نہیں تھا، اس دور کے علمی ماہرین، نہ تو مستشرقین کی مسحور کن اور روشن دنیا میں، اسلام کا تذکرہ لیے بیٹھے تھے، نہ کثیر الاشاعت اخباروں میں اس کا کوئی ذکر ہوتا تھا بلکہ وہ دینی سکولوں، پرسکون گوشوں میں اسلام پر کچھ کام کرتے تھے، تقریباً ایک سو سال تک امریکا کے عیسائی مبلغوں کے خاندانوں اور اسلامی دنیا کے درمیان، فارن سروس اور تیل کمپنیوں کے مابین بڑا اچھا تعلق قائم رہا، مگر وقفے وقفے کے ساتھ امریکی دفتر خارجہ اور تیل کمپنیوں سے وابستہ عربوں کے متعلق ایسے جارحانہ تبصرے سامنے آتے رہے، جن میں سامی نسل کے ساتھ دشمنی کا رخ اسلام کی طرف موڑ دیا گیا تھا، دوسری طرف یہ ہوا کہ آج سے بیس سال پہلے تک امریکا کی جن مشہور اور معروف شخصیات نے یونیورسٹیوں میں مختلف شعبے قائم کیے اور اسلام پر مختلف پروگراموں کی ابتدا کی وہ سب کی سب امریکا سے باہر دوسرے ممالک میں پیدا ہوئی تھیں، ان میں لبنان کے فلپ ہٹی (Philip Hitti) نے پرنسٹن میں، آسٹریا کے گستاف وان گرن بام (Gustave von Grunebaum) نے شکاگو اور یونیورسٹی آف کیلی فورنیا لاس اینجلس میں، برطانیہ کے ایچ اے آر گب (H.A.R.Gibb) نے ہاورڈ میں، جرمنی کے جوزف شیکٹ (Joseph Schacht) نے کولمبیا میں اسلام کا شعبہ قائم کیا۔ لیکن ان میں سے کسی بھی شخص کو ثقافت کے حوالے سے وہ ناموری حاصل نہ ہو سکی جو فرانس میں جیکوئس برق (Jacques Berque) کو اور برطانیہ میں البرٹ ہورانی (Albert Hourani) کو نصیب ہوئی۔

پھر امریکا میں ہٹی، گب، وان گرن بام اور شیکٹ جیسے دانشور بھی غائب ہو گئے اور جس طرح برق اور ہورانی جیسے دانشور فرانس اور برطانیہ میں پیدا نہیں ہوئے، ویسے ہی امریکا میں بھی دانشوروں کے خلا کو پر کرنا ممکن نہیں ہوا، برق اور ہورانی نے 1993ء میں انتقال کیا تھا اور آج ثقافت پر اُن جیسی گہری نظر رکھنے والا

اور اُن جیسا مستند کوئی نہیں رہا، البتہ آج کے مغربی علمی ماہرین کی توجہ اُس اسلامی فلسفۂ قانون کی طرف ضرور ہے جو دسویں صدی میں بغداد میں رائج تھا یا پھر وہ انیسویں صدی کی اُس شہری زندگی کے قوانین کو جاننا چاہتے ہیں جو مراکش میں رائج تھے مگر مکمل اسلامی تہذیب یعنی اسلامی لٹریچر، قانون، سیاست، تاریخ، معاشرتی علوم وغیرہ کو جاننے اور سمجھنے میں انھیں کوئی دلچسپی نہیں رہی ہے، اس طرح اگرچہ اسلام کے متعلق ان کا علم محدود ہو گیا ہے مگر اس کمی نے کبھی اِن ماہرین کو ''اسلامی ذہنیت'' یا ''اہل تشیع کے شوق شہادت'' کے بارے میں وقتاً وقتاً اپنی رائے دینے سے نہیں روکا، تاہم ان ماہرین کے اسلام کے مختلف پہلوؤں پر تبصرے کثیر الاشاعت امریکی اخباروں، رسائل، یا میڈیا تک ہی محدود رہے ہیں، کیونکہ یہی ان سے ان کی رائے معلوم کرنے کی تگ و دو کرتے رہے ہیں، ماہرین اور اُن احباب کو جو ماہر نہیں ہیں، اسلام پر عام بحث کا موقع زیادہ تر سیاسی بحران ہی فراہم کرتے آئے ہیں، ورنہ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ اسلامی ثقافت سے متعلق کوئی معلوماتی مضمون نیو یارک ریویو آف دی بکس یا ہارپر (Harper) میں شائع ہو جائے، عام طور پر ''اسلام'' اُسی صورت تبصرے کے لائق تصور کیا جاتا ہے جب سعودی عرب میں کوئی بم دھماکہ ہو یا ایران میں امریکا کے خلاف تشدد کی کوئی دھمکی سامنے آئے، البتہ 1993ء میں جب ورلڈ ٹریڈ سینٹر میں پہلی بار بم دھماکا ہوا تو یہ تبصرے کس قدر باقاعدگی کے ساتھ آنے لگے، اخباروں، رسالوں اور کبھی کبھار فلموں کے ذریعے بھی عوام کو ''اسلامی دنیا'' کے متعلق معلومات فراہم کی جانے لگیں، اچھی طرح جانچنے کے بعد، ان میں کچھ سروے اور اعداد و شمار بھی شامل ہونے لگے اور پاکستان میں پانی فروخت کرنے والے اور مصری کسانوں کا خاندان جیسی انسانی دلچسپی کی کہانیاں پیش ہونے لگیں، انسانی دلچسپی کی کہانیوں کے ذریعے ''اسلام'' کے تصور کو سامنے لانے کی یہ کوششیں بے اثر ثابت ہوئیں البتہ عسکریت اور جہاد کے پس منظر میں پیش ہونے والی کہانیوں کو ضرور پذیرائی ملی۔

اس لیے یہ بات درست ثابت ہوتی ہے کہ اسلام امریکیوں کی اکثریت کے ذہنوں پر چھا چکا ہے، علمی اور عام دنیا سے تعلق رکھنے والے وہ دانشور جو یورپ اور لاطینی امریکا کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں وہ بھی اس کے سحر میں گرفتار ہو چکے ہیں، اگر اصولی طور پر نہیں تو بنیادی طور پر اس کی وجہ یہ تھی کہ اسلام کو، تیل، ایران اور افغانستان یا دہشت گردی جیسے ان معاملات سے جوڑ دیا گیا ہے جو خبروں میں اہمیت رکھتے ہیں، پھر ان سب باتوں کو 1979ء کے وسط میں مختلف نام دینے کا جو سلسلہ شروع ہوا اس نے بھی اسلام کو امریکیوں کے شعور میں بٹھا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلامی انقلاب یا ''بحرانوں کا ہلال'' یا ''عدم توازن کا دائرہ'' یا ''اسلام کی واپسی'' جیسے نام امریکیوں کو متاثر کرتے چلے گئے، امریکیوں پر اثر مرتب کرنے والے واقعات میں ایک مثال

مشرقِ وسطیٰ پر اٹلانٹک کونسل کے سپیشل ورکنگ گروپ کی ہے، اس ورکنگ گروپ میں دوسروں کے علاوہ برنٹ سکوکرافٹ (Brent Scowcroft)، جارج بال (George Ball)، رچرڈ ہلمس (Richard Helms)، لیمن لیمنٹزر (Lyman Lemitzer)، والٹر لیوی (Walter Levy)، یوجین روسٹو (Eugene Rostow)، کرمٹ روز ویلٹ (Kermit Roosevelt) اور جوزف سسکو (Joseph Sisco) بھی شامل تھے، اس گروپ نے جب 1979ء کے موسم خزاں میں اپنی رپورٹ جاری کی تو اس کا عنوان تھا ''تیل اور بدامنی: مشرقِ وسطیٰ میں مغرب ترجیحات'' (Oil and Turmoil: Western Choices in the Middle East) اسی طرح 16/اپریل 1979ء کو جب ٹائم میگزین نے اسلام کو اپنے شمارے کی بنیادی کہانی کے طور پر لیا تو اس کے سرورق کو ایک بارلیش مؤذن سے سجایا گیا تھا، یہ دراصل جرومی (Gerome) کی مشہور پینٹنگ تھی، جو انیسویں صدی کے مستشرقین کے آرٹ کا اتنا خوبصورت نمونہ ہے کہ اس سے زیادہ خوبصورت کسی نمونے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، اس میں مینارے میں کھڑے مؤذن کو دکھایا گیا ہے جو اہلِ ایمان کو بڑے سکون کے ساتھ نماز کے لیے بلا رہا ہے، ٹائم نے اس تصویر کا عنوان ''عسکریت کا احیا'' (The Militant Revival) رکھا ہے اس عنوان کا اس پینٹنگ سے کوئی تعلق نہیں بنتا تھا، مگر اس رسالے نے اس پرسکون منظر کو شعلہ فشاں کرنے کے لیے اس پر یہ عنوان چسپاں کر دیا، یوں یہ سرورق، اسلام کے متعلق یورپ اور امریکا کے تصور میں فرق کو واضح کرنے کی بہترین مثال بن گیا، اس پینٹنگ میں یورپ نے عام اسلامی ثقافت کو اجاگر کرنے کے لیے تخلیقی انداز میں اس کے پرسکون ماحول کو ظاہر کیا ہے جبکہ اسی پینٹنگ پر امریکا نے تین لفظ چسپاں کر کے اُسے اپنے جنون سے عبارت کر دیا ہے۔

یوں معلوم ہوتا ہے جیسے میں ان باتوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کر رہا ہوں؟ کیا اسلام پر ٹائم میگزین کی سرورق کہانی جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے اس رسالے کی اپنی خباثت کا نمونہ نہیں تھی؟ کیا اس میں سنسنی خیزی کے سوا کچھ اور بھی تھا؟ اور کیا اس سے خباثت اور سنسنی خیزی کے علاوہ کسی اور سنجیدہ بات کا اظہار ہوتا تھا؟ پھر سوال یہ اٹھتا ہے کہ میڈیا کب سے اس لائق ہو گیا ہے کہ وہ جامع علوم سے معمور اسلام پر، اس کی پالیسی پر، یا اس کی ثقافت پر کوئی قابلِ ذکر کام کر سکے؟ اور اسلام کے ماہرین کو کیا ہو گیا ہے؟ آخر اسلام کے بارے میں ان کی تحریروں کو کیوں نظر انداز کر دیا جاتا ہے، یا یہ تحریریں میڈیا پر اسلام کے خلاف اس مہم میں کیوں مدغم ہو جاتی ہیں، جس مہم کا ''اسلام'' پر بحث چھیڑنے کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ اسلام کے اثر و نفوذ کو کم کرنے کی کوشش کی جائے؟

جس ترتیب سے میں نے سوالات اٹھائے ہیں اُسی ترتیب سے پہلے ان کی وضاحت ضروری بنتی

ہے۔ جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے کہ اسلامی دنیا پر کوئی ایسا امریکی ماہر نہیں ہوا جس کے پڑھنے اور سننے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہو۔ پھر مرحوم مارشل ہوگ سن (Marshall Hodgson) کی تین جلدوں پر مشتمل ایک کتاب ہے ''اسلام کی مہم جوئی'' (The Venture of Islam) اس کے سوا اسلام پر کوئی اور مستند کتاب، اُن امریکیوں کو دستیاب نہیں ہے جو کتابوں کے رسیا ہیں، مارشل کی کتاب بھی ان کی وفات کے بعد 1975ء میں شائع ہوئی تھی، لکھنے والوں کی اس کوتاہی کی ایک وجہ تو یہ سمجھ میں آتی ہے کہ شاید اُن ماہرین کو اسلام پر اتنا زیادہ عبور حاصل تھا کہ انھوں نے جو کچھ لکھا، وہ اپنے جیسے ماہرین کے لیے لکھا، یا پھر اُن کا کام ایسے پائے کا تھا ہی نہیں کہ وہ ان قارئین کی توجہ حاصل کر سکے جو جاپان، مغربی یورپ یا ہندوستان پر لکھی جانے والی کتابوں کو پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ میری یہ بات دونوں طرح سے درست ہے، جہاں یہ بات درست ہے کہ ہم فرانس کے برق اور روڈن سن کی طرح کے کسی ایسے امریکی مستشرق کو نہیں پیش کر سکتے، جس کی علوم مشرق (شرق شناسی) سے ہٹ کر بھی کوئی شہرت ہو، وہاں یہ بات بھی درست ہے کہ امریکی یونیورسٹیوں میں نہ تو مطالعہ اسلام کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اور نہ وہ شخصیات اسلام کے حوالے سے ثقافتی دائرے میں متحرک دکھائی دیتی ہیں، جن کی شہرت اور سماجی حیثیت اسلام کے متعلق ان کے تجربات کو اہم بنا دے، اب اگر ہم اس بات پر توجہ کریں کہ امریکا میں ربیکا ویسٹ (Rebecca West)، فریا سٹارک (Freya Stark)، ٹی ای لارنس (T.E.Lawrence)، ولفریڈ تھیسی گر (Wilfred Thesiger)، گرٹروڈ بیل (Gertrude Bell)، پی ایچ نیوبائے (P.H.Newby) اور حال ہی میں ابھرنے والے جوناتھن رابن (Jonathan Raban) کی ٹکر کا کون سا دانشور ایسا ہے جو اسلام پر تجربات کی طرف مائل ہے؟ تو اس تلاش کے نتیجے میں ہم زیادہ سے زیادہ ماضی میں سی آئی اے سے وابستہ لوگوں کا حوالہ دے سکتے ہیں جن میں ملز کاپے لینڈ (Miles Copeland) یا کرمٹ روز ویلٹ جیسے لوگوں کے نام آتے ہیں، اور ان کا شمار ادیبوں یا مفکروں میں نہیں کیا جا سکتا اور نہ انھیں ثقافت کے حوالے سے معتبر قرار دیا جا سکتا ہے، البتہ اب اس کیفیت میں تبدیلی رونما ہونے لگی ہے۔ پیٹر تھیروکس (Peter Theroux) جیسے کئی باصلاحیت نوجوان امریکی مصنف اور مترجم سامنے آ چکے ہیں لیکن ابھی انھوں نے کچھ زیادہ نام پیدا نہیں کیا۔

اسلام کا صحیح معنوں میں تنقیدی جائزہ نہ ہونے کی دوسری وجہ یہ بنتی ہے کہ 1970ء کے وسط میں جب اسلامی دنیا پہلی بار ''خبر'' بنی تو امریکی ماہرین کا آخری لمحات میں اسلام کے ساتھ رابطہ قائم ہوا، اس وقت اسلامی دنیا میں انتشار کے جو واقعات رونما ہو رہے تھے اور بڑے تلخ طریقے سے حقائق پر اثر انداز ہوئے، وہ کچھ یوں تھے کہ گلف کے علاقے میں تیل پیدا کرنے والی ریاستیں بہت زیادہ طاقتور نظر آنے لگی تھیں، اور

لبنان کے اندر جو خلاف معمول خونخوار جنگ چھڑ گئی تھی، اس کے ختم ہونے کا کوئی امکان نہ تھا، اس کے ساتھ ساتھ ایتھوپیا اور صومالیہ بھی ایک طویل جنگ میں الجھ کے رہ گئے تھے، کردوں کا مسئلہ بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا اور توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ خیال تھا کہ کردوں کا مسئلہ بہت دور تک جائے گا مگر یہ خلاف توقع ٹھنڈا ہونے لگا اور 1975ء میں ختم ہو گیا، پھر ایران میں انتہائی حیران کن ''اسلامی'' انقلاب برپا ہوا اور عوام نے اپنے شہنشاہ کو تخت سے اتار دیا، ادھر 1978ء میں افغانستان کے اندر بھی انقلاب آیا، پہلے مارکسی گروپ نے اچانک حکومت پر قبضہ کر لیا پھر اس پر 1979ء کے اواخر میں سوویت فوج نے حملہ کر دیا، ساتھ ہی ساتھ الجزائر اور مراکش کے درمیان جنوبی صحارا کا تنازع اٹھ کھڑا ہوا، جبکہ پاکستان کے وزیراعظم کو سزائے موت دے دی گئی اور اس ملک پر ایک نئی فوجی آمریت نے اپنی حکمرانی قائم کر لی۔ ان واقعات کے ساتھ دوسرے واقعات کا سلسلہ بھی جاری ہے، ان سب پر نظر کیجیے تو انتشار مزید گہرا معلوم ہوتا ہے، حال ہی میں عراق اور ایران کے درمیان جنگ ہوئی ہے، حماس اور حزب اللہ نے قوت حاصل کر لی ہے، اسرائیل اور اس خطے کے دوسرے ممالک میں بم دھماکوں کا ایک سلسلہ بھی چل نکلا ہے، الجزائر میں اسلام پسندوں اور اعتماد سے محروم حکومت کے درمیان خونریز خانہ جنگی چھڑ گئی ہے، میں نے یہ چند واقعات اشارتاً اس لیے بیان کیے ہیں تاکہ یہ بات آسانی کے ساتھ سمجھ آ جائے کہ اسلام کن حوالوں سے خبر بنا، اگر صورت حال کو بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو یہ کہنا مناسب ہوگا کہ مغرب میں جو ماہرین اسلام پر لکھ رہے تھے، انھوں نے ان واقعات میں سے صرف چند ایک پر روشنی ڈالی ہے، باقی کو نظر انداز کر دیا پھر ان ماہرین میں سے کسی نے ان کے متعلق پہلے سے کوئی پیشین گوئی نہیں کی اور نہ اپنے قارئین کو پہلے سے ان واقعات کے متعلق ذہنی طور پر تیار کیا، پھر جن واقعات پر انھوں نے قلم اٹھایا اور مضامین کا ڈھیر لگا دیا، ان کا واقعات کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے، جیسے دنیا کے کسی دور افتادہ حصے کے متعلق بات کی جا رہی ہے، اور میڈیا دھماکا خیز انداز میں جو عکاسی کر رہا ہے، اس کا اس ہنگامہ آرائی اور پرخطر افراتفری سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس سارے معاملے کا یہی ایک مرکزی نکتہ ہے، جس پر آج بھی توجہ نہیں دی گئی اور نہ دانشمندانہ انداز میں گفتگو کا سلسلہ چھڑا ہے، اس لیے ہمیں بڑے محتاط انداز میں اپنی بات کو آگے بڑھانا ہوگا، علمی ماہرین جنھیں اسلام کے ساتھ اسی طرح کی دلچسپی تھی جیسی سترھویں صدی سے پہلے پرانی چیزوں سے متعلق کسی کام میں ہوتی تھی، پھر موضوعات کے دوسرے ماہرین کی طرح ان کا کام بھی مختلف خانوں میں بٹا ہوا تھا، انھیں نہ تو اس کی خواہش تھی اور نہ انھوں نے ذمہ دارانہ انداز میں کوشش ہی کی کہ وہ اسلامی تاریخ کے تازہ ترین نتائج کے ساتھ

کوئی تعلق قائم کریں، چنانچہ کسی حد تک ان کا کام ''کلاسیکی'' اسلام کی نامکمل تصویر پیش کرتا ہے یا انھوں نے اس مفروضے کو بنیاد بنا کر اسلام پر کام کیا ہے کہ اسلامی زندگی میں تبدیلی کا کوئی امکان نہیں ہے، یا انھوں نے ان قدیم علمی سوالات کی بنیاد پر اپنے مضمون کو اٹھایا ہے جو صدیوں پہلے اسلام کے متعلق پیدا ہوئے تھے، اس اعتبار سے ماہرین کا کیا ہوا سارا کام ایسا ہے کہ جدید اسلامی دنیا کو سمجھنے میں یہ کسی طرح مدد معاون نہیں ہو سکتا، پھر اسلامی دنیا ہر صورت اور ہر پہلو سے ان خطوط سے بالکل مختلف انداز میں ڈھلتی چلی جا رہی ہے جن خطوط کی جھلک ساتویں سے نویں صدی تک کے ابتدائی اسلامی ادوار میں دکھائی دیتی تھی۔

ماہرین جن کا شعبہ جدید اسلام تھا یا یوں کہیے کہ جن کا شعبہ اسلامی دنیا میں موجود معاشروں، لوگوں اور ان اداروں سے متعلق تھا جو اٹھارھویں صدی سے چلے تھے تو ان کے سلسلے میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے اپنے کام کی بنیاد ایک ایسے طے شدہ ڈھانچے پر رکھی تھی جس کا اسلامی دنیا سے کوئی تعلق بنتا ہی نہیں تھا، یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ اس کی پیچیدگیوں اور اسی کی مختلف اقسام کے متعلق کوئی مبالغہ آرائی نہیں کی جا سکتی، اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آکسفورڈ یا بوسٹن میں بیٹھا ہوا ایک سکالر ان اصولوں اور اس معیار کے مطابق نہیں لکھے گا یا تحقیق نہیں کرے گا جس کی توقع اس کے ہم عصروں نے اس سے اپنی روایت کے حوالے سے باندھ رکھی ہے۔ اگر اس بات کو سنجیدگی سے لیا جائے تو وہ ان مسلمانوں کی خواہش کے مطابق تو کبھی نہیں لکھے گا جن کا وہ مطالعہ کر رہا ہے، یہ مقولہ اپنی جگہ بڑا سچا اور خالص ہے اور اس پر زور دینے کی بھی ضرورت ہے، علمی مدارس پر جدید اسلامی مطالعہ اور تحقیق کو مغربی یورپ، سوویت یونین، جنوب مشرقی ایشیا میں اسلام کے مطالعے جیسے ''علاقائی پروگراموں'' میں تقسیم کر دیا گیا ہے، اس اعتبار سے ان سکالروں کا مطالعہ اس نظام سے جڑ گیا ہے، جس کے تحت قومی پالیسی وجود میں آتی ہے، نتیجہ یہ ہے کہ اس سارے معاملے سے کسی سکالر کی انفرادی پسند کا کوئی تعلق نہیں رہا، اگر کوئی شخص پرنسٹن میں افغانستان کے معاصر مذہبی مدارس پر تحقیق کر رہا ہے تو یہ بات خاص طور پر آج کے زمانے میں بڑی واضح ہو جاتی ہے کہ اس مطالعے میں ''سیاسی مضمرات'' ضرور شامل ہوں گے اور مطالعہ کرنے والا سکالر چاہے یا نہ چاہے اسے حکومت، تجارتی اداروں، خارجہ پالیسی سے متعلق تنظیموں کے جال میں جکڑ لیا جائے گا، اس ملاپ سے اس کی اپنی مالی سہولتوں پر اثر پڑے گا، مطالعہ کے سلسلے میں جن لوگوں سے سکالر کا رابطہ ہوگا وہ بھی متاثر ہوں گے اور اس صورت حال میں اس سکالر کو کچھ تو انعام اور کچھ مفید کاروباری تعلقات کی پیش کش ہوگی اور گھڑی پل میں وہ سکالر جس علاقے کا مطالعہ کرنے لگا تھا اس ''علاقے کا ماہر'' قرار دے دیا جائے گا یا اس کے ساتھ بھی وہی ہوگا جو جوڈتھ ملر اوسط درجے اور نااہل صحافی

کے ساتھ ہوا تھا جو آج اسرائیل کا حامی ہے یا پھر نشر و اشاعت کے ماہر مارٹن پریٹز کے ساتھ ہوا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ ان کی گفتگو میں کچھ وزن ہوتا بھی ہے یا نہیں، انھیں بڑے احترام کے ساتھ خاموشی سے سنا جاتا ہے۔

ایسے سکالروں کے لیے جن کی دلچسپی براہ راست پالیسی سے متعلق امور سے ہوتی ہے، انھیں اگر خطرناک نہیں تو حساس سوالوں کے جواب ضرور ڈھونڈنا ہوتے ہیں، ان سکالروں میں سیاسی سائنسدان تو خاص طور پر آتے ہیں مگر جدید دور کے تاریخ دانوں، ماہرین اقتصادیات، معاشرتی علوم کے ماہرین اور بشریات کے ماہرین کا شمار بھی ان ہی سکالروں میں ہوتا ہے، دیکھنا یہ ہے کہ حکومت ان سکالروں سے جو تقاضا کرتی ہے اُس کا بحیثیت سکالر ان کے مقام اور مرتبے سے کیا تعلق بنتا ہے؟ اس نکتے کو سمجھنے کے لیے بہترین مثال ایران کی ہے، شاہ کے زمانے میں پہلوی فاؤنڈیشن اُن سکالروں کو فنڈ فراہم کرتی تھی جو ایران پر کام کرتے تھے، اس کے ساتھ ساتھ انھیں امریکی ادارے بھی رقم فراہم کرتے تھے، یہ رقم ان سکالروں کو ملتی تھی جو اُس دور کے انتظام سے ہٹ کر کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنے پر غور و فکر کرتے تھے، اُس وقت انتظام یہ تھا کہ رضا شاہ کی حکمرانی کو امریکا کی فوجی اور اقتصادی امداد نے سنبھال رکھا تھا، سکالروں کا کام شاہی نظام کے اندر رہتے ہوئے اس کی بہتری کے راستے تلاش کرنا تھا، بعد میں جب ایران کا بحران سامنے آیا تو اس کے آخری مرحلے میں امریکی ایوان کے انٹیلی جنس سٹاف کی مستقل کمیٹی نے اپنی مطالعاتی رپورٹ جاری کی جس میں کہا گیا تھا کہ امریکا نے ایران کے متعلق جو پالیسی اختیار کر رکھی تھی اُس نے ایرانی حکومت کے متعلق تمام اندازوں کو متاثر کیا ہے ''ایسا براہ راست موزوں خبروں کو دبانے سے نہیں ہوا، بلکہ پالیسی بنانے والوں کی اس خواہش نے بالواسطہ طور پر ضرور متاثر کیا جو صرف یہ جاننا چاہتے تھے کہ کیا شاہ کی آمرانہ حکومت غیر معینہ مدت تک جاری رہ سکے گی، ان کی اس خواہش نے تحقیق کو ایک دائرے تک محدود کیے رکھا، اس طرح جو معلوم ہوا اسی مفروضے پر پالیسی مرتب ہوئی'' امریکا کے اس طرز عمل کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ بہت کم ایسی مطالعاتی رپورٹیں سامنے آئیں جن میں سنجیدگی کے ساتھ شاہ کی حکمرانی کا جائزہ لیا گیا تھا اور اس بات کی نشاندہی کی گئی تھی کہ ایران میں شاہ کے خلاف ایک مقبول عام اپوزیشن کن ذرائع سے ابھر رہی ہے، میرے علم کے مطابق برکلے کا حامد الگر (Hamid Algar) وہ واحد سکالر تھا جو اس بات کا درست اندازہ لگا سکا تھا کہ ایرانیوں کے مذہبی احساسات شاہ کے مقابل ایک سیاسی قوت کی شکل اختیار کر رہے ہیں اور صرف الگر ہی اپنے مطالعے میں اس حد تک گیا کہ اُس نے اس امکان کی پیشین گوئی بھی کر دی کہ آیت اللہ خمینی شاہ کی حکومت کا تختہ الٹ سکتے ہیں،

دوسرے سکالر جن میں رچرڈ کاٹم (Richard Cottam) اور اروند ابراہیمیان (Arvand Abrahamian) شامل ہیں، انھوں نے بھی اگرچہ حالات کو جوں کا توں رکھنے کی مخالفت کی، مگر ان مخالفت کرنے والوں کی تعداد بہت کم تھی، امریکا کی اس کمزوری پر بات کرتے ہوئے انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس بات کو بھی تسلیم کریں کہ یورپ کے بائیں بازو کے سکالر جو ایران پر شاہ کے تسلط کو جاری رکھنے کے حق میں کچھ زیادہ سرگرم نہیں تھے وہ بھی اس بات کا اندازہ قائم نہیں کر سکے کہ ایران میں مذہبی بنیادوں پر ایک طاقتور اپوزیشن ابھر رہی ہے۔

اگر ہم ایران سے ہٹ کر دیکھیں تو ہمیں دوسری جگہوں پر بھی حالات کو جانچنے میں دانشوروں کی ناکامیاں ایران سے کچھ کم دکھائی نہیں دیں گی، اور ان سب کی ہمیں ایک ہی وجہ معلوم ہوگی کہ حکومت کی پالیسی اور ان غیر منطقی خیالات کا تنقیدی جائزہ نہ لینا، اس ناکامی کا سبب بنا ہے جو خیالات سکالروں پر ٹھونسے جاتے تھے، اگر ہم لبنان اور فلسطین کے حالات پر نظر دوڑائیں تو ہم دیکھیں گے کہ لبنان کو برسوں تک مختلف ثقافتوں کے مجموعے کی ایک مکمل تصویر کے ماڈل کے طور پر پیش کیا جاتا رہا، لیکن وہ تمام ماڈل جو لبنان کے مطالعے کی بنیاد تھے اتنے بودے اور بے معنی ثابت ہوئے کہ ان سے اُس پرتشدد اور خونریز خانہ جنگی کا پہلے سے کوئی پتا اور سراغ نہیں مل سکا جو 1975ء سے 1980ء تک جاری رہی، اس سارے منظر نامے کو دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ ماضی کے ماہرین کی آنکھوں کو لبنان کے ''استحکام'' کے تصور نے اس طرح باندھ رکھا تھا کہ انھیں اس کے سوا کچھ نظر نہیں آیا، ان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ لبنان کے روایتی لیڈروں، شرفا، سیاسی جماعتوں، قومی کردار اور لبنان کو جدید دور کے سانچے میں ڈھالنے کی کامیابیوں کے سوا دوسرے معاملات کا مطالعہ ہی نہیں کر سکے۔

اُس وقت کی حالت یہ تھی کہ جب لبنان کے سیاسی نظام کو غیر محفوظ قرار دیا جاتا تھا یا یہ تجزیہ کیا جاتا تھا کہ لبنانی باشندوں میں ''شائستگی'' کا کتنا فقدان ہے تو بات ایک ہی مفروضے پر آ کر ٹھہرتی تھی کہ لبنان کے مسائل پر قابو پایا جا سکتا ہے اور افراتفری پھیلنے کا کوئی امکان نہیں ہے، ساٹھ کے عشرے میں لبنان کو ایک ''مستحکم'' ملک گردانا جاتا تھا، اس کی وجہ ایک ماہر نے یہ بیان کی تھی کہ ''عرب ممالک'' کے درمیان تعلقات مستحکم ہیں۔ اُس کی دلیل یہ تھی کہ جب تک عربوں کے درمیان تعلقات کی یہ نوعیت برقرار رہے گی تب تک لبنان محفوظ رہے گا، چنانچہ کسی مرحلے پر اس بات پر غور نہیں کیا گیا کہ یہ نوبت بھی آ سکتی ہے کہ عربوں کے تعلقات تو مستحکم رہیں مگر لبنان غیر مستحکم ہو جائے، اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ لبنان کے اندر جو شگاف تھے ان کا اُس کے عرب ہمسایوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں بنتا تھا، اصل بات اس روایتی دانش کی تھی، جس نے لبنان کے اندر رہنے والی مختلف اقوام کے درمیان ہم آہنگی کا ایک تسلسل قائم کر رکھا تھا، اس صورت حال میں اگرچہ

امریکا اور اسرائیل دونوں لبنان کے متعلق مخصوص ارادے رکھتے تھے مگر انھوں نے ان کا کوئی باضابطہ تجربہ نہیں کر رکھا تھا، اس لیے لبنان پر کوئی مشکل امریکا اور اسرائیل کی طرف سے نہیں بلکہ گردوپیش کے عرب ماحول سے ہی وارد ہونا تھی۔ اس ماحول میں وہ لبنان موجود تھا جس نے اپنے اندر جدیدیت کی داستان کو سمیٹ رکھا تھا، ہم آج جب شترمرغ جیسی دانش کی اِس کہانی کو پڑھتے ہیں تو ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ کتنی سنجیدگی کے ساتھ جدیدیت کی اس حکایت کو 1973ء کے اُس زمانے تک کھینچ لایا گیا جب حقیقت میں خانہ جنگی شروع ہو رہی تھی، اُس وقت ہمیں بتایا گیا تھا کہ لبنان میں انقلابی تبدیلیاں آسکتی ہیں، لیکن ان کا امکان بہت ''بعید'' ہے۔ ہم سے کہا گیا تھا کہ ''موجودہ سیاسی ڈھانچے کے اندر رہتے ہوئے عوام کی شراکت سے ملک کے مستقبل کو جدیدیت میں ڈھالنے کا امکان زیادہ ہے'' عربوں کی حالیہ تاریخ میں لڑی جانے والی ایسی خونریز خانہ جنگی پر یہ ملمع سازی نہ صرف افسوسناک ہے بلکہ اس میں طنز بھی جھلکتا نظر آتا ہے، اس صورت حال کے متعلق ایک ممتاز ماہر بشریات کا کہنا ہے کہ ''لبنانی جو مختلف ثقافتوں کے ادغام کی ایک مکمل تصویر پیش کرتے ہیں، سلامت ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ لبنان اپنے اندر کے گہرے شگافوں کو سنبھال کے چلتے رہنے میں کامیاب رہے گا''۔

اس اندازِ فکر کا نتیجہ یہ نکلا کہ لبنان اور دوسری جگہوں میں موجود ماہرین کو یہ حقیقت سمجھنے میں ناکامی ہوئی کہ سابقہ نوآبادیات کے متعلق جو بات درست بیٹھتی تھی اُسے ''استحکام'' کا نام دے کر آج درست نہیں بنایا جاسکتا، لبنان میں درحقیقت متحرک اور تباہ کن قوتیں موجود تھیں جن پر ماہرین نے یا تو کبھی نظر نہیں کی، یا انھیں مسلسل غیراہم سمجھتے رہے، اُس وقت کے لبنان میں سماجی اکھاڑ پچھاڑ ہو رہی تھی، آبادی میں اس طرح کی تبدیلی آ رہی تھی کہ اُس میں اہل تشیع نمایاں ہو گئے تھے، عقیدے کے ساتھ وفاداری سامنے آنے لگی تھی اور نظریات کا ایک بہاؤ تھا، ان سب نے مل کر بڑے وحشیانہ انداز میں اس ملک کو چیر کر رکھ دیا، اسی طرح کئی برس تک یہ سوچ غالب رہی کہ فلسطینی وہ پناہ گزین ہیں، جنھیں پھر سے آباد کرنا ہے۔ انھیں کسی نے ایک ایسی سیاسی قوت نہیں سمجھا، جن کے مطالعے سے مشرق قریب میں ظہور پذیر ہونے والے واقعات کے متعلق معقول حد تک ٹھیک اندازے قائم کیے جاسکتے تھے، اُس کوتاہی کے باوجود ستر کے عشرے کے وسط میں فلسطینی، امریکی پالیسی میں ایک بڑے مسئلے کی حیثیت اختیار کر گئے مگر علم و دانش کے ماہرین نے فلسطینیوں کی اس بدلتی ہوئی حیثیت اور اس سے وجود میں آنے والے اثرات کو بھی لائق توجہ نہیں سمجھا بلکہ ماہرین نے مستقل طور پر یہ رویہ اختیار کیے رکھا کہ فلسطینیوں کی الگ کوئی حیثیت نہیں ہے، امریکا نے مصر اور اسرائیل کے متعلق جو پالیسی

اختیار کر رکھی ہے، فلسطینی اس پالیسی کا ہی ایک حصہ ہیں، یہی نہیں بلکہ لبنان کے خون آشام دور میں بھی فلسطینیوں کو نظرانداز کر دیا گیا، جب 1987ء کے اواخر میں انتفادہ سامنے آیا، تو یہ نہ صرف امریکی افسروں بلکہ مبصروں کے لیے بھی ایک جیسی حیران کن بات تھی، اس وقت کوئی ایک بھی ایسا اہم سکالر یا ماہر موجود نہیں ہے ''جو دیکھتے ہوئے نہ دیکھنے'' کی پالیسی کا سدباب کر سکے، یہ ایک ایسی کمزوری ہے جس کے نتائج نہ صرف آگے چل کے مہلک ثابت ہو سکتے ہیں بلکہ یہ بات امریکا کے قومی مفاد میں بھی نہیں ہے، یہ بات اس لیے بھی وزن رکھتی ہے کہ ایران عراق جنگ میں ایک بار پھر جاسوسی کے ادارے بےخبری میں مارے گئے ہیں اور ان دونوں ممالک کی فوجی صلاحیت سے متعلق ان کے اندازے بہت غلط ثابت ہوئے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ بنیادی نکتہ یہ ہے کہ امریکا اور اس کے ''ماہرین'' کی فوج ان مسلمانوں سے یہ توقع کیوں کر سکتی ہے کہ وہ ''مغرب'' کو کھلے دل سے گلے لگا لیں گے جنھوں نے بوسنیا، چیچنیا اور فلسطین میں اپنے ساتھیوں کو مرتے دیکھا ہے، جنھوں نے امریکا کو ان کے اس حاکم کو اپنا دوست کہہ کر اس کی تعریف کرتے ہوئے سنا ہے جو حاکم ان کے لیے قابل قبول نہیں تھا اور جنھوں نے اپنے مذہب اور اپنی ثقافت پر ''اشتعال انگیز'' اور دہشت گرد'' جیسے الزامات برداشت کیے تھے۔

اطاعت شعار اور محنتی سکالروں اور کسی سمت کے تعین کے بغیر حالات کی جانچ کرنے والی حکومت کے گٹھ جوڑ سے یہ افسوسناک سچائی بھی ابھرتی ہے کہ اسلامی دنیا پر لکھنے والے ماہرین کی بہت بڑی تعداد کو تو اسلامی دنیا میں پھیلی ہوئی مختلف زبانوں کی بھی سمجھ نہیں ہے، چنانچہ انھیں معلومات کے لیے یا تو پریس پر یا دوسرے مغربی مصنفین کی تحریروں پر انحصار کرنا پڑتا ہے، چنانچہ ایران کے انقلاب سے پہلے ان کی کارکردگی اس لیے متاثر ہوئی کہ انھوں نے دوسرے سہاروں کے ساتھ ساتھ جب سرکاری یا حالات کی روایتی تصویر کا سہارا لیا تو یہ میڈیا کے لیے ایک جال ثابت ہوا، یہی طرزِ عمل انھوں نے انتفادہ سے پہلے اور پھر اس وقت اختیار کیا جب اسلامی ''بنیاد پرستی'' اور ''دہشت گردی'' سے متعلق ہسٹریا جیسی کیفیت عام ہو رہی تھی، اس طرز عمل نے ایک بار کسی چیز کا مطالعہ کرنا، پھر بار بار اُسی کا مطالعہ اور اُسی چیز پر نظریں جمائے رکھنے کے رجحان کو پیدا کیا، چنانچہ شرفا، جدیدیت کی جانب پیش قدمی، فوج کا کردار، نمایاں نظر آنے والے لیڈر، سنسنی خیز بحران، جہادی سلسلے، امریکی نکتۂ نظر کے مطابق جغرافیائی حکمت عملی، اور مداخلت کے ''اسلامی'' راستوں پر بات کرنا ایک معمول بن گیا پھر ان سے ہٹ کر کسی اور سمت دیکھنے کی زحمت نہیں کی گئی، اس وقت امریکا کو ایک قوم کی حیثیت سے یہ طرزِ عمل دلچسپ محسوس ہوا لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایران میں جب انقلاب آیا تو ایسے افکار اس

کے سامنے دنوں میں ہی بے معنی ہوکر رہ گئے، پورا شاہی دربار زمین بوس ہوگیا، فوج جس پر اربوں ڈالر خرچ کیے گئے تھے منتشر ہوگئی، وہ لوگ جنھیں شرفا کہہ کر پیش کیا جاتا تھا یا تو غائب ہوگئے یا نئے ماحول میں ڈھل گئے، اور شرفا کے اس طبقے کی ان ہر دو کیفیتوں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو نہ پہنچ سکی کہ ایران کے سیاسی رویے پر انھیں کنٹرول حاصل تھا، ماہرین میں صرف ٹیکسس یونیورسٹی کے جیمز بل (James Bill) کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے اس بات کی پیشین گوئی کردی تھی کہ "78 کا بحران" کس سمت بڑھ سکتا ہے، اس نے دسمبر 1978ء کے اواخر میں امریکی پالیسی سازوں کو مشورہ دیا تھا کہ امریکا شاہ کو اس بات پر آمادہ کرے کہ "وہ اپنے ملک میں رائج نظام میں تبدیلیاں لائے اور اس کے دروازے عوامی شخصیات پر کھول دے"، اس صورت حال میں ہمارے لیے یہ بات اہمیت رکھتی ہے کہ اس وقت جو اختلافی آواز اٹھی تھی اس نے بھی شاہ کی حکومت کو برقرار رکھنے کی ہی بات کی، حالانکہ جب جیمز بل امریکی حکومت کو یہ مشورہ دے رہا تھا اس وقت آج کی تاریخ کا وہ سب سے بڑا انقلاب شروع ہو چکا تھا جس میں لاکھوں عوام شاہ کے خلاف باہر نکل آئے تھے۔

تاہم جیمز بل کے اس مضمون سے ایران کے حالات سے امریکا کی لاعلمی ضرور ظاہر ہو جاتی ہے۔ اس کا یہ کہنا درست ثابت ہوتا ہے کہ میڈیا سے نشر ہونے والی خبریں اور تبصرے سطحی تھے، اس وقت ہوا یہ تھا کہ سرکاری اطلاعات کو بھی پہلوی کی خواہش کے مطابق بنایا گیا تھا، اور امریکا نے اس ملک کے متعلق نہ تو زیادہ باریکی سے جاننے کی کوشش کی تھی اور نہ اپوزیشن کے ساتھ ہی کوئی رابطہ کیا تھا، اگرچہ جیمز بل نے یہ باتیں نہیں کہیں مگر اسلامی دنیا کے متعلق یہ رجحان زیادہ تر امریکا کی اور کسی حد تک یورپ کی ناکامی کو بھی ظاہر کرتا ہے اور جیسا کہ آگے چل کر ذکر آئے گا کہ تیسری دنیا کے سلسلے میں زیادہ تر یہی طرزِ عمل اختیار کیا گیا ہے، اس میں کچھ کلام نہیں کہ جیمز بل ایران کے متعلق جو بات پوری سچائی کے ساتھ کہہ رہا تھا، اس نے اس کا تعلق باقی ماندہ اسلامی دنیا کے ساتھ نہیں جوڑا حالانکہ ماہرین کا عام رجحان یہی ہے کہ وہ ایک جگہ کی بات کو اٹھا کے ساری اسلامی دنیا پر منطبق کر دیتے ہیں پھر اس مرکزی سوال پر ذمہ داری کے ساتھ غور ہی نہیں کیا جاتا کہ "اسلام" اور اسلام کی بیداری پر گفتگو کرنے کی اگر کوئی اہمیت ہے تو وہ کیا ہے؟ اس بات پر بھی کوئی غور نہیں ہوتا کہ حکومت کی پالیسی اور عالمانہ تحقیق کے درمیان کیا تعلق ہونا چاہیے یا کیا تعلق ہے؟ اس بات کو بھی کسی نے نہیں سوچا کہ کیا ماہرین سیاست سے بلند ہوتے ہیں یا وہ سیاسی طور پر حکومت سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں؟ جیمز بل اور ایران یونیورسٹی کے ولیم بی مین (William Beeman) نے مختلف مواقع پر یہ دلائل پیش کیے ہیں کہ 1979ء کے ایرانی بحران میں امریکا کو اس لیے ناکامی ہوئی کہ جن ماہرین کو خاص طور پر اسلامی دنیا کو سمجھنے کی نہایت مہنگی تعلیم

دلوائی گئی تھی امریکا ان کے ساتھ کوئی رابطہ قائم نہیں کر سکا، تاہم جیمز بل اور بی مین دونوں نے اس امکان کا جائزہ نہیں لیا کہ ایسا اس لیے بھی تو ہو سکتا ہے کہ سکالروں نے شاید خود ہی اپنے آپ کو سکالر کہتے ہوئے اپنے لیے لاتعلقی کا یہ کردار منتخب کیا ہو اور ان کی گومگو کی کیفیت نے ہی انھیں حکومت اور دانشمند طبقہ کے لیے ناقابل اعتماد بنا دیا ہو۔

ایک باعلم دانشور کے معنی تو یہ ہوتے ہیں کہ وہ اپنی رائے کے اظہار میں آزاد ہے مگر کیا کوئی ایسا طریقہ بھی ہے کہ کوئی دانشور اپنی آزاد حیثیت کو برقرار بھی رکھے اور ریاست کے لیے کام بھی کرے؟ بلاتکلف اور بے جا سیاسی طرفداری کا صاحبِ بصیرت ہونے سے کیا تعلق ہے؟ کیا ان دونوں صفات میں سے کوئی ایک دوسرے پر حاوی ہو جاتی ہے یا یہ بات صرف چند مخصوص معلومات میں ہی وقوع پذیر ہوتی ہے؟ پھر یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ امریکا میں ان تمام مسلم سکالروں کو جن کی تعداد بہت ہی کم ہے، ان کی زیادہ بڑے پیمانے پر شنوائی کیوں نہیں ہوئی؟ پھر اس وقت ایسا کیوں ہوا جب امریکا کو رہنمائی کی بڑی ضرورت تھی؟ ان تمام سوالوں کے جوابات یقیناً اس دائرہ کار کے اندر رہ کر دیے جا سکتے ہیں جو تاریخی اعتبار سے مغرب اور اسلامی دنیا کے تعلقات کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا۔ آیئے اس دائرہ کار کا مطالعہ کریں اور یہ دیکھیں کہ اس میں ماہرین کے لیے کس طرح کے کردار کی گنجائش موجود ہے۔

قرونِ وسطیٰ سے لے کر آج تک مجھے یورپ اور امریکا کی تاریخ میں کوئی ایسا دور نہیں ملا جس میں اسلام پر اُس دائرہ کار سے باہر نکل کر بات کی گئی ہو یا غور کیا گیا ہو جسے جذباتیت، تعصب اور سیاسی مفادات نے جنم دیا تھا، میری یہ بات اگرچہ کوئی حیران کن دریافت نہیں ہے مگر اس میں دانش اور سائنس کے وہ تمام ضوابط آ جاتے ہیں جنھیں انیسویں صدی کے شروع میں یا تو اجتماعی طور پر علوم شرقیہ کے ضوابط کہا جاتا تھا یا جن کے تحت بڑے منظم انداز میں مشرق کے ساتھ معاملہ کیا جاتا تھا، اس بات سے کوئی اختلاف نہیں کرے گا کہ ابتدائی دور میں پیٹر دی وینیر بل (Peter the Venerable) اور بارتھیلمی ڈی ہربی لوٹ (Barthelemy d' Herbelot) جیسے اسلام کے مبصر گزرے ہیں انھوں نے جو کچھ کہا وہ مناظرہ کرنے کا مسیحی انداز لیے ہوئے تھا، لیکن اس کے بعد جب یہ مفروضہ قائم ہوا تو اس کا کبھی جائزہ نہیں لیا گیا کہ یورپ اور مغرب نے خود کو توہمات اور جہالت سے آزاد کروا کر اگر جدید سائنسی دور میں قدم رکھا ہے تو اس کی اس پیش قدمی میں یقیناً مشرق سے متعلق علوم (شرق شناسی) بھی شامل ہوں گے، کیا یہ بات درست نہیں ہے کہ سلوسٹر ڈی سیکی (Silvestre de Sacy)، ایڈورڈ لین (Edward Lane)، ارنسٹ رینان (Ernest Renan)، ہملٹن گبز (Hamilton Gibbs) اور لوئیس

ماسینگن (Louis Massignon) بڑے صاحب علم سکالر تھے اوران کی تحریریں بہت بامقصد ہوتی تھیں اور کیا یہ بھی درست نہیں ہے کہ بیسویں صدی میں معاشرتی علوم، علم البشریات، لسانیات، اور تاریخ میں تمام تر ترقی کو رہنما بنا کر پرنسٹن، ہاورڈ اور شگاگو میں جو سکالر مشرقِ وسطیٰ اور اسلام کی تعلیم دے رہے تھے، کیا وہ ترقی کے حوالے سے جو بات کہہ رہے تھے اسے کہتے ہوئے وہ آزاد اور تعصب سے پاک تھے؟ اس سوال کا کوئی جواب نہیں بنتا اور میں بھی اس کی نفی اس بنیاد پر نہیں کر رہا کہ سماجی اور انسانی سائنسوں کے مقابلے میں مشرقی علوم تعصب سے کہیں زیادہ پُر ہیں بلکہ ایسا اس لیے کر رہا ہوں کہ مشرقی علوم اتنے ہی نظریاتی ہیں جتنے دنیا کے وہ دوسرے ضابطے جو آلودگی کا شکار ہو چکے ہیں۔ بنیادی فرق یہ ہے کہ مشرقی علوم کے سکالروں نے اپنی حیثیت کو اس طرح ڈھال لیا ہے کہ اسلام کی ''حقیقت پسندی'' اور ''سائنسی غیر جانبداری'' کے متعلق ان کے جو سچے اور کھرے احساسات اور مستند خیالات ہیں وہ یا تو ان سے انکار کرنے والے ماہرین بن جائیں یا کبھی کبھی ان پر پردہ ڈال دیا کریں۔

یہ ابھی صرف اس سلسلے کا پہلا نکتہ ہے دوسرا نکتہ اس تاریخی عمل سے متعلق ہے جس نے بصورت دیگر مشرقی علوم کو ایک امتیازی خصوصیت عطا کر دی ہے، دور جدید میں جب بھی مغرب اور اس کے مشرق میں یا مغرب اور اس کے اسلام میں کوئی حقیقی کشیدگی محسوس کی گئی ہے تو اس معاملے میں مغرب کا ہمیشہ طرز عمل یہ رہا ہے کہ وہ براہ راست حملے سے گریز کرتا ہے اور پہلے تو صورت حال کو بڑے ٹھنڈے انداز میں لیتا ہے اور کسی حد تک الگ تھلگ رہتے ہوئے سائنسی طریقے اختیار کرتا ہے پھر صورت حال کو نیم حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کرتا ہے، اس طرح ''اسلام'' ان کے لیے زیادہ واضح ہو جاتا ہے، اس کی ''اصل فطرت'' جس میں ان کے نزدیک خطرہ ہی خطرہ پوشیدہ ہے، سامنے آ جاتی ہے چنانچہ اس کے خلاف کارروائی کرنے کا جواز پیدا ہو جاتا ہے، اس سیاق وسباق میں جب سائنسی انداز میں یا براہ راست حملہ ہوتا ہے تو ان دونوں کو مختلف حالات میں زندگی بسر کرنے والے مسلمانوں کی اکثریت اسلام پر حملے کے طور پر لیتی ہے۔

میرے اس مضمون کو دو ایسی مثالیں خوب سجاتی ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ بڑی گہری مماثلت رکھتی ہیں، ان مثالوں کے لیے ہم پیچھے مڑ کر دیکھ سکتے ہیں اور انیسویں صدی کے اس دور کو یاد کر سکتے ہیں جب مشرق میں اسلامی علاقوں پر فرانس اور برطانیہ دونوں نے قبضہ کر رکھا تھا اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی بازی لگا رہے تھے، یہ ایک ایسا دور تھا جس میں مشرق کو سمجھنے اور اس کی کردار نگاری کے ذرائع میں نہ صرف تکنیکی جدت آئی بلکہ انھیں ایک ترقی یافتہ شکل بھی ملی، اس کے بعد فرانسیسی سکالروں نے تو بیس سال کی

مختصر مدت میں مشرق کے مطالعہ کے اپنے پرانے طریقے کو بدل ڈالا اور اس کی جگہ عقلی دلائل پر مشتمل ضابطہ مرتب کر لیا، ہم جانتے ہیں کہ نپولین بوناپارٹ (Napoleon Bonapart) نے 1793ء میں مصر پر قبضہ کیا تھا مگر اس قبضے سے متعلق اہم بات یہ ہے کہ اس نے سائنسدانوں کے ایک گروپ کو یہ فریضہ سونپا تھا کہ وہ اس کے کام کو زیادہ موثر بنائیں۔ اس بات کو یہاں اٹھانے سے میرا مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ مختصر مدت کے لیے مصر پر نپولین کے قبضے نے ایک باب کو مکمل کر دیا تھا اور اس سے ایک نیا اور طویل دور شروع ہوا تھا جس میں سلوسٹر ڈی سیکی کے زیر نگرانی مشرق کے مطالعہ کے فرانسیسی ادارے نے کچھ اس طرح سے کام کیا کہ مشرقی علوم کو سمجھنے اور سمجھانے میں فرانس کو دنیا بھر پر فوقیت حاصل ہو گئی، یہ بات اس وقت اپنی انتہا کو پہنچی جب 1830ء میں فرانس نے الجزائر پر قبضہ کر لیا۔

آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیجیے گا کہ میں ایک چیز کو دوسری کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کر رہا ہوں یا میں علم وادب کے مخالفین کے اس نکتہ نظر کو اختیار کرنے کی فکر میں ہوں کہ تمام سائنسی مطالعے آخر کار تشدد کی طرف ہی لے جاتے ہیں اور دکھلاتے ہیں، میرا تو کہنا فقط اتنا ہے کہ سلطنتیں فوری طور پر وجود میں نہیں آتیں اور آج کے جدید دور میں بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ انھیں وقتی تدابیر سے قائم رکھا جائے، سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اگر سیکھنے کے عمل کی ترقی کے معنی یہ ہیں کہ سائنسدان انسانی تجربات کے میدان کی تعمیر نو کریں، اس کی نئی تشریح سامنے لائیں تو اس صورت میں یہ لازم ہو جاتا ہے کہ ان کا مقام اور ان کی حیثیت اس مضمون سے بلند ہو جس کا وہ مطالعہ کر رہے ہیں، اگر ہم اس بات کا رخ سیاستدانوں کی طرف موڑ دیں تو شاید یہ کہنا گستاخی کے زمرے میں نہیں آئے گا کہ ایسی ہی ترقی کی ضرورت اس میدان میں بھی ہے اور سیاستدانوں کی حکمرانی کے دائرے کی نئی تشریح کرتے ہوئے ہم اس میں دنیا کے ان ''کمتر'' علاقوں کو بھی شامل کر سکتے ہیں، جہاں نئے ''قومی'' مفادات کو تلاش کر لینا ممکن ہے اور جن علاقوں کی قریبی نگرانی کو جاری رکھنا دشوار نہیں ہوتا، اس بات کو ہم مصر کے تناظر میں سمجھ سکتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ اگر انگلینڈ نے مشرق کے اس مطالبے پر بھرپور سرمایہ کاری نہ کی ہوتی جس پر سب سے پہلے ایڈورڈ ولیم لین (Edward Willim Lane) اور ولیم جونز (William Jones) نے کام شروع کیا تھا تو وہ مصر پر اتنی کامیابی کے ساتھ نہ تو حکمرانی کر سکتا تھا، اور نہ وہاں اپنے ادارے ہی قائم کر سکتا تھا، مشرقی علوم کے ان برطانوی ماہرین کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے جب مشرق کے مطالعے کی طرف قدم بڑھایا تو سب سے پہلے اس بات پر توجہ دی کہ مشرق کی کون سی ایسی چیزیں ہیں جو اہل مغرب کو اجنبی معلوم نہیں ہوں گی، پھر انھوں نے اس پر غور کیا کہ مشرق تک رسائی کے کون کون سے ذرائع ہیں اور پھر اس بات کو سوچا کہ

ان تمام باتوں کو کس طرح پیش کیا جائے، چنانچہ اس مطالعے کے بعد انھوں نے اہل یورپ کو اس بات کا یقین دلا دیا کہ مشرق کی نہ صرف سیر بلکہ اس کا مطالعہ بھی کیا جا سکتا ہے اور اسے اپنے زیرِ انتظام لانا یورپ کے لیے ممکن ہے، اس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اب مشرق کو خود سے دور رکھنے کی ضرورت نہیں رہی، اس کی شان و شوکت پر حیران ہونا بھی اب لازم نہیں رہا اور نہ اب اس وہم میں مبتلا رہنے کی ضرورت ہے کہ مشرق ہماری فہم و فراست سے بالاتر ہے، یہ تمام باتیں اس لیے بھی اب کوئی معنی نہیں رکھتیں کیونکہ مشرق دولت سے مالا مال ہے اور ہم اس دولت کو اپنے گھر لا سکتے ہیں، ان دانشوروں نے بڑے سادہ انداز میں اہل یورپ کو یہ بات سمجھائی کہ وہ بڑی آسانی کے ساتھ مشرق پر قبضہ کر سکتے ہیں چنانچہ کچھ عرصہ بعد اہل یورپ نے ایسا ہی کیا۔

اس سلسلے کی دوسری مثال آج کی دنیا سے متعلق ہے۔ آج کا اسلامی مشرق اپنے وسائل اور اپنے جغرافیائی محلِ وقوع کی بدولت بڑی اہمیت رکھتا ہے، تاہم ان میں سے کسی کو بھی مشرقی باشندوں کے مفادات، ان کی ضروریات اور آرزوؤں کا متبادل قرار نہیں دیا جا سکتا، جب سے دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی ہے امریکا اسلامی دنیا پر وہی غلبہ اور تسلط حاصل کر رہا ہے جو کبھی برطانیہ اور فرانس کو حاصل تھا اس نے خلیج فارس میں اپنے اقتصادی مفادات کے تحفظ کے لیے 1991ء میں جنگ لڑی، اس نے سوویت یونین کے خلاف افغان رضا کاروں کو اسلحہ فراہم کیا، اس نے دریائے اردن کے مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی میں اسلامی جنگجوؤں کے خلاف اسرائیل سے تعاون کیا اور اسے وہ معلومات فراہم کیں جو ریسرچ اور جاسوسی سے اسے حاصل ہوئی تھیں، برطانیہ اور فرانس کی جگہ امریکا کے چھا جانے سے دو باتیں ہوئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اسلام کے متعلق بحرانوں سے لبریز ایک علمی اور ادبی دلچسپی پیدا ہوئی ہے اور اس کی ماہرانہ جانچ پڑتال کا شوق ابھرا ہے، دوسری بات تکنیکی انقلاب کی ہے، یہ تکنیکی انقلاب نجی شعبے میں پریس اور الیکٹرانک جرنلزم کی صنعت میں آیا ہے اور صورت یہ بنی ہے کہ اس سے پہلے ایران، بوسنیا کو کبھی عالمی سطح پر ہنگامہ خیز علاقے کی حیثیت نہیں دی گئی تھی اور ان کے متعلق میڈیا پر اتنی باقاعدگی کے ساتھ اور فوری طور پر خبروں اور تبصروں کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا، اسی کا نتیجہ ہے کہ ایران امریکیوں کی زندگیوں میں تو داخل ہو گیا ہے مگر اس کے باوجود ان سے بڑی شدت کے ساتھ اسی طرح کی دوری اختیار کیے ہوئے ہے، جیسی 1990ء میں بوسنیا نے اختیار کر رکھی تھی، امریکی غلبے سے جو دو باتیں ظہور پذیر ہوئی ہیں ان میں دوسری پہلی سے زیادہ قوی ہے اور ان دونوں کی وجہ سے یونیورسٹی، حکومت اور تجارتی ماہرین کے ایک بڑے طبقے نے اسلام اور مشرق وسطیٰ کے مطالعے پر توجہ کی ہے، نتیجہ یہ ہوا

ہے کہ اسلام، مغرب میں خبریں سننے والوں کے لیے ایک جانا پہچانا موضوع بن گیا ہے، اس نے قریب قریب ساری اسلامی دنیا کو امریکیوں کے لیے ایک عام سی گھریلو بات بنا دیا ہے یا کم از کم ان باتوں کو گھر گھر پہنچا دیا ہے جو خبر کے لائق سمجھی جاتی ہیں، اس طرح تاریخ میں مغرب اس مقام پر آ پہنچا ہے کہ اس کے پاس ثقافت اور اقتصادیات پر بات کرنے کے لیے موضوع کی کوئی کمی نہیں رہی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آج تک مغرب سے باہر کوئی بھی علاقہ امریکا کے اتنا زیرِ تسلط نہیں رہا جتنا کہ آج کی عرب اسلامی دنیا ہو گئی ہے، اس طرح اسلام اور مغرب بلکہ موجودہ صورت حال میں اسلام اور امریکا کے درمیان خبروں کا تبادلہ یک طرفہ ہو گیا ہے اور جہاں تک اسلامی دنیا کے ان حصوں کا تعلق ہے جن کی خبر کے حساب سے کوئی اہمیت نہیں بنتی ان کے ساتھ تو روابط بہت نچلی سطح پر ہیں۔

یہ کہنا برائے نام مبالغہ آمیز ہوگا کہ مسلمانوں اور عربوں کو خبروں میں بنیادی طور پر اہمیت دی جاتی ہے، انھیں زیرِ بحث لایا جاتا ہے اور انھیں تیل سپلائی کرنے والے اور ممکنہ دہشت گرد کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، آبادی کی کثرت اور عرب مسلم زندگی کے جذبات جیسے معاملات کے متعلق بہت کم تفصیل سامنے آتی ہے، یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جن کا پیشہ ہی اسلامی دنیا سے متعلق اطلاعات فراہم کرنا ہے، انھیں بھی ایسی باتوں کا ادراک نہیں ہوتا، اس سے ہٹ کر ہمارے سامنے جو بات آتی ہے، وہ اسلامی دنیا کے متعلق محدود سوچ کے خام اور بنیادی طور پر اصلیت سے ہٹے ہوئے ایسے خاکوں کا سلسلہ ہوتا ہے جو دوسرے عیبوں کے ساتھ ساتھ اس بات کو بھی ابھارتا ہے کہ اسلامی دنیا غیر ملکی فوجی حملوں کا مقابلہ کرنے میں کمزور نظر آتی ہے، میں نہیں سمجھتا کہ 1970ء میں جب خلیج عرب میں امریکا کی فوجی مداخلت پر بات چھڑی، یا کارٹر کا نظریہ موضوع بحث بنایا گیا، ایک ایسی امریکی فوج کے قیام کی ضرورت پر مباحثہ ہوا، جسے بڑی تیزی کے ساتھ محاذ تک پہنچایا جا سکے یا ''سیاسی اسلام'' کے فوجی اور اقتصادی ''گھیراؤ'' کی بات چھڑی تو یہ سب باتیں اتفاقیہ ہو رہی تھیں اور ان کے پیچھے کوئی واضح مقصد نہیں تھا، یہ سوچنا اس لیے بھی درست ٹھہرتا ہے کیونکہ اس سے پہلے ایک ایسا دور گزر چکا تھا، جس میں ٹیلی وژن پر بڑے ٹھنڈے میٹھے انداز میں بڑی دانشمندی اور مشرق کے ''حقیقی مطالعے'' کی روشنی میں ''اسلام'' کو پیش کیا جاتا رہا تھا، اگرچہ اس پیشکش میں جدید دور کے حقائق کا عکس نظر نہیں آتا تھا یا اس کے ''مقاصد'' میں پروپیگنڈہ زیادہ حاوی دکھائی دیتا تھا، بہرکیف یہ دور گوارا تھا اور اس سے گزرنے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج کے حالات رگوں میں لہو کو منجمد کر دینے والے انیسویں صدی کے اس برطانوی اور فرانسیسی دور سے گہری مماثلت رکھتے ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

اس کی کچھ اور سیاسی اور ثقافتی وجوہ بھی ہیں، دوسری جنگ عظیم کے بعد جب امریکا نے فرانس اور برطانیہ جیسی حکمرانی کا کردار سنبھالا، تو اس نے دنیا کے ساتھ معاملہ کرنے کے لیے پالیسیاں وضع کیں، جو اس علاقے کی خصوصیات اور مسائل سے مطابقت رکھتی تھیں جو علاقہ امریکی مفادات پر اثر انداز ہو سکتا تھا، یا امریکی مفادات کی زد میں آتا تھا، اس مخصوص صورت حال میں یورپ کے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ وہ جنگ سے تباہ ہونے والے علاقوں کی بحالی پر توجہ دے، اس کے لیے اور اس سے ملتی جلتی دوسری امریکی پالیسیوں کے لیے مارشل پلان وضع کیا گیا تھا، اس میں کوئی شک نہیں کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد سوویت یونین امریکا کے حریف کے طور پر ابھرا، اور یہ کسی کو بتانے یا سمجھانے کی بات نہیں ہے کہ سرد جنگ کے زمانے میں ایسی پالیسیاں وجود میں آئیں، ایسے مطالعے ہوئے اور یہاں تک کہ ایسی ذہنیت بن گئی جو ایک سپر پاور کے دوسری سپر پاور کے ساتھ تعلقات پر حاوی ہو کر رہ گئی ہے، سرد جنگ کے خاتمے کے بعد امریکا اور ان مختلف علاقائی قوتوں کے درمیان رسہ کشی کے لیے تیسری دنیا کا میدان رہ گیا ہے جن قوتوں نے ان علاقوں پر قبضہ کر رکھا ہے جنھیں یورپ کے نوآبادیاتی نظام سے حال ہی میں آزادی حاصل ہوئی ہے۔

شروع شروع میں امریکی پالیسی سازوں کو ساری کی ساری تیسری دنیا ''غیر ترقی یافتہ'' معلوم ہوئی اور انھوں نے یہ اندازہ قائم کیا کہ تیسری دنیا زندگی کے اس ''روایتی'' انداز میں جکڑی ہوئی ہے، جو قدیم بھی ہے اور اس پر جمود بھی طاری ہو چکا ہے، انھوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کا جھکاؤ خطرناک حد تک اشتراکیت کی طرف ہے اور اس کے اندر بگاڑ کی صورتیں پیدا ہو رہی ہیں، چنانچہ امریکا کے لیے تیسری دنیا کو جدید خطوط پر استوار کرنا وقت کا تقاضا بن گیا، پھر وہ ہوا جس کا ذکر جیمز پیک (James Peck) نے کچھ یوں کیا ہے کہ ''جدیدیت کا یہ نظریہ اس دنیا کے لیے ایک نظریاتی حل کی حیثیت رکھتا تھا جہاں انقلابی اکھاڑ پچھاڑ تیز تر ہو رہی تھی اور روایتی سیاسی شخصیات کے درمیان ایک دوسرے کے خلاف ردعمل دیکھنے میں آ رہا تھا'' نتیجہ یہ ہوا کہ کمیونزم کا راستہ روکنے اور امریکی تجارت کو فروغ دینے کے لیے افریقہ اور ایشیا کے اندر بڑی بڑی رقوم پہنچائی گئیں اور اس طرح ان ممالک میں امریکا کے حامیوں کا ایک ایسا طبقہ قائم کرنے کی کوشش کی گئی جو ان پسماندہ ممالک کو چھوٹے امریکا میں بدل کر رکھ دے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان ممالک میں امریکا نے جو سرمایہ کاری کی تھی اس کے لیے مزید رقم کی ضرورت پیش آئی اور جن لوگوں کی پرورش کی گئی تھی ان کو اپنا کام جاری رکھنے کے لیے امریکا کی فوجی حمایت کی بھی ضرورت پڑی اور انھیں یہ فوجی حمایت فراہم کر دی گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاطینی امریکا اور ایشیا بھر میں امریکا کی نہ صرف فوجی مداخلت کا سلسلہ چل نکلا بلکہ اسے بڑی اور

باقاعدگی کے ساتھ ہر طرح کی مقامی قوم پرستی کا سامنا بھی کرنا پڑا۔

تیسری دنیا کو جدید اور ترقی یافتہ خطوط پر ڈھالنے کی امریکی کوششوں کی تاریخ کو اس وقت تک مکمل طور پر نہیں سمجھا جا سکتا، جب تک کہ اس بات پر توجہ نہ دی جائے کہ تیسری دنیا کے متعلق پالیسی نے بذات خود سوچنے اور حالات کو دیکھنے کا ایک خاص انداز پیدا کر دیا تھا، چنانچہ تیسری دنیا میں جدیدیت کے نام پر سیاسی، جذباتی اور دفاعی میدانوں میں سرمایہ کاری میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا، ویت نام اس کی بہترین مثال ہے، ایک دفعہ جب یہ فیصلہ ہو گیا کہ اس ملک کو کمیونزم سے اور ساتھ ہی ساتھ اس کے اندر پرورش پانے والے رجحانات سے بھی بچانا ہے تو اسے جدیدیت کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے ایک مکمل سائنسی منصوبے کو مرتب کیا گیا، جس میں نہ صرف امریکی حکومت کے ماہرین بلکہ یونیورسٹی کے ماہرین کو بھی شامل کیا گیا، چنانچہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بالآخر وہ مقام بھی آیا کہ سیگاؤں کی امریکی نواز اور کمیونزم مخالف حکومت کی بقا ہر چیز پر مقدم ہو گئی، یہ طرز عمل اس بات کے معلوم ہو جانے کے بعد بھی ترک نہیں کیا گیا کہ آبادی کی بھاری اکثریت سیگاؤں حکومت کو غیر ملکی اور ظالم و جابر تصور کرتی ہے، امریکی سوچ میں اس بات سے بھی کوئی تبدیلی نہ آئی کہ جن حکومتوں کو بچانے کے لیے یہ ناکام جنگ لڑی جا رہی ہے، انھوں نے سارے علاقے کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے نتیجہ یہ ہوا کہ لنڈن جانسن (Lyndon Johnson) کو اپنی صدارت سے اس کوتاہی کی قیمت چکانا پڑی، یہ سب ہو جانے کے باوجود روایتی سوسائٹی کو جدید بنانے کی خوبیوں پر اتنا زیادہ لکھا گیا ہے کہ اس نے امریکا میں ایسی سماجی اور کسی حد تک ثقافتی سند کی حیثیت حاصل کر لی ہے جس پر انگلی نہیں اٹھائی جا سکتی، ساتھ ہی ساتھ تیسری دنیا کے عوام کے ذہنوں میں جدیدیت کے معنی یہ ہو کر رہ گئے ہیں کہ احمقانہ انداز میں دولت خرچ کی جائے، غیر ضروری مشینری اور اسلحہ کا ڈھیر لگا لیا جائے، بددیانت حکمران مسلط ہو جائیں اور چھوٹے اور کمزور ممالک کے معاملات میں امریکا انتہائی سنگدلانہ انداز میں مداخلت کرے۔

جدیدیت کے نظریے نے جس قدر فریب نظر عطا کیے، ان میں سے ایک کا اسلامی دنیا سے خصوصی تعلق تھا اور وہ واہمہ یہ تھا کہ امریکا کی آمد سے پہلے اسلام اپنے ایسے بچپن سے گزر رہا تھا جو وقت کی قید سے آزاد تھا، اسے توہمات کے پھندے میں پھنسا کر حقیقی ترقی سے دور کر دیا گیا تھا، اس کے عجیب و غریب علما اور فقہا نے اسے قرونِ وسطیٰ میں سے نکل کر دور جدید میں داخل ہونے سے روک رکھا تھا، یہ واہمہ یا نظریہ ایسا تھی، جس نے جدیدیت اور مشرقیت کو ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ کر دیا تھا، جیسا کہ مشرقیت کے سکالروں کو روایتی طور پر یہ بات پڑھائی جاتی ہے کہ مسلمان تقدیر پر بھروسا کرنے والے بچوں کی طرح ہیں،

ان کے ذہنوں میں جو بات بیٹھ چکی ہے اس نے، ان کے علما نے، وحشت زدہ آنکھوں والے ان کے لیڈروں نے، انھیں اس راہ پر ڈال دیا ہے کہ وہ مغرب اور اس کی ترقی کی مخالفت کریں اگر یہ بات درست ہے تو کیا اس صورت میں ہر اس سیاسی سائنسدان، ماہر بشریات اور ماہر سماجی علوم پر یہ لازم نہیں تھا کہ وہ اس بات کی طرف توجہ مبذول کراتا کہ اگر مناسب موقع فراہم کیا جائے تو اشیائے صرف اور ''اچھے'' لیڈروں کے ذریعے، اسلام میں امریکی طرزِ حیات سے ملتی جلتی کوئی چیز متعارف کرائی جا سکتی ہے؟ اسلام کے ساتھ بنیادی مشکل یہ ہے کہ ہندوستان اور چین کے برعکس اسے نہ تو کبھی تھپک تھپک کر سلایا جا سکا اور نہ ہی اسے شکست دی جا سکی ہے، ایسے دلائل جو ہمیشہ دانشوروں کی فہم و فراست سے بالاتر رہے ہیں وہ اس حقیقت کو بیان کرتے تھے کہ اسلام کی اس کے پیروکاروں پر گرفت بڑی مستحکم ہوتی ہے اور یہ پیروکار کسی ایسی حقیقت یا جزوی حقیقت کو قبول کرنے کو تیار نہیں تھے، جس میں اسلام سے ہٹ کر مغرب کی بالادستی کا اظہار ہوتا ہو۔

دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد دو عشروں تک جدیدیت کو عام کرنے کی کوششیں ہوتی رہیں اور یہ حقیقت ہے کہ ایران جدیدیت کی کامیابی کے ایک نمونے کے طور پر پیش کیا جانے لگا تھا اور اس کے فرمانروا کو جدید اقدار میں ڈھلا ہوا ایک شاندار رہنما ظاہر کیا جانے لگا تھا، جہاں تک دوسری اسلامی دنیا کا تعلق تھا، مصر کے جمال عبدالناصر، انڈونیشیا کے سوئیکارنو، فلسطینی قوم پرست، ایران میں مخالفین کے مختلف گروپوں، ہزاروں غیر معروف مسلم اساتذہ، اخوانین اور تنظیموں کی یا تو مخالفت کی جاتی تھی یا مغربی سکالر انھیں اس لائق نہیں سمجھتے تھے کہ انھیں اس بھاری سرمایہ کاری میں شامل کر لیا جائے جو جدیدیت کے نظریے پر کی جا رہی تھی یا انھیں بھی اسلامی دنیا کے متعلق امریکا کی حکمت عملی اور اقتصادی مفادات کا حصہ بنا لیا جائے۔

ستر کی دہائی کے دھماکا خیز دور میں اسلام نے ثابت کیا کہ وہ انتہاپسندی کی حد تک بنیاد پرستی کا قائل ہے اس کی مثال ایران کا انقلاب تھا جو نہ تو کمیونزم کا حمایتی تھا اور نہ جدیدیت کا طرفدار، اس لیے جن لوگوں نے شاہ کا تختہ الٹا، وہ جدیدیت کی اس نظریے پر پورے ہی نہیں اترتے تھے جس میں پہلے سے ہی مفروضے قائم کر لیے جاتے ہیں، پھر وہ جدیدیت کے ان تحفوں کے بھی طلب گار نہیں تھے جو کاروں، فوج اور حفاظتی کارروائیوں سے متعلق آلات کی بھرمار اور مستحکم حکومت کی شکل میں میسر آتے ہیں، وہ تو ''مغربی'' تصورات کی چکنی چپڑی باتوں سے بھی بے نیاز تھے، ان میں سے خاص طور پر (امام) خمینی کا رویہ یہ تھا کہ وہ سیاست کے کسی ایسے انداز کو قبول کرنے کو تیار نہیں تھے جو ان کا اپنا نہ ہو، ان کے اس انداز میں ایک تو سخت گیری تھی اور دوسرے اس سے یہ سمجھا جاتا تھا کہ ایرانی دانشمندی سے کام نہیں لے رہے، پھر یہ نکتہ بھی بڑی اہمیت رکھتا تھا کہ

ان کی وابستگی ایک ایسے اسلام سے تھی جو ایرانی تھا، جس کے لیے لڑائی لڑی گئی تھی، جس کا بڑے جنونی انداز میں دفاع کیا گیا تھا، اور جو خاص طور پر بڑا سرکش معلوم ہوتا تھا، یہ بڑی ستم ظریفی کی بات ہے کہ ''اسلام'' کی رجعت پسندی اور اس کی قرونِ وسطیٰ کی منطق کو مغرب کے بہت کم مبصروں نے پہچانا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ ایران کے مغرب میں چند میل کے فاصلے پر بگین کی وہ اسرائیلی حکومت موجود ہے، جو اپنے اقدامات کے لیے نہ صرف مذہبی سند لا سکتی ہے بلکہ انتہائی پس ماندہ معلوم ہونے والے دینی نظریات سے بھی کام لے سکتی ہے، ان سے بھی کم تعداد ان مبصروں کی تھی جو مذہب کے طور پر اسلام کی اٹھان کی مذمت کر رہے تھے اور اس کا سلسلہ امریکا میں ٹیلی وژن پر مذہب کے ان پروگراموں سے جوڑ رہے تھے جن کے دیکھنے والوں کی تعداد لاکھوں میں پہنچتی ہے یا وہ بات کو کھینچ کر اس طرف لے جا رہے تھے کہ 1980ء کے صدارتی انتخاب میں کھڑے ہونے والے تین امیدواروں میں سے دو کا شمار ان میں ہوتا ہے جو پرجوش انداز میں عیسائیت کی طرف مائل ہیں۔

اس زمانے میں یہ طرزِ عمل عام ہوا کہ مستشرقین نے جو باتیں بیان کی تھیں ان میں سے ایک یا دو کو لے کر اسے پورے عالم اسلام پر تھوپ دیا جاتا تھا اور اس سلسلے میں یہ جاننے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی جاتی تھی کہ جو بات کی جا رہی ہے کیا وہ ہر مسلمان کے رویے کے متعلق درست ثابت ہوتی بھی ہے یا نہیں؟ اس قسم کی بہت سی حرکتیں، برنارڈ لیوئس جیسے ان مستشرقین نے کیں جو ضعیف العمر ہو چکے تھے، پھر یہ باتیں خاص طور پر ان مباحثوں میں زیادہ پھیلائی جاتی تھیں جن کا مقصد اسلام اور دہشت گردی کو ایک دوسرے کا لازم و ملزوم قرار دینا ہوتا تھا، اس سلسلے میں کونر کروز اوبرائین (Conor Cruise O'Brien) کا ذکر ضروری ہو جاتا ہے، اوبرائین کا پہلے بائیں بازو کے دانشوروں میں شمار ہوتا تھا، پھر آہستہ آہستہ وہ 1980ء کے عشرے کے دوران قدامت پسند دائیں بازو کے دانشوروں میں شامل ہو گیا۔ اس نے جنوبی افریقہ کی نسلی امتیاز کی پالیسی کے خلاف جو ثقافتی بائیکاٹ کر رکھا تھا اگرچہ اس نے اس بائیکاٹ کو بھی ختم کر دیا اور وہ اسرائیل میں دائیں بازو کی صیہونیت پسندی کی حمایت میں بڑا زور مارتا رہا، اس کے باوجود وہ کسی نہ کسی طرح اپنی اس شہرت کو بچانے میں کامیاب ہو گیا جو اسے ایک سنجیدہ ترقی پسند دانشور قرار دیتی تھی، ذیل میں اس کی تحریر کا ایک اقتباس دیا جا رہا ہے۔ اگرچہ اس مضمون میں نہ صرف اس کے سست اور بیزار تاریخی فیصلوں کی جھلک دکھائی دیتی ہے بلکہ حد سے بڑھی ہوئی عام طرزِ فکر، اور ایسی لگی بندھی ڈگر پر چلنا بھی صاف محسوس ہوتا ہے جسے ہر وہ شخص بیہودہ قرار دے گا جس کا اسلام سے کوئی تعلق بنتا ہے، یہ اقتباس اس کے مضمون ''دہشت گردی کے متعلق غور و فکر'' (Thinking About Terrorism) سے لیا گیا ہے جو دی اٹلانٹک کی جون 1986ء کی اشاعت کے صفحہ 65 پر

درج ہے، اس میں او برائین کہتا ہے کہ:

> بعض ثقافتوں اور ان کی ذیلی ثقافتوں کا مقدر یہ ہے کہ وہ ناکام مقاصد کا گڑھ اور دہشت گردی کے پرورش کرنے والی بن جائیں۔ اسلامی ثقافت اس کی بہترین مثال ہے (یہاں او برائین ہمیں یہ نہیں بتاتا کہ اس نے اس مثال میں مذہب سے کیسے ثقافت کی طرف چھلانگ لگادی ہے)، یہ ثقافت دنیا میں اپنے جائز مقام کے متعلق اپنی ایک الگ سوچ رکھتی ہے (او برائین ہمیں یہ بھی نہیں بتاتا کہ اس نے یہ آگاہی کہاں سے حاصل کی ہے) اور اسلامی ثقافت کی یہ سوچ ہم عصر دنیا میں رائج نظام سے میل نہیں کھاتی (اس کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ دنیا کی یہ ثقافت ''اپنے متعلق ایسی ہی سوچ'' رکھتی ہے) اور یہ سوچ یوں ہے کہ یہ اللہ کی مشیت ہے کہ بیت الاسلام کو بیت الحرب (غیر مسلموں) پر فتح حاصل ہو اور اس فتح کا انحصار روحانی وسائل تک محدود نہیں ہے، ایرانی بنیاد پرستوں کا گلف میں (88-1980ء کی ایران عراق جنگ کے دوران) یہ نعرہ رہا ہے کہ ''اسلام کے معنی فتح ہیں'' اسی سوچ نے بیت الحرب پر ضرب لگانے کو قابل ستائش قرار دیا اور اسی کے نتیجے میں بڑے پیمانے پر ان سرگرمیوں کو حمایت حاصل ہوئی جن کی مغرب میں دہشت گردی کہہ کر مذمت کی جاتی ہے (خیال رہے کہ او برائین نے اپنے قاری کو یہ بتانے کی زحمت نہیں کی کہ وہ کن ذرائع، حوالے یا سیاق وسباق سے یہ نتائج اخذ کر رہا ہے اور نہ وہ دلائل پیش کرنے کے اپنے اس عجیب طریقے پر فکر مند دکھائی دیتا ہے)، ان سرگرم افراد کا بڑا نشانہ اسرائیل ہے (اسرائیل نے کیا، کیا ہے یا کیا کر رہا ہے، او برائین کے نزدیک اس کا اس مسئلے سے کوئی تعلق نہیں بنتا اور وہ سمجھتا ہے کہ یہ سب کچھ خالص اسلامی دہشت گردی سے متعلق ہے) اور اگر اسرائیل مٹ بھی جائے تو یہ سرگرمیاں ختم نہیں ہوں گی۔

اس طرح مذہبی شدت پسندی، خاص طور پر اس مذہبی شدت پسندی کو صرف اسلام کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے جس میں ہنگامہ آرائی شامل تھی، حالانکہ یہ وہ دور تھا جب مذہبی جذبات ہر طرف پھیل رہے تھے، اس سلسلے میں یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کی ہے کہ لبرل پریس نے سول زنیٹی سین (Solzhenitsyn)[1] یا پوپ

1۔ الیگزینڈر آئسووچ سولزنیٹی سین، روسی ناول، ڈراما نگار اور تاریخ دان، اس سے سوویت یونین میں محنت کشوں کے حالات سے پردہ اٹھایا تھا، جس پر اسے 1974ء میں ملک بدر کر دیا گیا تھا، مغربی تصورات کا زبردست حامی تھا، اسے نوبل انعام بھی ملا تھا۔ (مترجم)

جان پال دوم جیسی مذہبی اعتبار سے متعصب شخصیات کے ساتھ بڑا نرم رویہ اختیار کیے رکھا، اور جب بوسنیا میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا تو توقع یہ تھی کہ مذہب کے حوالے سے پریس نے اسلام کے متعلق جو طرز عمل اختیار کر رکھا ہے اسی کی پیروی کرتے ہوئے بوسنیا کے قتل عام کی ذمہ داری عیسائیت پر ڈالی جائے گی، مگر ایسا نہیں ہوا، جس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اسلام کے خلاف پریس کا رویہ یک طرفہ طور پر جارحانہ ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ مذہبی جذبات ہر طرف پھیل رہے تھے، عیسائی، یہودی سبھی اس طرف مائل ہو رہے تھے، ایسے میں اسلام سے مسلمانوں کی رغبت کے بڑھنے نے اس دروازے کو کھول دیا تھا جس سے گزر کر، سعودی عرب نے کیمپ ڈیوڈ کے معاہدوں کی توثیق سے انکار کر دیا تھا اس سے لے کر پاکستان، افغانستان، الجزائر جیسی اسلامی ریاستوں کے طرز عمل کی وضاحت آسان ہوگئی تھی اس طرح یہ جان لینا بھی ممکن ہوگیا تھا کہ مغرب خاص طور پر امریکا، دنیا کے اس حصے سے اسلامی ممالک کو کس اعتبار سے مختلف سمجھتا ہے، جس پر سرد جنگ کے تجزیے کا اطلاق ہو سکتا ہے، اس میں کچھ کلام نہیں کہ سرد جنگ نے ایک بڑا جامع کردار ادا کیا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ اس نے کچھ اسلامی ممالک میں بد دیانتی اور جبر وتشدد کو بھی پھیلایا ہے مگر جہاں تک مغرب کی سوچ کا تعلق ہے تو کوئی ایسا طریقہ موجود نہیں ہے کہ سعودی عرب اور کویت کو ''آزاد دنیا کا حصہ'' قرار دیا جاسکے، یہاں تک کہ ایران جو شاہ کے زمانے میں بہت بڑھ چڑھ کر سوویت یونین کا مخالف تھا وہ بھی امریکا کا وہ قرب حاصل نہیں کر سکا جو فرانس اور برطانیہ کو حاصل تھا، ان حقائق کے باوجود امریکا میں پالیسی بنانے والوں نے ایران کے ''کھو'' جانے کا تذکرہ جاری رکھا اور اسی طرح پچھلے تین عشروں میں وہ چین، ویت نام اور انگولا کے ''کھو'' جانے کا بھی ذکر کر رہے ہیں، اس تناظر میں ذرا خلیج فارس کی اسلامی ریاستوں کا مقدر دیکھیے کہ بحران کے امریکی منتظمین یہ یقین رکھتے ہیں کہ یہ ریاستیں امریکا کے فوجی قبضے کے لیے تیار ہیں اس بات کو جارج بال (George Ball) نے نیو یارک ٹائمز میگزین کے 28 رجون 1970ء کے شمارے میں یوں بیان کیا کہ ''ویت نام کا المیہ'' امریکا کو داخلی طور پر نرم رویے اور دوسروں سے الگ تھلگ رہنے کی طرف لے جاسکتا ہے، لیکن مشرق وسطیٰ میں امریکا کے مفادات اس قدر زیادہ ہیں کہ صدر کو چاہیے کہ وہ امریکیوں کو ان علاقوں میں فوجی مداخلت کے لیے ''ذہنی طور پر تیار کریں'' یہاں یہ بات بتانا ضروری ہے کہ 1991ء میں جب خلیجی جنگ ہوئی تو اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ امریکیوں کے ذہنوں پر ویت نام میں شکست کا جو دکھ مسلط ہے اس جنگ کے ذریعے اس سے چھٹکارا حاصل کر لیا جائے۔

یہاں اس بات کا تذکرہ بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد اسرائیل کا کردار یہ بن

گیا ہے کہ وہ اسلام کے متعلق مغربی، خاص طور پر امریکی باشندوں کے خیالات کی پرورش کرے، اس میں پہلی بات تو یہ ہوئی ہے کہ مغربی پریس میں اسرائیل کے مذہبی کردار کا ذکر نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے، ابھی حال ہی میں اسرائیل کے مذہبی جنون کا کچھ دبا دبا سا حوالہ سامنے آیا ہے اور وہ بھی اس یہودی گش ایمونم (Gush Emunim) کے جوش کی وجہ سے سامنے آیا جس نے مغربی کنارے پر غیر قانونی بستیاں قائم کرنے کے لیے تشدد کا سہارا لیا تھا، عام طور پر مغرب میں اسرائیل کے جنگجو آبادکاروں کے تذکرے سے گریز کیا جاتا ہے اور اس تلخ حقیقت کو بھی سامنے نہیں لایا جاتا کہ عرب مقبوضہ علاقے میں غیر قانونی بستیوں کی تعمیر کا کام ان مذہبی جنونیوں نے شروع نہیں کیا تھا، جواب حالات کا خراب کرنے میں لگے ہوئے ہیں بلکہ اسے اسرائیل کی ''سیکولر'' لیبر حکومت نے شروع کیا تھا۔ اس طرح کی یک طرفہ رپورٹنگ، میرے نزدیک اس بات کا پتا دیتی ہے کہ امریکیوں نے کس طرح مشرق وسطیٰ میں ''واحد جمہوریت'' اور ''ہمارا زبردست حلیف'' کہہ کہہ کر اسرائیل کو اسلام کے لیے ایک کند تلوار کے طور پر استعمال کیا ہے، چنانچہ اسرائیل اپنی جس قدر ستایش کرے یا خود کو مبارکباد دے مگر یہ حقیقت اٹل ہے کہ مغربی تہذیب نے اس خطے کے ایک علاقے میں اسلامی جنگل کو کاٹ کر جو قطعہ تیار کیا ہے اس میں اسرائیل ایک برج کی طرح ایستادہ ہے، دوسری بات یہ کہ امریکا کے نزدیک اسرائیل کے تحفظ کا اس بات سے بڑا گہرا تعلق ہے کہ وہ جب چاہے اس کا ڈراوا یا دباؤ دے کر عالم اسلام سے اپنا مطلب نکال سکتا ہے، اس کی نظر میں اسرائیل نے مغرب کی بالادستی کو دوام بخشا ہے اور اس سے جدیدیت کی خوبیاں بھی نمایاں ہوئی ہیں، اس طرح تین تصورات وجود میں آئے، ایک کا تعلق تو اسلام سے، دوسرے کا جدیدیت کے نظریات سے اور تیسرے کا اس بات سے تھا کہ مغرب کے لیے اسرائیل کی جو افادیت ہے اس کی توثیق کے عمل کو جاری رکھا جائے، چنانچہ ان تصورات کو مستحکم کرنے کے لیے یہ طے پایا کہ مغرب کے تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون جاری رہے گا۔ اقتصادی رشوت کا سلسلہ بھی چلے گا اور مشرق پر مغرب کی بالادستی کو مسلسل بڑھانے کے اقدامات بھی کیے جائیں گے۔

اس کے ساتھ ساتھ امریکیوں نے اسلام کے بارے میں اپنے رویے کو بالکل واضح کرنے کی خاطر امریکا بھر میں اطلاعات اور پالیسی سازی کی تمام تر مشینری کو ان تصورات کا پابند بنا دیا اور اسے انھیں پھیلانے کی ذمہ داری بھی سونپ دی گئی، جب دانشوروں کے ایک بڑے طبقے کا جغرافیائی سیاست کی حکمت عملی مرتب کرنے والوں کے ساتھ اشتراک ہوا تو اس سے اسلام، تیل، مغربی تہذیب کے مستقبل اور جمہوریت کے قیام کے لیے دہشت گردی اور شورش پھیلانے سے جنگ جیسے مہنگے خیالات وجود میں آئے، اس کی وجوہ میں پہلے

ہی زیر بحث لا چکا ہوں اور یہاں اسے یوں پیش کر رہا ہوں کہ جغرافیائی سیاست اور سرد جنگ کے نظریات میں جو ثقافتی اور سیاسی بصیرت پائی جاتی ہے اس سے اسلام کے ادبی مطالعے نے بہت کم استفادہ کیا ہے لیکن اس ناقابل تردید حقیقت کو جانتے ہوئے بھی اسلام کے ماہرین اس عظیم دریا میں اپنا حصہ ڈالتے چلے جا رہے ہیں۔ ان سے کچھ نیچے ابلاغ عامہ آتا ہے جو اطلاعات اور پالیسی سازوں سے مواد حاصل کرتے ہیں، اس کا اختصار نامہ تیار کرتے اور اسے تصویروں سے سجا دیتے ہیں، اس طرح شخصیات کے بگڑے ہوئے خاکے، دہشت زدہ کر دینے والا ہجوم اور اسلامی سزاؤں وغیرہ پر توجہ کا ارتکاز ہو جاتا ہے، ان کے تعصب اور لاعلمی کا سب سے بڑا مظاہرہ اس وقت سامنے آیا جب اپریل 1995ء میں اوکلوہوما شہر میں بم دھماکوں کے فوری بعد سٹیون ایمرسن (Steven Emerson) جیسے ''ماہرین'' کی قیادت میں اجتماعی طور پر اس نتیجے پر چھلانگ لگا دی گئی کہ ان دھماکوں کی ذمہ داری اسلامی دہشت گردوں پر عائد ہوتی ہے اور انھوں نے اپنے اس الزام کو قدرے چھوٹے پیمانے پر اس وقت بھی دہرایا جب جولائی 1996ء میں ٹی ڈبلیو اے کی فلائٹ 800 کو حادثہ پیش آیا، دراصل اس تمام الزام تراشی کی سربراہی وہ طاقتور ادارے کر رہے ہیں جن میں تیل کمپنیاں، بڑی بڑی کارپوریشنیں اور ملٹی نیشنل کمپنیاں، دفاع اور جاسوسی سے متعلق گروہ اور حکومت کا انتظامی شعبہ آتا ہے، جب کارٹر نے امریکا کے صدر کی حیثیت سے اپنا پہلا نیا سال 1978ء میں منایا تو اس موقع پر اس نے کہا تھا کہ ایران ''استحکام کا ایک جزیرہ ہے'' اس نے یہ بات ان طاقتور اداروں کے زیر اثر ہی کہی تھی اور اس طرح وہ امریکی مفادات کی نمایندگی کرتے ہوئے اسلام کا احاطہ کر رہا تھا پھر جب اٹھارہ سال بعد خوبار کے بم دھماکوں کے بعد امریکا کے وزیر دفاع نے سعودی عرب کا دورہ کیا تو اس نے وہاں 2 راگست کو کہا کہ مجرموں میں ''سب سے بڑا مجرم'' ایران ہے، اس کے ساتھ ہی اس نے ''سخت کارروائی'' کی دھمکی بھی دی مگر وہ اپنے اس بیان پر چند دن سے زیادہ قائم نہیں رہ سکا اور طاقتور اداروں کی مداخلت نے اسے اپنا بیان بدلنے پر مجبور کر دیا۔

باب اوّل

تشریح اور ترجمانی کے طبقے

(حصہ دوم)

یہاں یہ بات کسی قدر توجہ کے لائق ہے کہ امریکا میں جغرافیائی سیاست کی حکمت عملی بنانے والوں اور لبرل دانشوروں نے اسلام کا استعمال کس طرح کیا ہے، چنانچہ یہ کہنا قطعی مبالغہ آمیز نہیں ہوگا کہ تیل برآمد کرنے والے ممالک کی تنظیم اوپیک نے جب 1974ء میں تیل کی قیمتوں میں اچانک اضافہ کیا تو اس سے پہلے ''اسلام'' کا ذکر نہ تو ثقافت کے حوالے سے ہوتا تھا اور نہ ہی میڈیا پر اس کے متعلق بات ہوتی تھی، عرب، ایرانی، پاکستانی اور ترک دکھائی بھی دیتے تھے اور ان کا ذکر بھی ہوتا تھا مگر مسلمانوں کے متعلق بات چیت شاذ ہی ہوتی تھی، لیکن جب درآمدی تیل کی قیمتوں میں ڈرامائی اضافہ ہوا تو مسلمانوں اور اسلام کے خلاف امریکی عوام کے ذہنوں میں تیل کی مناسبت سے بڑے ناخوشگوار تاثرات جمع ہونا شروع ہوگئے، تیل پر امریکا کا انحصار زیر بحث آیا اور اسے ''تیل پیدا کرنے والے غیر ملکیوں پر امریکا کا انحصار'' کے رنگ میں پیش کیا گیا، یہ تشویش بھی سامنے آئی کہ مشرق وسطیٰ اور خلیج فارس سے تیل کے ذریعے امریکی عوام کو دھمکی آمیز پیغام دیا جا رہا ہے، پھر یہ کہا گیا کہ یہ ایک نئی اور قابل شناخت قوت کی طرف اشارہ ہے کہ توانائی اب امریکیوں کے لیے نہیں رہی، اسی دوران میں ''اجارہ داری''، ''تاجروں کا اتحاد'' اور ''بلاک'' جیسے الفاظ اچانک نمایاں ہوگئے، اس سے پہلے کبھی امریکا کا ملٹی نیشنل کمپنیوں کے چھوٹے سے گروپ کے لیے بھی تاجروں کے اتحاد کا لفظ استعمال نہیں ہوتا تھا مگر حالات نے پلٹا کھایا تو یہ اوپیک کے ارکان کے لیے مخصوص ہوگیا، اس وقت یوں محسوس ہوتا تھا جیسے معیشت پر اس نئے دباؤ سے ایک نئی ثقافت اور ایک نئی سیاسی صورت حال ابھرنے والی ہے؟ امریکا جو دنیا کی غالب قوت کا مقام رکھتا تھا، اسے ڈرامائی طور پر اس مقام سے ہٹا کر اچانک مبارزت کے میدان میں کھڑا کر دیا گیا ہے اس صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے فرٹز سٹرن (Fritz stern) نے کومنٹری (Commentary) میں لکھا کہ جنگ عظیم کے بعد جو دور شروع ہوا تھا وہ اس نکتے پر پہنچ کر ختم ہوگیا ہے۔

اس تبدیلی کا تذکرہ سب سے نمایاں انداز میں کومنٹری میں کیا گیا، 1975ء کے آغاز میں اس میں

مضامین کا ایک سلسلہ شروع ہوا جن میں اس صورت حال کو لیا گیا تھا، اس سلسلے کا پہلا مضمون رابرٹ ڈبلیو ٹکر (Robert W. Tucker) کا تھا، جو فروری میں شائع ہوا، اس کا عنوان تھا ''تیل: امریکا کی مداخلت کا سوال'' (Oil: The Issue of American Intervention)، اس کے بعد مارچ میں ڈینیل پیٹرک موئے نیہن ((Daniel Patrick Moynihan کا مضمون آیا جس کی سرخی تھی ''امریکا مخالفت کی زد میں'' (The United States in Opposition) ان دونوں مضامین پر جو عنوان لگائے گئے وہ اپنا اظہار آپ تھے، موئے نیہن نے بعد میں اقوام متحدہ میں امریکا کی نمایندگی کی اور انھوں نے وہاں اس سلسلے میں بڑی تقریریں کیں، جن میں دنیا کو خبردار کیا گیا تھا کہ ''مغربی جمہوریتیں'' خاموش تماشائی نہیں بنی رہیں گی اور ان سابقہ نوآبادیات کو جو آزاد ہونے کے بعد اکثریت میں ڈھل گئی ہیں، انھیں یہ اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ امریکیوں کو ڈرائیں یا دھمکائیں، موئے نیہن کی تقریروں میں جو بات سامنے آئی وہ اسی کا تسلسل تھی جو موئے نیہن اور ٹکر نے اپنے ان مضامین میں پیش کی تھی جو کومنٹری میں شائع ہوئے تھے۔

ان دونوں کے پاس اس وقت اسلام کے متعلق کہنے کو کچھ نہ تھا، لیکن ایک سال بعد یہ بات سامنے آگئی کہ ''اسلام'' نے وہی کردار ادا کرنا ہے جو ان اچانک اور ناقابل قبول تبدیلیوں کی روشنی میں اس کا بنتا ہے اور ان تبدیلیوں کا ذکر پہلے ہی موئے نیہن اور ٹکر کر چکے ہیں، دراصل ان دونوں نے اپنے اپنے انداز میں اس تجربے کی تصویر کشی کی تھی جس سے متعدد ملک گزر چکے تھے، پھر انھوں نے اس تجربے کی بنیاد پر ایک ڈرامائی ڈھانچا بنا کر سب کے سامنے پیش کر دیا، ٹکر کا کہنا ہے کہ امریکا کی تاریخ میں پہلی بار یہ محسوس ہوا کہ انسانی مساوات کو باہر سے امریکا پر نافذ کیا جا رہا ہے، موئے نیہن نے لکھا ہے کہ ایسے بیرونی اقدام جنھیں بنیادی طور پر برطانوی شہنشاہیت نے پیدا کیا تھا اور جنھوں نے اپنے نظریات برطانوی سوشلزم سے اخذ کیے تھے، سامنے آ کر کھڑے ہوگئے ہیں، ان کا فلسفہ قبضہ کرنا اور ناکام رہنے کی صورت میں دولت کی تقسیم ہے، ان کی دلچسپی کسی طور پر بھی پیداوار میں نہیں تھی اور ان کے اطوار سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ آزادی میں بھی کوئی دلچسپی نہیں رکھتے، البتہ مساوات ان کی دلچسپی کا مرکز ضرور ہے، موئے نیہن اس کی پوری تصویر کشی کرتا ہے کہ ''ہمارا تعلق آزادی پسند جماعت سے ہے'' پھر فوجی انداز اختیار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ''اگر ہم اپنے جھنڈوں کو لہرا دیں تو ان سے جو قوتیں باہر نکلیں گی وہ دوسروں کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی حیران کر دیں گی'' وہ کہتا ہے کہ ان نئی اقوام میں تیل پیدا کرنے والی اقوام بھی شامل ہیں اور ان کی دلچسپی صرف اس قدر ہے کہ ''ہمارے'' اور ''ان کے'' درمیان عدم مساوات ختم ہو جائے، ٹکر اس صورت کو یوں بیان کرتا ہے کہ عدم مساوات کا خاتمہ'' ایک

دوسرے پر انحصار'' کو لازم بنا دے گا، محتاجی کی کیفیت پیدا ہو جائے گی چنانچہ امریکا کو اسے روکنے کے لیے نہ صرف تیار رہنا چاہیے بلکہ ضروری ہو تو ان پر حملہ کرنے سے گریز بھی نہیں کرنا چاہیے۔

ان دونوں مضامین میں جو حکمت عملی بیان کی گئی ہے ان میں سے کچھ کا یہاں ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ٹکر نے اپنے مضمون میں جن اقوام کا ذکر تیل پیدا کرنے والوں اور موئے نیہن نے جن کا تیسری دنیا کے ممالک کے طور پر کیا ہے، ان میں سے نہ تو کسی کی واضح پہچان بتائی گئی ہے نہ ہی تاریخی حوالہ دیا گیا ہے اور نہ ہی ان کے اس قومی آثار کا ذکر کیا گیا ہے جو انھیں نمایاں کر سکے، ان کا ذکر ایک متحدہ گروہ کے طور پر کر کے بات کو سمیٹ دیا گیا ہے اور آگے یہ تذکرہ شروع ہو گیا ہے کہ سابقہ نوآبادیات، آج بھی سابقہ نوآبادیات ہیں، تیل پیدا کرنے والے محض تیل پیدا کرنے والے ہیں، اس سے ہٹ کر یہ سب گمنام ہیں، اجنبی اور کسی حد تک خطرناک اور ضدی ہیں، ان کا موجود رہنا ہی ''ہمارے'' لیے خطرناک ہے، ان مضامین میں دوسری حکمت عملی یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ ملک ایک تجریدی حیثیت رکھتے ہیں جن کے خلاف دنیا کی تسلیم شدہ قوتوں نے صف بندی کر لی ہے، کچھ عرصہ بعد ٹکر نے تیل اور قوت پر جو مضمون لکھا، اس میں وہ کہتا ہے کہ ''اچانک ہمارا سامنا ایک ایسے عالمی معاشرے کے وجود میں آنے کے امکان سے ہوتا ہے جس کے وجود میں آنے کے بعد وہ منظم تقسیم یقینی نہیں رہے گی جسے...... ''عالمی پیداوار''...... کا نام دیا گیا ہے اور یہ اس لیے ہوگا کہ ترقی یافتہ اور سرمایہ دار ممالک میں جو ملک بنیادی طور پر فیصلے کی قوت رکھتے تھے وہ شاید اب اصولوں کو وضع کرنے اور نظم و نسق کو برقرار رکھنے والے نہ رہیں''، بلکہ وہ خود بھی اصولوں کو توڑنے اور نظم و نسق کو برباد کرنے والے بن جائیں، ان دونوں کے مضامین میں تیسری حکمت عملی یہ سامنے آئی کہ یہ اس لیے انتشار پھیلاتے ہیں کہ وہ جو کچھ اب ہیں اور ایک گروپ کی حیثیت سے جو کچھ بن سکتے ہیں، ان دونوں کیفیتوں میں وہ منفی انداز میں ''ہمارے'' برابر اور مخالف رہ سکیں۔

جو بات ٹکر اور موئے نیہن کہہ رہے تھے اس کا انداز چاروں طرف سے گھرے ہوئے مغربی مزاج کو مذہبی مناجات سنانے جیسا تھا، مغرب کی جدید تاریخ میں وقفے وقفے کے ساتھ یہ طریقہ اُبھرتا ہے، مثال کے طور پر ہمیں یہی انداز ہنری ماسس (Henri Massis) کی کتاب ''مغربی ممالک کا دفاع'' (La Defense de l Occident) میں ملتا ہے، یہ کتاب 1927ء میں شائع ہوئی تھی جبکہ حال ہی میں انتھونی ہارٹلے (Anthony Hartley) کا ایک مضمون سامنے آیا ہے جس کا عنوان ہے ''وحشیانہ رابطہ: مہذب دنیا کی تاریخ میں تباہی پھیلانے والا عنصر'' (The Barbarian Connection : On the Destructive Element in Civilized

History)۔ یہ بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے، ٹکر اور موئے نیہن کے نزدیک جو چیز مغرب کی مخالفت کرتی ہے وہ ایسی ہے جسے امریکی اتنا نہیں جانتے جتنا کہ شہنشاہیت پسند یورپی باشندے سمجھتے اور مشرق کے متعلق کہتے ہیں کہ ''ان لوگوں کو ہم جانتے ہیں'' کیونکہ ہم نے ان پر صحیح معنوں میں حکمرانی کی ہے، موئے نیہن جب ان کا تجزیہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ تیسری دنیا کی نئی ریاستیں دراصل نقال ہیں، اس لیے انھیں ان کی اپنی صفات کے حوالے سے نہیں بلکہ اس ریاست کے حوالے سے پہچانا جا سکتا ہے جس کی یہ نقالی کر رہی ہیں، یہ نتیجہ اخذ ہو جانے کے باوجود جب ٹکر نئے ''عالمی معاشرے'' کا ذکر کرتا ہے تو اس کے سوا کوئی حوالہ نہیں لاتا کہ یہ پُرانے نظام کی خلاف ورزی ہے، چنانچہ ٹکر کے اس بیان سے کئی سوال اُبھرتے ہیں، اگرچہ نہ تو یہ سوال پوچھے گئے اور نہ ان کے جواب ہی سامنے آئے مگر وضاحت کے لیے یہ پوچھنا ضروری تھا کہ جن لوگوں کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ کون لوگ ہیں، ان کی حقیقی خواہشات کیا ہیں، وہ کہاں سے آئے ہیں اور وہ جس طرح کا رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں اس کی وجہ کیا ہے؟

جس وقت یہ باتیں ہو رہی تھیں قریب قریب اسی وقت امریکا ہند چینی سے پسپائی اختیار کر رہا تھا، امریکی سیاست میں ''ویت نام سے نکلنے کے بعد کے حالات'' پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، مگر بہت کم لوگوں نے اس نکتے پر غور کیا ہے کہ وہ جو دعویٰ کیا جاتا تھا کہ دور دراز کے علاقوں سے وابستہ امریکی مفادات کا فوجی دفاع ضروری ہے، وہ دعویٰ کدھر گیا اور غیر مستحکم شورش زدہ جنوبی ویت نام کے پورے علاقے سے نکل کر نسبتاً اس قریبی علاقے میں جسے مسلم دنیا کہتے ہیں، امریکا کا قدم جما لینا کیا معنی رکھتا ہے، اس پر بھی غور نہیں کیا گیا کہ اس تبدیلی کے ساتھ ہی تیسری دنیا کے مقاصد کی ترقی پذیری اور ان کی آزادانہ پرورش کا بھی خاتمہ ہو گیا ہے اور خاص طور پر وہ بھی ختم ہو گئے ہیں جن کے ساتھ کیے گئے وعدے وفا نہیں کیے گئے، جیرارڈ شیلینڈ (Gerard Chaliand) نے اپنی کتاب ''تیسری دنیا میں انقلاب'' (Revolution in the Third World) میں اس صورت حال کی تصویر کشی کی ہے؟

شیلینڈ کا شمار ویت نام، کیوبا، انگولا، الجزائر اور فلسطین کی آزادی کی تحریکوں کی حمایت کرنے والوں میں ہوتا ہے اور اس کی یہ کتاب ان تحریکوں کے حوالے سے ہی ہے ''بے چین دل کی پکار'' (Cri de coeur)، یہ کتاب 1977ء میں منظر عام پر آئی اور اس میں اس نے اپنی بات کو یہاں پر ختم کیا ہے کہ نوآبادیات کی مخالفت کے نتیجے میں ہمیشہ درمیانے درجے کی ایک ایسی گھٹی ہوئی ریاست وجود میں آتی ہے جو مغرب کے جوش و جذبے سے قطعی مطابقت نہیں رکھتی، اس کتاب سے ہٹ کر ہمارے سامنے ڈیسنٹ (Dissent) میگزین

کا قصہ بھی ہے جس نے 1978ء کے موسم خزاں میں ایک سمپوزیم کا اہتمام کیا تھا اور اس کا موضوع تھا کہ ''کمبوڈیا کے حالیہ واقعات'' جن میں کھیمو روج کی فتح اور اس کے بعد آنے والی لرزہ خیز خبریں شامل ہیں، جو کہ اس بات کو اُجاگر نہیں کرتیں کہ ہم ویت نام کی جنگ کی مخالفت پر ایک بار پھر غور کریں؟'' یہ سوال بذات خود نہ صرف 1960ء کے جوش و جذبے سے امریکیوں کی پسپائی کا اشارہ کرتا ہے بلکہ اس کی جگہ نئے عالمی حقائق سے پیدا ہونے والی تکلیف دہ بے چینی طاری ہونے اور سر منڈلاتی ہوئی تباہی بھی دکھائی دینے لگتی ہے، چنانچہ عالمی اقتصادی نظام کے ناکام رہنے کے اسباب کے لیے ٹھوس شہادتیں پیش کرنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

یہاں مختصر بات یہ بنتی ہے کہ تیل کے صارفین اور خبریں سُننے والوں نے اس صورت حال میں کیا انداز قائم کیا ہوگا، کیا وہ اس نتیجے پر نہیں پہنچے ہوں گے کہ کسی ایسے نقصان اور کسی ایسی بد نظمی کا احتمال ہے، جس کی کوئی مثال ہی نہیں ملتی، وہ یقیناً اس نتیجے تک پہنچے ہوں گے مگر یہ اندازہ لگانے سے قاصر رہے ہوں گے کہ اس نقصان اور بد نظمی کی شکل کیا ہوگی اور اسے کس طرح شناخت کیا جا سکے گا، انھیں صرف یہی معلوم ہو سکا کہ ہم سب جس پر تکیہ کیے ہوئے تھے وہ سب ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا، ہم جس طرح اپنی کاروں کو چلاتے تھے اب اس طرح نہیں چلا سکیں گے کیونکہ تیل بہت مہنگا ہو گیا ہے، جو سہولتیں ہمیں حاصل تھیں اور جو عادتیں ہم نے اختیار کر لی تھیں ان میں بنیادی اور انتہائی ناپسندیدہ تبدیلی ہونے والی ہے، اس تمام صورت حال میں اصل زیر بحث چیز تیل ہی بنتا تھا لیکن اس کے متعلق بھی ابہام کی کیفیت ہی طاری رہی، البتہ اس کے چھن جانے کا خطرہ زیادہ نمایاں ہوا، اس وقت حالات کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ کیا تیل کی واقعی کمی ہو گئی ہے یا گیس لینے والوں کی لمبی قطاریں گھبراہٹ کا نتیجہ ہیں یا اس بحران کا تعلق اس اضافے سے ہے جو تیل کمپنیوں نے موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنے منافع میں کر لیا ہے، بحرانی کیفیت کی دوسری وجوہ اس کی بہ نسبت زیادہ موزوں معلوم ہوتی ہیں، اس وقت یوں محسوس ہوتا تھا کہ عباؤں میں ملبوس عرب نہ صرف حیرت انگیز حد تک دولت مند ہو گئے ہیں بلکہ انھوں نے خوب اسلحہ بھی جمع کر لیا ہے اور وہ مغرب پر چھا جانے کے لیے تیار بیٹھے ہوئے ہیں، اس سارے قصے میں اسلام کا جوز ور دکھائی دیا چنانچہ اس کا سلسلہ بڑی آسانی کے ساتھ اکتوبر 1973ء کی اس لڑائی سے جوڑ دیا گیا جو رمضان کے مہینے میں لڑی گئی، اس موقع پر مصری فوج نے ناقابلِ شکست بارلیولائن (Bar-Lev line)[1] توڑ دی تھی اور عرب فوجی 1967ء کی طرح بھاگ نہیں کھڑے ہوئے

1۔ بارلیولائن دراصل فوجی مورچوں کا ایک سلسلہ تھا جسے نہر سویز کے شمالی کنارے پر اسرائیل نے 1967ء میں سینائی کے علاقے پر قبضے کے بعد تعمیر کیا تھا۔ (مترجم)

تھے، یہ حیران کن بات تھی کہ وہ جم کر لڑے، پھر اسی جنگ کے نتیجے میں فلسطین کی تنظیم آزادی 1974ء میں اقوام متحدہ میں دکھائی دی، کسی معقول وجہ کے بغیر ہی شیخ یمانی ایک مقتدر شخصیت بن گئے، ان کی خوبی اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ وہ مسلمان تھے اور ان کا تعلق تیل سے مالا مال سعودی عرب سے تھا، اسی دور میں شاہ ایران کو بھی ایک عالمی لیڈر کی حیثیت حاصل ہوئی، پھر 1970ء کے عشرے کے وسط میں انڈونیشیا، فلپائن، نائیجیریا، پاکستان، ترکی مختلف خلیجی ریاستیں، الجزائر، مراکش اور سوڈان کے ملک اُبھرے اور جب یہ بات اچانک سامنے آئی کہ یہ ملک امریکا کے لیے مشکلات پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو احساس ہوا کہ ان کے ماضی اور ان کی اصل حیثیت کے متعلق معلومات بہت کم ہیں، چنانچہ اس طرح اسلامی ریاستوں کی ایک بڑی تعداد، شخصیات اور ان کی موجودگی نے امریکیوں کے ذہنوں میں اپنے لیے جگہ بنالی، اس سے پہلے صرف ان کی موجودگی کا احساس تھا مگر اب اس سے آگے بڑھ کے انھوں نے خبروں میں اپنا مقام بنالیا۔

یہ کیفیت اس وقت کی تھی جب حقیقی معنوں میں ابھی کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی، نہ تو لوگوں کی کوئی معقول تعداد اس نئی تصویر کی وضاحت کرنے کو تیار تھی اور نہ ہی اس کی پہچان کروانے کے لائق تھی، ایسے میں صرف ٹکر اور موئے نیہن جیسے لوگ ہی تھے جو عالمی تاریخ سے ایسے نتائج اخذ کر رہے تھے، جن میں اسلام کے لیے ضرورتاً گنجایش تو نکالی گئی تھی مگر اسے کوئی واضح مقام نہیں دیا گیا تھا، یہی وجہ ہے کہ آج اسلام کے ساتھ جہاں بھی سابقہ پڑتا ہے اس کی شناخت یوں کی جاتی ہے کہ یہ نہ صرف بے لگام ہے بلکہ فوری نوعیت کا بھی ہے، اس سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ یہ مفروضہ کہیں بیان تو نہیں کیا گیا مگر موجود ہے اور اس کی نوعیت یہ ہے کہ جس طرح ''جمہوریت'' یا کسی شخص یا رومن کیتھولک ادارے کا حوالہ دیا جاتا ہے اسی طرح ''اسلام'' بھی ایک ایسا ہی نام ہے، جس کا فوری طور پر حوالہ دیا جا سکتا ہے، اس ساری صورت حال میں ''فوری نوعیت'' کی بڑی اہمیت ہے، میں نے ٹائم کی سرورق کی جس کہانی کا پہلے ذکر کیا تھا اس میں یہی فوری نوعیت جھلکتی ہے، اس سلسلے میں زیادہ پریشانی کی بات یہ ہے کہ ثقافتی دلائل میں یہ فوری نوعیت بڑی باقاعدگی کے ساتھ سامنے آتی ہے اور اہم اور آزاد خیال جریدوں میں اسے زیادہ تر ایک موضوع کے طور پر سنجیدگی کے ساتھ زیر بحث لایا جاتا ہے، میں نے ادبی شخصیات کی سوچ میں جغرافیائی نقطۂ نظر کے حوالے سے جس تبدیلی کا ذکر کیا ہے، فوری نوعیت کے متعلق ان کی اور عوامی میڈیا کی سوچ میں برائے نام فرق ہے۔

ایک لائق توجہ مثال ہمیں مائیکل والزر (Michael walzer) کے مضمون ''اسلام کا دھماکا'' (The Islam Explosion) میں ملتی ہے، یہ مضمون نیوری پبلک کے 8/دسمبر 1979ء کے شمارے میں شائع ہوا،

اس میں اس نے اپنے آپ کو ایسا ظاہر کیا ہے، جیسے وہ خود بیسویں صدی کے ان پر تشدد اور اس کے اپنے مطابق اہم اور ناخوشگوار واقعات کو سمجھنا چاہتا ہے جو فلپائن، ایران اور دوسری جگہوں پر رونما ہوئے، اس کے بعد وہ یہ دلیل لاتا ہے کہ ان سب واقعات کے رونما ہونے کی وجہ اس چیز کو قرار دیا جا سکتا ہے جسے اسلام کہتے ہیں، والزر کہتا ہے کہ اوّل تو ان سب واقعات سے یہ بات ابھر کر سامنے آتی ہے کہ یہ بڑی مستقل مزاجی کے ساتھ ایک مخصوص انداز میں وقوع پذیر ہو رہے ہیں۔ یہ ایک سیاسی قوت کی طرح ہیں جس کا مقصد مغرب پر چھا جانا ہے۔ دوسرے یہ کہ ان سب نے ایک خوفناک اخلاقی جذبے سے جنم لیا ہے، مثال کے طور پر جب فلسطینی اسرائیل کی نوآبادی بننے کے خلاف مزاحمت کرتے ہیں تو والزر کے نزدیک اس مزاحمت کی وجہ، انسانی، سماجی یا سیاسی نہیں بلکہ مذہبی ہوتی ہے، والزر تیسری دلیل یہ پیش کرتا ہے کہ یہ واقعات لبرل ازم، سیکولرازم، سوشلزم اور جمہوریت کے ان کمزور پردوں کو پھاڑ دیتے ہیں، جو نوآبادیاتی نظام کے آگے تنے ہوئے ہیں، چنانچہ ان تینوں مشترکہ خصوصیات کی وجہ اسلام ہی ہے جو صاف پہچانا جا سکتا ہے، اگر ''اسلام'' ایک ایسی قوت نہ ہوتا جو وقت اور خلا پر حاوی ہے تو وقت اور خلا ان تمام اوقعات کو الگ الگ کر دیتے، والزر کہتا ہے کہ جب آپ اسلام کی بات کریں گے تو قوت اور خلا کو خود بخود خارج کر دیں گے، جمہوریت، سوشلزم اور سیکولرازم جیسی سیاسی پیچیدگیوں سے نجات حاصل کر لیں گے اور اخلاقی بندشوں سے باہر نکل آئیں گے، والزر اپنے اس مضمون کے آخر میں اپنے آپ کو اس بات کا یقین دلانے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ جب وہ لفظ ''اسلام'' ادا کرتا ہے تو یہ کوئی غیر مرئی چیز نہیں ہوتی بلکہ ایک حقیقی چیز ہوتی ہے جسے اسلام کہتے ہیں، یہ وجود اس قدر فوری نوعیت کا ہے کہ اسے وسیلہ قرار دینا یا اس کی کوئی اہلیت مقرر کرنا محض ضرورت سے زیادہ شور و غل معلوم ہوتا ہے، اس کی فوری نوعیت کے ساتھ لازمی طور پر یہ رجحان بھی جڑا ہوا ہے کہ اسلام کو اس طرح لیا جائے جیسے اس کی اپنی کوئی تاریخ نہیں ہے اور اگر اس کی تاریخ کی موجودگی کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کی تاریخ کو ایسا بنا دیا جائے جو یا تو غیر متعلق اور بے معنی معلوم ہو یا اس کی صدیوں کی کہانی تشدد، تعصب اور استبداد کے ایک جیسے واقعات کو بار بار دہراتی چلی جائے، چنانچہ موئے نیہن اور ٹکر جیسے قدامت پرستوں نے جو دلائل پیش کیے ہیں بائیں بازو کے آزاد خیال اصحاب ان کی تصدیق ان بنیادوں پر ہی کرتے ہیں۔

نئی جغرافیائی سیاست کے ادبی رکھ رکھاؤ میں اسلام کے عوامی تشخص کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اکثر اوقات اس کا تعلق ان سے مخاصمانہ ہو جاتا ہے جنھیں ہم عام چیزیں یا مغربی کہتے ہیں یا جن کا شمار روزمرہ میں کرتے یا جسے ہم امریکی ''ہماری'' کہتے ہیں، والرز گویا ان کو پڑھنے سے جن سے والزر ماخوذ کرتا ہے یہی تاثر

قائم ہوتا ہے اسی تناظر میں فلورا لیوئس (Flora Lewis) کے اس مضمون کو لیجیے، جو 28، 29، 30 اور 31 دسمبر 1979ء کو نیو یارک ٹائمز میں قسط وار شائع ہوا، اس کا تفصیلی ذکر، میں اس کتاب کے باب دوم میں کروں گا، یہاں اتنا بتا دوں کہ اس مضمون کا لب لباب یہ ہے کہ اسلامی دنیا کا تصور ہی یہ بنتا ہے کہ یہ ''ہماری'' دنیا کے ساتھ دشمنی رکھتی ہے، یہ مضمون ایران میں امریکیوں کو یرغمال بنانے کے پس منظر میں لکھا گیا تھا، چنانچہ اس قسط وار مضمون کا مقصد ہی یہ ثابت کرنا ہو گیا کہ ہر اعتبار سے اسلام ہمارے ''خلاف'' ہے، یہ جذبات اس وقت زیادہ سنگین ہو گئے جب لوئیس نے عام معمول سے ہٹ کر ہونے والی باتوں کو اس مضمون میں شامل کر لیا اور عربی زبان کی عجیب و غریب خصوصیات، عقائد کی گمراہی، اپنے وفاداروں پر بلا خوف و خطر آمرانہ حکمرانی وغیرہ وغیرہ کو اسلام کے حوالے سے بیان کرنا شروع کر دیا،...... یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ اگر اسلام کی فوری نوعیت نے اسے ہر وقت دستیاب ثابت کر دیا ہے تو ہمارے مانوس عقائد اور طور طریقوں سے اسلام کا انحراف اسے تباہ کن اور ہمارا مخالف بنا دیتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلام کی کوئی ایک شکل باقی نہیں رہتی بلکہ اس سے بے شمار ایسی شکلیں بن جاتی ہیں جو ایک دوسرے میں الجھی ہوئی ہیں مگر لائق شناخت بھی ہیں اور حقیقت کا درجہ رکھتی ہیں چنانچہ ان اشکال کے متعلق کسی احتیاط کے بغیر بیانات جاری کرنا اور منطقی حکمت عملیاں تیار کرنا ممکن ہو گیا ہے۔

اس رجحان کی بہترین مثال سیمول پی ہنٹنگٹن کا مضمون ''تہذیبوں کا تصادم'' ہے، یہ مضمون فارن افیئرز کے 1993ء کے موسم گرما کے شمارے میں شائع ہوا اور اس نے بڑی شہرت حاصل کی، اس مضمون میں سرد جنگ کے سابق سپاہی نے، سرد جنگ کے بعد پیدا ہونے والے تنازعات پر قلم اُٹھایا ہے، وہ بدشگونی کے انداز میں یہ بات کہتا ہے کہ موجودہ حالات تہذیبوں کے تصادم سے کسی طرح کم نہیں ہیں، اس تصادم کی طرف نو یا دس تہذیبیں بڑھ رہی ہیں، ان میں مغرب کے لیے سب سے زیادہ خطرناک اسلام ہے، یہاں ہنٹنگٹن یہ تو کہتا ہے کہ جب یہ تصادم ہوگا تو اسلام اور کنفیوشش کو ماننے والے اتحادی ہوں گے مگر اپنے اس دعوے کا وہ کوئی ثبوت فراہم نہیں کرتا، اس مضمون کی سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ ہنٹنگٹن نے دراصل اس مضمون کے ذریعے تاریخ اور ثقافت پر جو بچگانہ حملہ کیا ہے، اس کا تصور اس نے برنارڈ لیوئس کے مضمون ''مسلمانوں میں غیض و غضب کے اسباب'' سے لیا ہے جس میں لیوئس نے بڑے دلیرانہ انداز میں کسی ثبوت کے بغیر کہا ہے کہ اسلام دراصل جدیدیت پر غضبناک ہے، اس احمقانہ خیال آفرینی سے ہنٹنگٹن اور اس کا اثر قبول کرنے والے متعدد قارئین جب یہ تشویش ناک نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ''ہلال کی شکل کا اسلامی بلاک جو افریقہ کے اُبھرے ہوئے علاقے

سے وسط ایشیا تک پھیلا ہوا ہے، اس کی ''سرحدیں خون سے آلودہ ہیں'' (صفحہ 34) تو اس طرح وہ اسلام کے متعلق معلومات کم اور خوف زیادہ پھیلاتے ہیں، عجیب بات یہ ہے کہ ایک ایسے وقت میں جب پُرامن رابطے ہورہے ہیں اور آنے والے دنوں میں مذاکرات کے امکانات پیدا ہورہے ہیں، ہنٹنگٹن یہ تصور پیش کررہا ہے کہ مغرب اور کچھ تہذیبوں کے درمیان مصالحت قطعاً پیدا نہیں ہوسکتی، وہ جب یہ کہتا ہے کہ اسلام مغرب کے ہرایک باشندے کا دشمن نمبر ایک ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہر مسلمان اور ہر مغربی باشندے کو الگ الگ ایسی بوتلوں میں بند کردیا گیا ہے جن میں ہوا اور پانی تو داخل نہیں ہوسکتا، مگر یہ بوتلیں ان کی الگ الگ تہذیبی شناخت کو ظاہر کرتی ہے، اب یہ ان کا مقدر ہے کہ یہ اپنی اپنی نقلیں تیار کرتی رہیں۔

اس طرح کے اسلام کو آپ کسی بھی مسلمان پر لاگو کرسکتے ہیں، اس سلسلے میں آیت اللہ خمینی سب سے موزوں شخصیت ہیں مگر اسی طرح کراچی، قاہرہ اور تریپولی کے مسلمانوں کے وہ جلوس بھی ہیں جنھیں اس وقت ٹیلی وژن پر دکھایا جاتا ہے، جب بنیاد پرستی کا کوئی ثبوت فوری طور پر فراہم کرنا مقصود ہو، پھر یہ سہولت بھی موجود ہے کہ اس بات کا لحاظ کیے بغیر کہ آپ جو کہہ رہے ہیں وہ درست ہے بھی یا نہیں؟ آپ اسلام کو ہر اس چیز سے جوڑ سکتے ہیں جسے آپ پسند نہیں کرتے، اس کی مثال یوں ہے کہ مینور بکس (Manor Books) نے (امام) خمینی کی اسلامی حکومت کے متعلق ایک کتاب شائع کی ہے، جس کا عنوان ہے ''آیت اللہ خمینی کی مین کیمف''[1] (Ayatollah Kohmeini's Mein Kampf) اس کتاب کے ساتھ نیویارک پوسٹ (Newyork Post) کے سینئر رپورٹر جارج کارپوزی جونیئر (George Carpozi Jr.) کا تجزیہ بھی شامل کیا گیا ہے، کارپوزی پتا نہیں کہاں سے یہ دلیل لایا ہے کہ (امام) خمینی عرب ہیں اور اسلام کی ابتدا پانچویں صدی قبل از مسیح میں ہوئی تھی، کارپوزی کا تجزیہ کچھ یوں شروع ہوتا ہے:

> ایڈولف ہٹلر جو کسی اور زمانے سے تھا، اس کی طرح آیت اللہ روح اللہ خمینی بھی بڑا ظالم ہے، دوسروں سے نفرت کرنے والا ہے، جارالگا کر پکڑنے پر یقین رکھتا ہے اور عالمی نظام کے لیے خطرہ ہے، مین کیمف کے مصنف اور بے لطف اسلامی حکومت کو ترتیب دینے والے کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ ایک دہریہ تھا جبکہ دوسرا یہ ظاہر کررہا ہے کہ وہ اللہ کا بندہ ہے۔

1۔ مین کیمف جرمنی کا لفظ ہے جس کا مطلب میری جدوجہد بنتا ہے، اس میں ہٹلر نے اپنے سیاسی نظریات بیان کیے ہیں، آریا کو اعلیٰ نسل اور سامیوں کو کمتر نسل قرار دیا ہے، اور اسی کی بنیاد پر اس نے سامی نسل سے دشمنی کو اختیار کیا تھا۔ (مترجم)

اسلام کو اس انداز میں پیش کرنے کا یہ نتیجہ ہے کہ دنیا کو دو حصوں یعنی امریکا کے حامیوں اور مخالفوں میں یا کمیونزم کے حامیوں/ اور مخالفوں میں تقسیم کرنے کا شور مچا ہوا ہے، سیاسی عمل کی رپورٹ پیش کرنے کی طرف توجہ کم ہوگئی ہے، ایسے نمونوں اور اقدار کو لاگو کرنے کی کوشش ہورہی ہے، جو طبقاتی تقسیم لاتے ہیں یا قطعی بے معنی ہیں یا ان دونوں حالتوں میں موجود ہیں، پورے زور شور کے ساتھ غلط اطلاعات فراہم کی جارہی ہیں، اس خیال کو بار بار دہرایا جارہا ہے، تفصیلات بیان کرنے سے گریز کیا جارہا ہے اور اس سارے عمل میں صحیح تناظر غائب ہے، ان سب باتوں کا سرا اسلام سے تو کسی طور جا کر نہیں جڑتا بلکہ ان کا تعلق مغرب کی اس سوسائٹی اور میڈیا سے ضرور جا ملتا ہے جو اسلام کے اس تصور کو بیان کرنے اور آگے بڑھانے میں مصروف ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم نے دنیا کو ایک بار پھر مشرق اور مغرب میں تقسیم کردیا ہے اور مشرق کا پُرانا تصور کسی تبدیلی کے بغیر اس لیے نافذ کردیا گیا تاکہ ہماری آنکھوں پر پردہ پڑ جائے، ہم دنیا سے ہی نہیں اپنے آپ سے بھی نظریں چُرالیں اور اس بات سے بھی بے نیاز ہوجائیں کہ نام نہاد تیسری دنیا سے ہمارے تعلقات کس طرح کے رہے ہیں۔

اس صورت حال سے کئی بڑے اہم نتائج برآمد ہوئے ہیں، ان میں سے ایک تو اسلام کی مخصوص تصویر ہے جو فراہم کردی گئی ہے، دوسری یہ کہ اس کے مطالب یا اس کے پیغام کو ایک دائرے میں باندھ دیا گیا ہے اور وہی لگی بندھی باتیں کی جارہی ہیں، تیسرا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ محاذ آرائی کی ایک سیاسی صورت پیدا کرکے ''ہمیں'' اسلام پر چھوڑ دیا گیا ہے، چوتھا یہ کہ اسلام کے تصور کو گھٹانے کا جو سلسلہ شروع کیا گیا تھا، اس نے اسلامی دنیا میں بڑے اچھے نتائج برآمد کیے ہیں، پانچواں نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ میڈیا کے اسلام اور اس سے متعلق ثقافتی رویے ہمیں نہ صرف اسلام کے متعلق بہت کچھ بتاتے ہیں بلکہ ان سے ثقافت سے متعلق اداروں، اطلاعات اور علم کی سیاست اور قومی پالیسی کا بھی پتا چلتا ہے۔

تاہم اس وقت اسلام کو جس طرح بیان کیا جارہا ہے، اس کی فہرست تیار کرکے میں یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا کہ حقیقی اسلام ادھر ادھر کہیں موجود ہے اور میڈیا اپنے متعصبانہ عزائم پر عمل کرتے ہوئے اس کی شکل بگاڑ رہا ہے، ایسی کوئی بات نہیں ہے، مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کے لیے اسلام ایک ظاہری اور باطنی حقیقت ہے، لوگ اس حقیقت کو اپنے ایمان، اپنے معاشرے، اپنی تاریخ اور روایات کا حصہ نہیں کہتے ہیں، اسلام سے باہر رہنے والے یا غیر مسلموں کے معاملے میں یہ لازم ہوجاتا ہے کہ وہ اپنی توجہ مرکوز کریں، خود کو ڈھالیں، اس کی شخصیت کو تلاش کریں، جس کے متعلق وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ انفرادی یا اجتماعی طور پر ان کے مقابل

آ کھڑا ہوا ہے، اس بات کو ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ میڈیا کا اسلام، مغربی سکالر کا اسلام، مغربی رپورٹر کا اسلام اور مسلمانوں کا اسلام یہ سب کے سب ہماری اپنی جداگانہ سوچ اور ترجمانی کے ہمارے اس انداز سے پھوٹتے ہیں جسے ہم تاریخ سے اخذ کرتے ہیں، ان تمام اشکال کو ہم خودی اور ترجمانی کے عمل کے ذریعے ہی تاریخ میں تلاش کر سکتے ہیں، میں نہ تو مذہبی ہوں اور نہ میرا تعلق اسلام سے ہے، تاہم مجھے یقین ہے کہ اگر کوئی مرد یا عورت کسی مخصوص ایمان سے متاثر ہونے کا دعویٰ کرتا ہے یا کرتی ہے تو میں اسی کے جذبات کو سمجھ سکتا ہوں، لیکن جہاں تک ایمان کو زیرِ بحث لانے کا تعلق ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ اس صورت میں ممکن ہے جب ہم انسانی تاریخ اور معاشرے میں ان انسانی اقدامات کی توجیہ بیان کریں جو ایمان کے توسط سے رونما ہوتے ہیں، مثال کے طور پر جب ہم اس اسلامی انقلاب کو زیرِ بحث لاتے ہیں جس نے پہلوی حکومت کا خاتمہ کیا، یا الجزائر کے اسلامی سالویشن فرنٹ(Salvation Front) کا ذکر کرتے ہیں جس نے 1990ء کے بلدیاتی انتخابات میں حکومت کو شکست دی، تو ہمیں چاہیے کہ ہم اس بارے میں کچھ نہ کہیں کہ کیا انقلابی اپنے ایمان اور عقیدے میں واقعی مسلمان تھے، تاہم ان کے اس اسلامی تصور پر ضرور بات کر سکتے ہیں جس نے انھیں بیدار کیا، ان میں اسلامی جذبہ پیدا کیا، اس حکومت کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونے کا حوصلہ دیا، جسے وہ اسلام دشمن، استحصالی اور جابرانہ قرار دیتے تھے، اس طریق کار سے گزر کر ہی ہم اسلام کے متعلق، ان کے تصورات کا موازنہ، ٹائم اور لی مونڈے کے اسلام، ایرانی انقلاب اور الجزائری اسلام پسندوں کے ساتھ کر سکتے ہیں۔

دوسرے الفاظ میں ہمیں یہاں جن کے ساتھ سابقہ پڑ رہا ہے، وہ بڑے وسیع معنوں میں ترجمانی کرنے والے گروہ یا طبقے ہیں، ان میں سے بہت سے ایک دوسرے سے الگ الگ رہتے ہیں اور بعض حالتوں میں ایک دوسرے کے ساتھ جنگ کرنے کو بھی تیار ہو جاتے ہیں، یہ سب اسلام کی ترجمانی کے سلسلے میں اپنی اختراع اور اپنے انکشافات کو اپنی بقا کا مرکزی نکتہ سمجھتے ہیں، مگر ان میں سے کوئی بھی سچائی یا حقیقت کے ساتھ براہِ راست کوئی رابطہ نہیں رکھتا، اگر ہم حقیقت بیانی سے کام لیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ہم میں سے ہر ایک انسانوں کی بنائی ہوئی دنیا میں رہتا ہے اور اس دنیا میں ''قوم'' یا ''عیسائیت'' یا ''اسلام'' جیسی چیزیں ایک ایسے طے شدہ دستور کا حصہ ہیں، جسے تاریخی عمل نے بنایا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان چیزوں کو ایک ایسی شناخت دینے کے لیے جسے ہم پہچان سکیں، انسانوں نے اپنی مرضی اور خوشی کے ساتھ بڑی مشقت کی ہے، یہ بات درست نہیں کہ سچ اور حقیقت کا کوئی وجود ہی نہیں ہے، ان کا یقیناً وجود ہے اور ہم اسے پہچانتے ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح ہم اپنے ہمسائے میں درختوں اور مکانوں کو دیکھتے ہیں تو انھیں پہچان لیتے ہیں

یا جب ہم اپنی کوئی ہڈی توڑ بیٹھتے ہیں یا ہمارا کوئی عزیز موت کی وادی میں چلا جاتا ہے تو ہمیں درد محسوس ہوتا ہے اور ہم درد کو جانتے ہیں لیکن ہم زیادہ تر، حقائق کے متعلق اپنے محسوسات کو یا تو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں یا انھیں اس لیے دبا دیتے ہیں کہ ہم انفرادی طور پر اپنے لیے جو مطالب اور معنی اخذ کرتے ہیں، صرف ان پر تکیہ کرنے کے بجائے ہم ان مطالب اور معنی کو بھی اہمیت دے رہے ہوتے ہیں جو مختلف اطراف سے ہم تک پہنچتے ہیں، انھیں ہم اس لیے اہمیت دیتے ہیں کیونکہ یہ معاشرے میں زندگی کا جزو لاینفک ہوتے ہیں، اس بات کو سی رائٹ ملز(C. Wright Mills) نے بہت واضح طور پر یوں بیان کیا ہے:

> انسانوں کی حالت سمجھنے کا پہلا ضابطہ یہ ہے کہ انسان استعمال شدہ دنیا میں رہتے ہیں، انھوں نے اپنے ذاتی تجربے سے جتنا سیکھا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ جانتے ہیں اور ان کا ذاتی تجربہ ہمیشہ بالواسطہ ہوتا ہے، وہ کس معیار کی زندگی بسر کرتے ہیں، اس کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ انھوں نے دوسروں سے زندگی کے کیا معنی لیے ہیں، ہر ایک شخص زندگی کو ایسے ہی معنی پہناتا ہے کوئی بھی شخص ٹھوس حقائق کی اس دنیا کا براہِ راست تنہا مقابلہ نہیں کر سکتا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ٹھوس حقائق سے پُر کوئی دنیا دستیاب ہی نہیں ہے، انسان اس کے قریب تر اسی وقت آتے ہیں، جب وہ بچے ہوتے ہیں یا جب وہ پاگل ہو جاتے ہیں، ان ہر دو حالتوں میں، جب بے معنی واقعات اور بے معنی انتشار ان کے سامنے خوفزدہ کر دینے والا سین لے آتا ہے تو مکمل عدم تحفظ کا احساس انھیں اپنی گرفت میں لے لیتا ہے، لیکن روزمرہ کی زندگی میں انھیں ٹھوس حقائق کی دنیا کا کوئی تجربہ نہیں ہوتا، چنانچہ ان کا تجربہ بھی منتخب لگے بندھے مطالب اور پہلے سے تیار کیے ہوئے معنی سے ہی وجود میں آتا ہے، دنیا اور اپنے متعلق ان کا تصور بھی، انھیں مشاہدہ کرنے والوں کے ان طبقوں سے ملتا ہے، جس سے نہ تو ان کا ملنا جلنا ہے اور نہ ملنے کا کوئی امکان ہے، تاہم ہر انسان کے لیے یہ تصورات جو اجنبیوں نے اور ان لوگوں نے فراہم کیے ہیں جو اس دنیا سے جا چکے ہیں، اس کے لیے بحیثیت انسان، زندگی کی اصل ہوتے ہیں۔

انسان کا شعور اس کی مادی زندگی کا تعین نہیں کرتا اور نہ اس کی مادی زندگی ہی اس کے شعور کا تعین کرتی ہے، شعور اور زندگی کے درمیان وہ مطالب، خاکے اور رابطے حائل

ہوتے ہیں جو دوسرے لوگوں نے پہلے انسانی گفتگو اور پھر علامتوں کو منظم کر کے ہم تک پہنچائی ہیں، موصول ہونے والے ان مطالب نے جنھیں مزید وسعت دی گئی، حقیقی معنوں میں اپنی زندگی کے متعلق انسانوں کے شعور پر اثر ڈالا ہے، اسی سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ انسان کیا دیکھتا ہے اور اس کے متعلق اس کا ردعمل کیا ہوتا ہے؟ اس کے محسوسات کیا ہوتے ہیں اور ان احساسات سے ان کے اندر کیا ردعمل پیدا ہوتا ہے، علامتیں دراصل تجربے پر مرکوز ہوتی ہیں، مطالب علم کو منظم کرتے ہیں اور ایک لمحے کے سطحی ادراک کی رہنمائی کرتے ہوئے اسے زندگی بھر کی آرزوؤں تک پہنچا دیتے ہیں۔

ہر شخص، فطرت، سماجی واقعات اور اپنی ذات کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے، لیکن فطرت، معاشرے اور اپنے متعلق جن چیزوں کو وہ لازمی جزو تسلیم کر لیتا ہے، ان پر نظر نہیں رکھتا، اسی طرح ہر شخص جس چیز کا مشاہدہ کرتا ہے، اسے بھی اور جس کا اس نے مشاہدہ نہیں کیا ہوتا، اسے بھی وہ الفاظ کا جامہ پہناتا ہے لیکن اس سلسلے میں جو اصطلاحات وہ استعمال کرتا ہے، نہ تو وہ اس کی اپنی ہوتی ہیں اور نہ اس نے خود ایجاد کی ہوتی ہیں اور نہ ان کا تجربہ کیا ہوتا ہے، ہر شخص اپنے مشاہدات اور اخذ کیے ہوئے نتائج کے متعلق دوسروں سے بات کرتا ہے، لیکن اس گفتگو میں وہ جن اصطلاحات کا استعمال کرتا ہے، وہ دوسروں کے کلمات اور تصورات سے اس طرح شامل کر لی جاتی ہیں، جیسے وہ اس کی اپنی ہوں، اس طرح وہ جن باتوں کو ٹھوس حقیقت، بامعنی ترجمانی، موزوں پیشکش قرار دیتا ہے، ان کے لیے اس کا انحصار مشاہدے کی چوکیوں، ترجمانی کے مراکز، پیشکش کے ذخیروں پر بڑھ جاتا ہے اور یہ ہمارے معاشرے میں ان ذرائع سے قائم ہوتے ہیں جنھیں میں ثقافتی مشینری کہوں گا۔

اسلام کو امریکیوں اور کسی حد تک یورپی باشندوں تک پہنچانے کے لیے ثقافتی مشینری کی ایک شاخ ٹیلی وژن، ریڈیو نیٹ ورک، اخبارات، وسیع پیمانے پر پڑھے جانے والے خبروں سے متعلق رسالے رہے ہیں، اس سلسلے میں فلم نے بھی اپنا کردار ادا کیا ہے، سینما کے ذریعے ہم تک تاریخ اور دور دراز کے علاقوں کا بصری احساس ہی نہیں آتا بلکہ ہمیں اپنے متعلق بھی پتا چلتا ہے، فلم اور ذرائع ابلاغ دونوں مل کر ایک طاقتور

ارتکاز کا ذریعہ بن جاتے ہیں، انھیں مختلف گروہوں کی ترجمانی کے مرکز کی حیثیت حاصل ہوتی ہے، ان سے اسلام کی جو تصویر ابھرتی ہے، بلاشبہ وہ معاشرے کے اس طاقتور رجحان کی عکاس ہوتی ہے، میڈیا جس کی نمائندگی کرتا ہے، یہ تصویر محض ایک تصویر نہیں ہوتی بلکہ احساسات کا ایک ایسا مرقع ہوتی ہے جسے دوسروں تک پہنچایا جا سکے۔ اس طرح ایک تسلسل قائم ہوتا ہے، تسلسل سے میری مراد فلم کا منظر نامہ ہے، جس کے متعلق یہ بات بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ منظر نامے کا اپنا مقام کیا ہے، اس میں کیا کیا اقدار مضمر ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ناظرین میں اسے دیکھ کر کیا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اس بات کو یوں سمجھیے کہ جب ایرانی بحران کو بڑی باقاعدگی کے ساتھ ''مسلمانوں'' کے ایک ایسے ہجوم کی شکل میں دکھایا جائے جو بپھرا ہوا ہو اور نعرے لگا رہا ہو اور اس پس منظر میں اُبھرتی ہوئی آواز یوں تبصرہ کرے کہ یہ ''امریکی ازم کے دشمن'' ہیں تو، ایران اور مسلمانوں سے دوری، ان سے ناواقفیت کی کوئی اہمیت نہیں رہے گی اور سامنے نظر آنے والا دھمکی آمیز طرز عمل ''اسلام'' کے متعلق ہر تبصرے کو درست ثابت کر دے گا اور اس سے امریکیوں میں یہ احساس اُبھرے گا کہ ایک ایسی چیز جس میں بنیادی طور پر ان کے لیے کوئی کشش نہیں ہے جس کا رجحان منفی ہے ان کے مقابل آ کھڑی ہوئی ہے، اب جبکہ امریکیوں میں یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ اسلام ہمارے ''خلاف'' ہے اور ''وہیں، کہیں'' نزدیک موجود ہے تو ان میں یہ سوچ اُبھرتی ہے کہ انھیں بھی جواباً اس سے ٹکرانا چاہیے، والٹر کرون کائیٹ (Walter Cronkite) اپنی رات کی نشریات کا آغاز مسلمانوں کے متعلق اسی فقرے سے کرتا ہے کہ ''وہ ہیں ہی اس طرح کے'' اسے دیکھ کر اور سن کر یہی خیال اُبھرتا ہے کہ ہمارے سامنے جو منظر پیش کیا جا رہا ہے اسے ٹیلی وژن کمپنی نے صرف ہمیں دکھانے کے لیے ایسا نہیں بنا دیا، بلکہ اس میں نہ بدلنے والا جو ''غیر ملکی'' دکھایا گیا ہے اور اس منظر میں امریکیوں کی جو مخالفت دکھائی گئی ہے، یہ مخالفت فی الواقع اسی انداز میں موجود ہے، اس صورت حال پر لی نیوول آبزرویٹر (Le Nouvel Observateur) کی جین ڈینیل (Jean Daniel) نے 26 نومبر 1979ء کو یہ تبصرہ کیا تھا کہ ''اسلام نے امریکا کا محاصرہ کر رکھا ہے'' (les Etats-Unis Sont assieges par l Islam)، یہ بات آج 1996ء میں بھی اتنی ہی درست بیٹھتی ہے جتنی پہلے تھی اور اسلام آج بھی حسب سابق امریکیوں کے ذہنوں پر سوار ہے۔

اگرچہ ہم ٹیلی وژن، اخبارات، ریڈیو اور رسالوں پر بڑا انحصار کرتے ہیں مگر اسلام کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے ذرائع ان تک محدود نہیں ہیں، کتابیں، خصوصی جریدے اور کتابی شکل میں لیکچر دستیاب ہیں مگر ان میں بیان کیے گئے خیالات بہت پیچیدہ ہوتے ہیں، جبکہ ذرائع ابلاغ میں یہ بات نہیں ہوتی

بلکہ وہ فوری نوعیت اور بکھری ہوئی چیزوں کو ایک لڑی میں پرو کر پیش کر دیتا ہے، یہاں یہ بات واضح کرنا ضروری ہے کہ اخبارات اور ریڈیو میں اور ٹیلی وژن پر پیش کی جانے والی چیزیں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں مگر یہ فرق صرف اتنا ہی ہوتا ہے جو ایک اخبار کے اداریے کا دوسرے اخبار کے اداریے سے ہو سکتا ہے یا جو فرق مختلف ''اختیار'' کیے گئے، خیالات میں یا جو متبادل یا روایتی اور ثقافت مخالف تصورات میں ہو سکتا ہے، مختصر یہ کہ ہم پروپیگنڈہ کی کسی مرکزی مشینری کے رحم و کرم پر نہیں ہوتے، اگرچہ ہم جسے پروپیگنڈہ کہتے ہیں اس کے بڑے حصے کا تمام تر اُبال میڈیا اور معروف سکالر نکال دیتے ہیں، لیکن مختلف اقسام اور اختلافات کے باوجود میڈیا جو پیش کرتا ہے، وہ نہ تو فوری نوعیت کا ہوتا ہے اور نہ ''آزاد'' ہوتا ہے، حالانکہ ہم یہی دعویٰ کرتے ہیں کہ جو پیش کیا جا رہا ہے، وہ آزادانہ اور بلا تاخیر کے ہے، مگر ہم جانتے ہیں کہ ''خبریں'' خود بخود وجود میں نہیں آ جاتیں، تصویریں یا خیالات حقیقت سے باہر نکل کر ہماری آنکھوں اور ہمارے ذہن میں نہیں سما جاتے، سچ براہِ راست دستیاب نہیں ہوتا اور نوع نوع کی چیزیں کسی جکڑ بندی کے بغیر ہمیں حاصل نہیں ہو جاتیں، کیونکہ مؤثر صلاحیت کے تمام ذرائع ٹیلی وژن، ریڈیو اور اخبارات ذہانت کے ساتھ خبروں کو آگے پہنچانے کے لیے کچھ قواعد و ضوابط اور معاہدوں کے پابند ہوتے ہیں، چنانچہ یہ پابندیاں ہی اس مواد کو وہ شکل دیتی ہیں جو پیش کیا جاتا ہے چونکہ خاموشی کے ساتھ اختیار کیے گئے قواعد و ضوابط بڑے سلجھے ہوئے انداز میں اس حقیقت کو جو قابو نہیں کی جا سکتی تھی ''خبروں'' یا ''کہانیوں'' میں ڈھال دیتے ہیں اور چونکہ میڈیا ان سامعین تک پہنچنے کی ہی کوشش کرتا ہے، جن کے متعلق اسے یقین ہوتا ہے کہ وہ حقائق کے متعلق ایک ہی جیسے مفروضوں پر یقین رکھتے ہیں، اس صورت حال میں اسلام یا کسی اور کی تصویر کے متعلق جو تصور اُبھرے گا وہ ایک ہی جیسا ہوگا، یہ تصویر تحقیر کے ساتھ ساتھ ایک ہی رنگ لیے ہوگی، یہ بات سب جانتے ہیں کہ میڈیا منافع کمانے والا ادارہ ہوتا ہے اس لیے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ وہ حقائق کی ایک مخصوص تصویر پیش کرنے میں دلچسپی رکھتا ہے، وہ ایسی تصویر کشی ایک ایسے سیاسی سیاق و سباق میں کرتا ہے جسے کسی غیر شعوری نظریے نے متحرک کر کے مؤثر بنا دیا ہو، اس صورت میں انھیں نشر و اشاعت کرتے ہوئے سنجیدہ تحفظات یا مخالفت کا سہارا نہیں لینا پڑتا۔

متعدد خصوصیات اب منضبط ہو گئی ہیں، چنانچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مغربی صنعتی ریاستیں نہ صرف استحصالی ہیں بلکہ پروپیگنڈہ کے زیر اثر کام کرنے والی حکومتیں ہیں، مثلاً امریکا میں اظہار کی آزادی ہے کوئی بھی رائے کہیں بھی پیش کی جا سکتی ہے اور عملاً یہ صورت ہے کہ نئے، غیر روایتی اور غیر مقبول نظریات کو جس طرح امریکی شہری اور میڈیا قبول کرتے ہیں، اس قبولیت کی کہیں مثال نہیں ملتی، پھر کتابوں اور پمفلٹوں کا تو

ذکر ہی کیا، مختلف قسم کے جو اخبار، رسالے، ٹیلی وژن اور ریڈیو پروگرام دستیاب ہیں وہ ہر طرح کی تصویر کشی یا آسان کردار نگاری کو ٹھہرنے ہی نہیں دیتے، اس لیے یہ کہنا کہ یہ سب ایک جیسا ہی نظریہ پیش کرتے ہیں نہ تو منصفانہ ہے اور نہ ہی درست ہے۔

یہ بات کوئی نہیں کہہ سکتا اور میں اس کی کوشش بھی نہیں کرنا چاہتا لیکن میرا خیال ہے کہ اس غیر معمولی صورت حال کے ہوتے ہوئے بھی یہ عددی اور صفاتی رجحان پایا جاتا ہے کہ بعض خیالات اور بعض حقائق کو پیش کرتے ہوئے انھیں دوسروں سے زیادہ بڑھا چڑھا دیا جاتا ہے، یہاں میں ذرا جلدی کے ساتھ چند ایسی باتیں آپ کو یاد دلا دوں جو میں پہلے بیان کر چکا ہوں، اس کے بعد میں امریکی میڈیا کے چند پہلوؤں کے ساتھ ان کے تعلق کو آپ کے سامنے پیش کروں گا، ہم قدرتی دنیا میں زندگی بسر نہیں کرتے، اخبار، خبریں اور لوگوں کی رائے جیسی چیزیں قدرتی دنیا میں نہیں ہوتیں، یہ انسانی خواہشات، تاریخ، سماجی حالات، اداروں اور آپ کی پیشہ ورانہ روایات سے ظہور پذیر ہوتی ہیں، پریس کے یہ عزائم کہ وہ بامقصد حقائق پر مبنی اور سچی تصویر کشی کرے گا بڑی اعلیٰ سوچ ہے، اس سے شاید نیتوں اور ارادوں کا تو پتا چلتا ہے مگر یہ ایسی منزل ہے جسے حاصل کرنا ممکن نہیں ہوتا چونکہ ہم کمیونسٹ اور مغربی دنیا سے ہٹ کر دوسرے ممالک کے متعلق یہ سوچنے کے عادی ہو چکے ہیں کہ وہ پروپیگنڈہ کرنے والے، اور نظریاتی ہوتے ہیں اور ہم اپنے اخبارات کے متعلق یہ یقین رکھتے ہیں کہ یہ بھروسے کے لائق اور حقیقت بیان کرتے ہیں، اس لیے ہم یہ اعتبار کر لیتے ہیں کہ ہر چیز معمول کے مطابق ہو رہی ہے، حقیقت کیا ہے اسے ہربرٹ گانز (Herbert Gans) نے اپنی نہایت اہم کتاب ''فیصلہ کرنا کہ خبر کیا ہے'' (Deciding What's News) میں یوں بیان کیا ہے کہ صحافی، خبر رساں ایجنسیاں اور نیٹ ورک سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ انھیں کیا پیش کرنا ہے، کیسے پیش کرنا ہے اور باقی معاملات کس طرح طے کرنے ہیں، دوسرے الفاظ میں خبریں زیادہ تر سوچ سمجھ کر انتخاب کرنے، اسے الفاظ کا جامہ پہنانے کے ایک پیچیدہ عمل کا نتیجہ ہوتی ہیں اور ان میں جامد انداز خال خال ہی جھلکتا ہے۔

مغرب میں بڑی بڑی خبریں حاصل کرنے اور ان کی نشر و اشاعت کا بندوبست کرنے کا طریقہ کیا ہے، حال ہی میں اس کے متعلق بڑی وسیع معلومات حاصل ہوئی ہیں، گے ٹیلسی (Gay Talese) اور ہیریسن سالسبری (Harrison Salisbury) نے نیویارک ٹائمز پر کتابیں لکھی ہیں، اس سلسلے میں ڈیوڈ ہیلبر سٹام (David Halberstam) کی کتاب ''وہ قوتیں جو ہیں'' (The Powers That Be)، گے ٹچ مین (Gaye Tuchman) کی کتاب ''خبریں بنانا'' (Making News)، بڑی اہم ہیں اس کے علاوہ ہربرٹ شلر (Herbert Schiller) نے

ابلاغ عامہ کی صنعت پر اپنے مختلف مطالعے پیش کیے ہیں، مائیکل شڑسن کی کتاب ''خبریں دریافت کرنا'' (Discovering the News)، آرمنڈ میٹی لارٹ (Armand Mattelart) کی کتاب ''ملٹی نیشنل کارپوریشنیں اور ثقافت کا کنٹرول (Multinational Corporations and the Control of Culture) بھی اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں، یہ ان چند مطالعوں کا ذکر ہے جو مختلف زاویوں سے کیے گئے ہیں اور ان سے اس حد کا پتا چلتا ہے جو قواعد وضوابط کے تحت ایک مخصوص دائرے میں رہتے ہوئے اور روایات کا لحاظ رکھتے ہوئے سوسائٹی میں خبروں پر تبصروں کو وجود میں لاتے ہیں اور یہ سب مل کر اسی سارے عمل کو ایک شناخت دیتے ہیں، ہر انسان کی طرح ایک رپورٹر بھی یہ فرض کر لیتا ہے کہ بعض چیزیں معمول کے مطابق ہیں، اقدار کو ہم نے اپنی زندگی کا جزو بنالیا ہے چنانچہ انھیں بار بار جانچنے کی ضرورت نہیں رہتی، یہ عمل بالکل اس طرح ہوتا ہے، جیسے اپنے معاشرے کے طور طریقوں کو معمول کی بات سمجھ لیا جاتا ہے یا جس طرح دوسرے معاشروں اور ثقافتوں کا، جب ذکر آتا ہے تو کوئی شخص اپنی تعلیم، اپنی قومیت، اپنے مذہب کو بھول نہیں جاتا پھر پیشہ ورانہ ضابطۂ اخلاق اور چیزوں کے کرنے کے عمل کا جو شعوری پہلو ہے، اس میں یہ بات آجاتی ہے کہ کسی شخص نے کیا کہا، اس نے کس طرح کہا اور اس سے کس حد تک یہ پتا چلتا ہے کہ یہ بات کس کے لیے کہی گئی، رابرٹ ڈارنٹن (Robert Darnton) نے ان امور کو اپنے مضمون ''خبریں لکھنا اور کہانیاں سنانا'' (Writing News and Telling Stories) میں شد ومد کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اپنے اس مضمون میں وہ نہ صرف رپورٹر کے کام کرنے کے طریق کار سے پردہ اُٹھاتا ہے بلکہ ان ذرائع کو بھی زیر بحث لاتا ہے جن سے رپورٹر خبریں حاصل کرتا ہے پھر وہ ان ''ذرائع کے ساتھ رپورٹر کے اختلاف واشتراک کا ذکر بھی کرتا ہے'' اور وہ رپورٹر پر اس دباؤ کو بھی بیان کرتا ہے جو خبر کو ''لگے بندھے انداز میں پیش کرنے اور معیار کے مطابق'' بنانے کی کشمکش سے وجود میں آتے ہیں، پھر وہ اس پہلو پر بھی گفتگو کرتا ہے کہ رپورٹر ''جن واقعات کی رپورٹنگ کر رہا ہوتا ہے ان میں سے جہاں وہ بہت کچھ نکال دیتا ہے، وہاں اپنی طرف سے بہت کچھ شامل بھی کر دیتا ہے''۔

امریکی میڈیا، فرانسیسی اور برطانوی میڈیا سے اس لیے مختلف ہے کہ ان کے معاشرے ایک دوسرے سے بڑے مختلف ہیں، ان کے قارئین اور ناظرین مختلف ہیں، ان کے ادارے اور ان کے مفادات مختلف ہیں، امریکا کے رپورٹر کے لیے یہ ضروری ہے کہ اسے یہ احساس ہو کہ اس کا ملک واحد سپر پاور ہے، جس کے پاس اپنے مفادات کے حصول کے وہ طریقے موجود ہیں جو دوسرے ممالک کو میسر نہیں ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ پریس کی آزادی چاہے لفظوں کی حد تک ہو یا عملاً ہر دو صورتوں میں یہ لائق تعریف ہوتی ہے، لیکن

ہر امریکی صحافی، عالمی واقعات کی رپورٹنگ کرتے ہوئے، اس احساس کی گرفت میں آتا ہے کہ اس کا ادارہ امریکی قوت کا ایک حصہ ہے اور جب اس قوت کو غیر ممالک سے خطرہ محسوس ہوتا ہے تو وہ پریس کی آزادی کو قومی شناخت کے حوالے سے وفاداری اور حب الوطنی کے تابع کر دیتا ہے، یہ عمل یقیناً حیران کن نہیں ہے البتہ حیرت کی بات یہ ہے کہ آزاد پریس کے متعلق عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ یہ خارجہ پالیسی میں قطعاً کوئی مداخلت نہیں کرتا حالانکہ یہ خارجہ پالیسی بنانے میں بڑا اہم کردار ادا کرتا ہے، سی آئی اے اپنے مطلب کے لیے ان صحافیوں کو استعمال کرتی ہے جو بیرون ملک متعین ہوتے ہیں، اگر اس بات کو نظر انداز کر بھی دیا جائے تو امریکی میڈیا بیرون ملک سے جو معلومات اکٹھی کرتا ہے اس کا دائرہ کار ہی اس نوعیت کا ہوتا ہے کہ سرکاری پالیسی اس پر حاوی ہوتی ہے، جب اس پالیسی کے ساتھ اختلاف پیدا ہوتا ہے، جیسا کہ ویت نام کے سلسلے میں ہوا تھا تب میڈیا اپنے آزادانہ خیالات کی تشکیل کرتا ہے، اس آزادی کا بھی مقصود یہ ہوتا ہے کہ اگر وہ حکومت کی پالیسی تبدیل نہ کر سکیں تو کم از کم اس پر اثر انداز ضرور ہوں، تمام امریکی مخصوص صورت حال میں یہی طرز عمل اختیار کرتے ہیں اور پریس کے ارکان بھی ان میں شامل ہوتے ہیں۔

غیر ممالک میں متعین صحافی جس بات کو اپنے نزدیک درست سمجھتا ہے اس پر زور دیتا ہے، یہ ہمیشہ اس وقت ہوتا ہے جب اسے کسی غیر ملکی ثقافت کے ساتھ پوری طرح وابستہ کر دیا جاتا ہے اور اسے یہ احساس ہو جاتا ہے کہ وہ اسی لیے غیر ملک میں رکھا گیا ہے تاکہ جو کچھ اس ملک میں ہو رہا ہے، اسے اپنی زبان میں اس طرح بیان کرے کہ پالیسی ساز سمیت اس کے تمام ہم وطن صورت حال کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لیں، غیر ممالک میں وہ دوسرے صحافیوں کی صحبت میں رہنا پسند کرتا ہے مگر اسی کے ساتھ ساتھ اپنے سفارت خانے، اس ملک میں موجود دوسرے امریکی باشندوں اور ان لوگوں کے ساتھ بھی تعلق قائم رکھتا ہے جن کے امریکیوں کے ساتھ اچھے تعلقات ہوتے ہیں، یہ بات بھی کسی طرح کم اہم نہیں ہے کہ جب کوئی صحافی کسی غیر ملک میں ہوتا ہے تو وہ اپنی رپورٹ تیار کرتے ہوئے، جو وہ جانتا ہے یا جو بات اسے معلوم ہوتی ہے وہ صرف اس پر انحصار نہیں کر سکتا بلکہ اسے رپورٹنگ کرتے ہوئے، اس بات کا بھی دھیان رکھنا ہوتا ہے کہ بیرون ملک امریکی میڈیا کے نمائندے کی حیثیت سے اسے کیا جاننا، معلوم کرنا اور کہنا ہے، نیویارک ٹائمز کے نمائندے کو ٹھیک ٹھیک معلوم ہوتا ہے، ٹائمز کیا ہے اور ایک ادارے کی حیثیت سے وہ حالات کو کس رُخ سے دیکھتا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ تہران یا قاہرہ سے جب ٹائمز کا نمائندہ کوئی خبر بھیجے گا اور ایک فری لانسر صحافی اس واقعہ کی رپورٹ اس اُمید پر تہران یا قاہرہ سے ارسال کرے گا کہ شاید اسے دی نیشن یا ٹائمز کے مختلف ناموں سے جاری اخباروں

میں سے کسی میں جگہ مل جائے تو ان دونوں کی خبروں میں واضح فرق ہوگا، یہاں یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ ذریعۂ اظہار بھی اپنی جگہ پر دباؤ ڈالتا ہے، اگر این بی سی کی رات کی خبروں میں ایک خبر لگنی ہو تو قاہرہ کا نمائندہ حالات کو ٹائمز میگزین کے اس بیورو چیف سے مختلف انداز میں بیان کرے گا جسے ایک مضمون میں بیان کرنے کے لیے اس نے نسبتاً لمبے عرصے تک تیاری کی ہے، پھر یوں بھی ہوتا ہے کہ جب کوئی غیر ملکی نمائندہ اپنی خبر بھیجتا ہے تو اس کے وطن میں بیٹھے ہوئے ایڈیٹر اس کی خبر کو اپنے انداز میں لکھ دیتے ہیں، اس طرح سیاسی اور نظریاتی پابندیوں کا ایک اور غیر شعوری طرز عمل حرکت میں آ جاتا ہے۔

امریکی میڈیا جب غیر ممالک کی کوریج کرتا ہے تو اس میں نہ صرف اپنے آپ کو اُبھارتا ہے بلکہ پہلے سے ''ہم'' کا جو تصور موجود ہے اسے اور زیادہ گہرا کر دیتا ہے، میڈیا جو تصورات پیش کر رہا ہوتا ہے ان کے کچھ پہلوؤں پر امریکیوں کے اور کچھ پر اطالوی یا روسی باشندوں کے لیے زور دیا جاتا ہے، یہ تمام خبریں اور ان پر تبصرے ایک ایسی مشترکہ مرکزی رائے کے گرد گھومتے ہیں، جس کے متعلق میڈیا کے تمام اداروں کی رائے یہ ہے کہ انھیں واضح کرنا، شفاف بنانا اور تشکیل دینا ان کی ذمہ داری ہے، یہی سمجھنے کا اصل نکتہ ہے کہ میڈیا ہر طرح کا کام کر سکتا ہے، ہر طرح کے خیالات کی نمائندگی کر سکتا ہے، ایسی باتیں پیش کر سکتا ہے جو سنکی ہوں، غیر متوقع ہوں، طبع زاد ہوں اور تخلیقی نوعیت کی بھی ہوں، لیکن ان سب کا آخری نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ خبر بنانے والے چونکہ ایک ادارے سے وابستہ ہوتے ہیں اور انھیں ''امریکا'' یہاں تک کہ ''مغرب'' کی شناخت کو بھی آگے بڑھانا ہوتا ہے، اس لیے بنیادی طور پر ان کے خیالات ایک جیسے ہوتے ہیں، یہ طرز عمل اور وہ جسے ہم کچھ دیر بعد ایران کے حوالے سے زیر بحث لائیں گے، خبروں کی شکل بناتا ہے، یہ فیصلہ کرتا ہے کہ خبر کیا ہے اور یہ کیونکر ایک خبر ہے، تاہم یہ غیر ارادی طور پر خبروں کا تعین نہیں کرتا، یہ ان قوانین کا نتیجہ نہیں ہوتیں جو فیصلہ کن انداز میں رائے قائم کرتے ہیں اور نہ کسی سازش اور نہ آمریت کا نتیجہ ہوتی ہیں، یہ دراصل ثقافت کا نتیجہ ہوتی ہیں، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہی ثقافت ہوتی ہیں اور امریکی میڈیا کے معاملے میں یہ معاصر تاریخ کا ایک لائق تعریف حصہ ہوتی ہیں، اس مظہر کا تجزیہ کرنے اور اس پر تنقید کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ میڈیا دراصل اس کی تصویر پیش کرتا ہے جو ہم ہیں اور جو ہم چاہتے ہیں۔

اس اتفاق رائے کے اجزا کو اس وقت زیادہ بہتر انداز میں بیان کیا جا سکتا ہے جب یہ عملاً واقع ہو رہے ہوں، ان کی خیالی یا تجریدی شکل بنانے سے کام نہیں بنتا، جہاں تک اسلام اور ایران کی میڈیا کوریج کا تعلق ہے تو میں اس اتفاق رائے کو اپنا اظہار خود کرنے دوں گا جو اگلے باب میں تجزیے کے دوران سامنے

آئے گا، یہاں میں اس موضوع پر دو اختتامی باتیں کروں گا۔

سب سے پہلے یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ امریکا کا معاشرہ بڑا پیچیدہ ہے، یہ ایسی ذیلی ثقافتوں سے وجود میں آیا ہے جو ایک دوسرے کے ساتھ میل نہیں کھاتیں، چنانچہ یہ بات بڑی شدت کے ساتھ محسوس کی جاتی ہے کہ میڈیا کے ذریعے ایک طے شدہ معیار کی مشترکہ ثقافت کو وجود میں لایا جائے، یہ توقع ہمارے دور کے ذرائع ابلاغ تک محدود نہیں ہے بلکہ اس وقت سے چلی آ رہی ہے، جب امریکی جمہوریہ کا قیام عمل میں لایا گیا تھا، اس ملک میں نظریاتی لفاظی ایک ادارے کی شکل میں موجود ہے اور اس کی ابتدا اس وقت ہوئی تھی جب پیورٹن (Puritan) نے اپنی کتاب ''جنگلوں اور بیابانوں میں تلاش'' (Errand in the wilderness) لکھی تھی۔ یہ نظریاتی لفاظی خاص طور پر اس امریکی شعور، شناخت، مقدر اور کردار کا اظہار کرتی ہے، جس کا کام امریکا اور دنیا کی مختلف اشکال کو ممکنہ حد تک سمیٹنا اور مخصوص امریکی انداز میں اس کی اصلاح کرنا ہے، امریکی زندگی میں اس لفاظی اور ایک ادارے کی شکل میں اس کی موجودگی کا تجزیہ کئی سکالروں نے کیا ہے، ان میں پیری ملر (Perry Miller) بھی شامل ہیں اور حال ہی میں سکوان برکووچ (Sacvan Bercovitch) نے بھی اس پر طبع آزمائی کی ہے، ان تجزیوں سے ایک نتیجہ تو یہ سامنے آیا ہے کہ اتفاق رائے اگر ہمیشہ ایک حقیقت نہیں ہوتا تو نظر کا دھوکا ضرور ہوتا ہے اور میڈیا جب اس معاشرے کی نمائندگی کرتے ہوئے جس کی وہ خدمت کر رہا ہے اپنے آپ کو باعمل سمجھتا ہے تو یہ بھی بنیادی طور پر قومی اتفاق رائے کا ہی حصہ ہوتا ہے۔

دوسری بات کا تعلق اس سے ہے کہ اتفاق رائے درحقیقت کس طرح کام کرتا ہے، میرے نزدیک اس خصوصیت کو سادہ اور انتہائی درست انداز میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ یہ نہ صرف حدود کا تعین کر دیتی ہے بلکہ ایک دباؤ کو بھی برقرار رکھتی ہے، یہ ضروریات بیان نہیں کرتی اور نہ مشینی انداز میں کسی طبقے یا معاشی گروپ کے مفادات کی عکاسی کرتی ہے، ہمیں چاہیے کہ ہم اسے ایک ایسی چیز تصور کریں جیسے کوئی نظر نہ آنے والی لکیریں کھینچ دی جائیں اور کوئی رپورٹر یا کوئی مبصر اس لائن سے آگے جانے کی ضرورت ہی محسوس نہ کرے، چنانچہ یہ سمجھ لینا کہ امریکا اپنی فوجی قوت کو میرے مقاصد کے لیے استعمال کر سکتا ہے، اس اتفاق رائے کی نسبت سے اس لیے ناممکن دکھائی دیتا ہے کیونکہ یہ خیال گردش میں ہے کہ امریکا دنیا میں اچھائی کو قائم رکھنے کی ایک قوت ہے۔ اسی طرح امریکی ایسے غیر ملکی معاشروں اور ثقافتوں کے ساتھ تعلق قائم کرنا پسند کرتے ہیں، جو نئے راستوں کی تلاش کو ترجیح دیتے ہیں اور جو وحشیوں یا ان لوگوں سے جو زمین کا غلط استعمال کر رہے ہیں، اس زمین کو اسرائیل کی طرح ان سے چھیننے کا حوصلہ رکھتے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ امریکی، روایتی ثقافت میں کوئی

دلچسپی نہیں رکھتے اور نہ ان میں دلچسپی رکھتے ہیں جو انقلابی تبدیلیوں سے گزر رہے ہوتے ہیں، وہ ان پر بھروسا بھی نہیں کرتے کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہی ثقافتی اور سیاسی مجبوریاں کمیونسٹ پروپیگنڈے کو آگے بڑھنے اور پھیلنے کے راستے فراہم کرتی ہیں، لیکن جہاں تک امریکا کا تعلق ہے، میڈیا وہاں پردہ ڈال دیتا ہے، وہ حدود متعین کرتا ہے، دباؤ برقرار رکھتا ہے اور کسی کو کانوں کان یہ خبر نہیں ہونے دیتا کہ ایسا کیا جا رہا ہے، یہ بھی متعین کردہ حدود کی ہی ایک شکل ہے، اس سلسلے میں، میں ایک سادہ سی مثال یہ پیش کرتا ہوں کہ جب امریکیوں کو یرغمال بنا کر تہران میں رکھا گیا تو میں جسے اتفاق رائے کہہ رہا ہوں وہ فوراً میدان میں اُتر آئی اور قریب قریب فیصلہ یہ ہوا کہ ایران کے سلسلے میں صرف یہ بات اہمیت رکھتی ہے کہ یرغمالیوں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے، اس ملک کے باقی حصے، اس کے سیاسی عمل، روزمرہ کی زندگی، اس کی شخصیات، جغرافیہ، تاریخ ہر چیز کو نظرانداز کرنے کے لائق قرار دے دیا گیا، اور ایران اور ایرانی عوام کا ذکر اس انداز میں ہونے لگا کہ آیا وہ امریکا کے حق میں ہیں یا امریکا کے مخالف ہیں۔

رپورٹنگ اور خبروں کی نشست برخاست کے سلسلے میں جس معیار پر زور دیا جاتا ہے، اس کے متعلق اتنا کہنا ہی کافی ہے، جتنا کہ بیان کر دیا گیا ہے، اب ہمیں خبروں کی ترجمانی کے عددی پہلو پر جو کچھ کہنا ہے وہ صاف صاف بیان کیا جاسکتا ہے، امریکا میں مٹھی بھر ایسے ادارے ہیں جن کی اشاعت کی تقسیم کا دائرہ کار بڑا وسیع ہے اور جو بڑا اثر مرتب کرتے ہیں، ان میں دو یا تین وائر سروسز (Wire Services)، تین ٹیلی وژن نیٹ ورک، سی این این، نصف درجن کے قریب روزنامے، دو یا شاید تین خبروں کے ہفتہ وار رسالے آتے ہیں، اس نکتے کو واضح کرنے کے لیے چند نام لے دینا ہی کافی ہے، سی بی ایس، ٹائمز، دی نیویارک ٹائمز، اے پی سی جیسے ادارے نشر و اشاعت پر چھائے ہوئے ہیں، ان کی پہنچ زیادہ لوگوں تک ہے، یہ گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں، دوسرے چھوٹے اور کم دولت مند خبر پھیلانے والے اداروں کے مقابلے میں خاص قسم کی خبریں پھیلانے کی زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں، غیر ملکی خبروں کے سلسلے میں ان کا طرزِ عمل کیا ہوتا ہے؟ وہ اس بات سے بآسانی سمجھ میں آ جاتا ہے، دوسروں کے مقابلے میں موقع پر ان اداروں کے رپورٹرز زیادہ ہوتے ہیں چنانچہ یہ مل کر وہ بنیادی معلومات فراہم کر دیتے ہیں جسے اس واقعہ میں دلچسپی رکھنے والے اخبار، مقامی ٹیلی وژن سٹیشن، ریڈیو سٹیشن، اپنے قارئین، ناظرین اور سامعین تک فوری طور پر پہنچا دیتے ہیں، غیر ملکی خبروں کی رپورٹنگ میں زیادہ اہمیت اس بات کی ہوتی ہے کہ خبروں کا کتنا بڑا ڈھیر لگ گیا ہے، چنانچہ خبروں کو استعمال کرنے والے لوگ، اکثر و بیشتر اسی کثرت کا حوالہ دیتے ہیں، چنانچہ نیویارک ٹائمز یا سی بی ایس کے رپورٹر کی ساکھ ان ذرائع کے حوالے سے

ہوگی جنھوں نے معلومات فراہم کیں پھر اس میں ادارے کی اپنی شہرت، مہارت، تجربہ اور یہ بات بھی اہمیت رکھتی ہے کہ وہ اسے کتنی دفعہ شائع یا نشر کرتا ہے، ان کے ہمراہ اہم خبریں فراہم کرنے کا ایک چھوٹا گروہ بھی ہوتا ہے اور اس کی صف بندی اس اعتبار سے بڑی غیر معمولی ہوتی ہے کہ یہ آزاد ہوتے ہیں مگر کئی معاملات میں انھیں امریکا کی حقیقت کے اس تصور پر انحصار کرنا پڑتا ہے جو بڑے گروہ فراہم کرتے ہیں اور جس میں ایک قابلِ شناخت رابطہ ہوتا ہے۔

اس کا ایک سنجیدہ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ امریکیوں نے اس بات کو فوراً بھانپ لیا کہ انھیں اسلامی دنیا کو گھٹیا ثابت کرنے، دبا کر پیش کرنے کا موقع میسر آ گیا ہے، اور انھوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھانا بھی شروع کر دیا ہے مگر اس کا افسوسناک نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف اسلامی دنیا بلکہ امریکا کے اندر بھی انھیں جوابی کارروائی کا سامنا کرنا پڑا، اب صورت یہ ہوگئی ہے کہ ''اسلام'' کے دو ہی ممکنہ معنی ہو سکتے ہیں اور یہ دونوں ناقابلِ قبول اور ناقابل اصلاح ہیں، مغربی باشندوں اور امریکیوں کے نزدیک ''اسلام'' زمانۂ قدیم سے ایک بار پھر اُبھرنے والی لہر ہے، جس سے یہ خطرہ پیدا ہوتا ہے کہ قرونِ وسطیٰ کا زمانہ پھر لوٹ آئے گا اور یہ اسے تباہ کر دے گا جسے مغربی دنیا میں بڑی باقاعدگی کے ساتھ جمہوری نظام کا نام دیا جاتا ہے، اور دوسری طرف مسلمانوں کی بڑی تعداد کے لیے ''اسلام'' کے معنی یہ ہیں مغرب نے اسلام سے خطرے کا جو تصور باندھا ہے اس کا جواب دیا جائے، یہ عجیب بات ہے کہ جواب میں ''اسلام'' کے متعلق وضاحت پیش کی جاتی ہے وہ کم و بیش معذرت خواہانہ بیان ہوتا ہے، اسلام کی انسان دوستی، انسانی تہذیب میں اس کا حصہ، اس کا ترقیاتی عمل، اخلاقیات کی سربلندی، سب کو اس معذرت میں لپیٹ لیا جاتا ہے، اس طرح کے جواب نے اکثر و بیشتر احمقانہ جواب در جواب کو اُبھارا ہے، جس میں ''اسلام'' کو کسی ایک یا دوسرے اسلامی ملک کے حالات یا کسی ایک یا دوسری اسلامی شخصیت کا پرتو قرار دے دیا جاتا ہے، پھر اس طرح کے واقعات بھی ہوتے ہیں جن میں سادات، خمینی کو دیوانہ اور اسلام کے لیے باعثِ شرم کہتا ہوا ملتا ہے اور خمینی بھی اسی طرح کا جواب دیتا ہے پھر ہوتا یہ ہے کہ لوگ امریکا میں اس بات پر بحث کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ دونوں میں سے صحیح کون ہے، غور طلب بات یہ ہے کہ جب اسلامی کمیٹہ (Islamic Komitehs) کے ہاتھوں روزانہ ہلاک ہونے والوں کے اعداد و شمار سامنے لائیں جائیں گے یا آیت اللہ خمینی کے اس بیان کی وضاحت مانگی جائے گی، جسے رائٹر نے 19 ستمبر 1979ء کو جاری کیا تھا اور جس میں آیت اللہ خمینی نے کہا ہے اسلامی انقلاب کے دشمنوں کا صفایا کر دیا جائے گا تو معذرت خواہانہ انداز اختیار کرنے والا مسلمان کیا کہے گا؟ اس سلسلے میں میرا نکتہ نظر یہ ہے کہ ''اسلام'' کی قدر کو

کم کرنے والے یہ تمام نکات ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں اور دہرا بندھن رکھتے ہیں اس لیے انھیں مسترد کر دینا چاہیے۔

اس دہرے بندھن کے نتائج بڑے سنگین ہوتے ہیں اور اس کے معنی ہم پر اس وقت کھلتے ہیں جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ شاہ نے امریکا کی مدد سے ملک کو جدید خطوط پر آگے بڑھانے کی جو راہ اختیار کی تھی اسی کو بنیاد بنا کر اس کی مخالفت کی گئی تھی، پھر شہنشاہیت کو اسلام کا دشمن قرار دے کر اس کو سیاسی رنگ دیا گیا، اس کے بعد دیکھنے میں یہ آیا کہ اسلامی انقلاب نے اپنے مقاصد میں امریکی سامراج کی مخالفت کو بھی شامل کر لیا اور امریکا نے اس کے جواب میں شاہ کو نیو یارک میں ٹھہرا کر علامتی طور پر اس کی بادشاہت کو بحال کر دیا، اس کے بعد ڈراما اس طرح آگے بڑھنے لگا کہ مشرق کے پروگرام میں نام نہاد مشرقی باشندے اپنا وہ کردار ادا کرنے لگ گئے جو نام نہاد مغربی باشندوں نے ان کے لیے تیار کیا تھا اور جس کی وہ توقع کر رہے تھے، یوں مغربی باشندوں کے متعلق مشرقی باشندوں کے اس دعوے کی تصدیق ہو گئی کہ وہ شیطان ہیں۔

بات یہیں تک محدود نہیں ہے، اسلامی دنیا کے کئی حصوں میں امریکا کے تیار کیے ہوئے ٹیلی وژن پروگراموں کی بھرمار ہے، تیسری دنیا کے دوسرے باشندوں کی طرح مسلمان بھی خبر رساں ایجنسیوں کے اس مختصر گروہ پر انحصار کرتے ہیں، جس کا کام ہی یہ ہے کہ وہ تیسری دنیا سے مختلف طرح کی خبریں جمع کرتے ہیں، پھر تیسری دنیا کے لیے ہی انھیں جاری کر دیتے ہیں یا اس طرح تیسری دنیا خاص طور پر اسلامی ممالک جن سے خبریں وجود میں آتی ہیں، وہ خبریں وصول کرنے والے بن جاتے ہیں اور تاریخ میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ اسلامی دنیا اپنے متعلق ان تشبیہات، تاریخ اور ان اطلاعات کو سیکھ رہی ہے، جو مغرب نے تیار کی ہیں، یہ بات اس وقت ڈرامائی انداز میں سامنے آئی جب خلیج کی جنگ کے دوران زیادہ تر عرب سی این این دیکھنے لگے، یہ بھی افواہ ہے کہ ان میں صدام حسین بھی شامل تھا، اور اس کے نزدیک سی این این جنگی خبروں کا سب سے بڑا اور معتبر ذریعہ تھا، اگر اس بات میں اس حقیقت کا بھی اضافہ کر دیا جائے کہ اسلامی دنیا کے طالب علم اور سکالر ابھی تک امریکی اور یورپی لائبریریوں اور تعلیمی اداروں پر اس بات کے لیے انحصار کرتے ہیں کہ آج جسے مشرق وسطیٰ کا مطالعہ کہا جاتا ہے وہ اسے ان کے ذریعے سیکھ سکیں، حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اسلامی دنیا میں کہیں بھی ایسی کوئی مرکزی لائبریری موجود نہیں جس میں عربی زبان کی کتابوں کا مکمل ذخیرہ موجود ہو، پھر انگریزی کو تو ایک عالمی زبان کی حیثیت حاصل ہے مگر عربی، فارسی اور ترکی کو نہیں ہے، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ معاشی طور پر تیل کی بنیاد پر قائم اسلامی دنیا اپنے شرفا کے لیے مقامی باشندوں میں سے ایک ایسا انتظامی

طبقہ تیار کر رہی ہے، جو اپنی اقتصادیات، اپنے دفاعی نظام اور اپنے سیاسی مفادات کے لیے دنیا بھر میں پھیلی ہوئی صارفین کی اس منڈی کے محتاج ہیں، جس پر مغرب کا غلبہ ہے، ان باتوں پر اگر غور کریں تو اس بات کی بڑی درست مگر مایوس کن تصویر سامنے آ جاتی ہے کہ معاشرے کا وہ چھوٹا سا حصہ جس کی میڈیا خدمات انجام دے رہا ہے اور جس نے میڈیا کو قائم کیا ہے، اس میڈیا کے انقلاب نے ''اسلام'' کی کیا حالت کر دی ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں ردعمل کے طور پر ظاہر ہونے والی جس کیفیت کو بیان کرتا آیا ہوں وہی پوری طرح چھائی ہوئی ہے اور اسلام کا آزادانہ احیا ہو رہا ہے لیکن زیادہ درست یہ کہنا ہوگا کہ اسلام کا آزادانہ احیا نمایاں انداز میں نہیں ہو رہا، میں ''اسلام'' اور ''اسلامک'' جیسے الفاظ کو اس لیے استعمال کرنا پسند نہیں کرتا کیونکہ کئی مسلم معاشروں اور ریاستوں میں اور مغرب میں بھی ان الفاظ کے ذریعے ''اسلام'' کو اس سیاسی پردے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے جس کا مقصد ان چیزوں کو ڈھانپنا ہوتا ہے جو کسی طور پر بھی مذہبی نہیں ہیں، ایسی صورت میں ہم پوری ذمہ داری کے ساتھ اسلام کی تعریف کو اور اس کے اندر اس ترقیاتی عمل کو کیونکر زیر بحث لا سکتے ہیں جو مسلمانوں کی طرف سے سامنے آتی ہے؟

آیئے اس صورت حال کا ایک مرحلہ دار تجزیہ کریں، سب سے پہلے میکسم روڈن سن (Maxime Rodinson) کی پیروی کرتے ہوئے ہمیں مسلم مذہب کی ان بنیادی تعلیمات کو الگ کر لینا چاہیے جو قرآن میں ہیں اور جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ اللہ کے الفاظ ہیں، اسلامی ایمان کی یہی وہ ٹھوس شناخت ہے جن کے ساتھ سلمان رشدی نے اپنی کتاب شیطانی آیات (Satanic Verses) میں چھیڑ چھاڑ کی ہے، اس نے جس طرح انھیں بیان کیا ہے اس کا وہ انداز ہی ہمیں فوری طور پر اس کی کتاب سے دور لے جانے کے لیے کافی ہے، اس مرحلے سے گزرنے کے بعد جب ہم دوسرے مرحلے میں داخل ہوتے ہیں تو یہ درجہ قرآن کی ان متضاد تفاسیر کا ہے جن سے مختلف اسلامی فرقے، فقہی مکاتب فکر، علوم تفسیر کے انداز، لسانی نظریات اور اسی قسم کی دوسری چیزیں وجود میں آتی ہیں، قرآن سے ماخوذ کرنے کے دور تک پھیلے ہوئے اس سلسلے میں روڈن سن کے مطابق یہ بات نمایاں ہے کہ سب ''ماخذ کی طرف رجوع'' کرتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ خالص اسلامی تصورات کی روح تک پہنچنے کا جذبہ موجود ہے اور یہی وہ جذبہ ہے جسے روڈن سن اسلام کے اندر ''مستقل انقلاب'' کا نام دیتا ہے، تاہم وہ یہ بات نہیں کہتا کہ تمام توحید پرست مذاہب اور زیادہ تر نظریاتی تحریکیں اسی جذبے سے سرشار رہتی ہیں، یہ بات طے کرنا بڑا مشکل ہے کہ اس معاملے میں اسلام دوسروں سے زیادہ انقلابی استقلال رکھتا ہے یا نہیں البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ جب ''ماخذ کی طرف رجوع'' کیا جاتا

ہے تو اس سے تحریکیں وجود میں آتی ہیں، وہابیوں کی تحریک اور ایرانی انقلاب کا مذہبی رجحان اس کی مثالیں ہیں، ان تحریکوں کا اس معاشرے پر اثر جہاں یہ اُٹھتی ہیں، مقام اور قوت کے اعتبار سے کم یا زیادہ ہوتا ہے، انیسویں صدی کے سوڈان میں مہدی ازم ایک نظریاتی تحریک کے طور پر اُبھرا تھا، مگر آج کے اور اس وقت کے مہدی ازم میں بڑا فرق ہے، اسی طرح مصر کے اخوان المسلمین 1940ء کے اواخر سے 1950ء کے وسط تک آج کی نسبت بڑی طاقتور نظریاتی تحریک سمجھی جاتی تھی، شام کی اخوان المسلمین اپنی تنظیم اور مقاصد کے اعتبار سے مصر کی جماعت سے قطعی مختلف ہے، 1982ء میں حافظ الاسد نے اس جماعت کو مٹانے کے لیے بڑے جبر سے کام لیا تھا، اس کے فوجیوں نے اخوان المسلمین کے کئی ہزار ارکان کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔

اب تک ہم ایک ایسے اسلام کے متعلق گفتگو کرتے چلے آ رہے ہیں جو قطعی طور پر تو نہیں مگر اُصولی طور پر اعتقادات اور نظریات سے عبارت ہے اور ہم اس میدان میں داخل ہو چکے ہیں، جہاں اختلاف اور تضاد دونوں موجود ہیں، اس معلوم صورت میں ''اسلام'' اور ''اسلامی'' کے لیبل استعمال کرتے ہوئے ہمارے لیے یہ اختیار لازم ہے کہ ہم اس بات کو واضح کر دیں کہ ہم کس اور کس کے اسلام کا حوالہ دے رہے ہیں، یہ معاملہ اس وقت زیادہ پیچیدہ ہو جاتا ہے جب ہم روڈن سن کی پیروی کرتے ہوئے اپنے تجزیے میں تیسرے درجے کو شامل کرتے ہیں۔ مناسب ہوگا کہ یہاں تفصیل سے اس کا ذکر کر دیا جائے؛ روڈن سن کہتا ہے:

> ''اسلام کا ایک تیسرا درجہ بھی ہے جسے پہلے دو درجوں سے بڑی احتیاط کے ساتھ الگ کرنے کی ضرورت ہے، اس درجے کا تعلق ان طریقوں سے ہے، جن سے مختلف نظریات کو رواج حاصل ہوا، اور اس رواج کے تحت عمل کی ایک شکل وجود میں آئی، اس عمل نے اگر ان رواجوں کو اُبھارا نہیں تو انھیں متاثر ضرور کیا، اگر حالات کا قریب سے جائزہ لیا جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ قرون وسطیٰ کا اسلام مختلف نظاموں سے ڈھلا، اور ہر ایک نظام مختلف انداز میں برقرار رہا، جہاں بیرونی حوالوں اور تحریروں نے مختلف نظاموں پر ایک جیسے اثرات مرتب کیے، وہاں بھی تبدیلی ان کے اندر سے ہی آئی، اس وقت جو بات زیرِ غور ہے، اسے گھٹا کر ہم تضاد کا نام نہیں دے سکتے، ایک ایسے تضاد کا جس میں ایک طرف اعتقادات اور ''وراثتی'' رجحان کا دفتر ہے اور دوسری طرف وہ ''کٹر مذہبی'' رجحان ہے، جسے مسلمانوں کی اکثریت تسلیم کرتی ہے، اس مسئلے میں اور دوسرے معاملات میں بھی جب تصدیق کا مرحلہ آتا ہے، تو مقدس کتاب کی کسی ایک آیت کی تفسیر ہی بنیادی تبدیلی لانے کے لیے کافی ہو جاتی ہے، یہ تفسیر ایسا تنقیدی یا انقلابی رویہ پیدا کر سکتی ہے، جو اس فرد تک بھی محدود رہ سکتا ہے جو اس تفسیر سے متاثر ہوا اور اس سے دوسروں تک بھی پہنچ سکتا ہے، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے انقلاب یا اختراع سے جو راہیں بنائی گئی تھیں، ان کی تشریح بڑے قدامت پسندانہ انداز میں اعتقادات کے حوالے اور صوفیانہ طریقے سے ہونے لگتی ہے، اس طریقے کار کی کئی مثالیں موجود ہیں جنھیں بلاشبہ نظریات کے عام قانون کا نام دیا جا سکتا ہے، اس سلسلے میں اسماعیلی ''فرقے'' کا نمودار ہونا قابلِ ذکر ہے، قرون وسطیٰ میں جب اسماعیلی اُٹھے تو اس وقت کے مروجہ اسلامی نظام کو غیر اسلامی قرار دے کر وہ انقلابی تخریب کاری کا پرچار کرتے تھے، آج ان کے لیڈر آغا خان کو دیکھیے، ارب پتی ہیں، ان کا کام فلمی ستاروں اور مشہور حسیناؤں کی قربت میں دولت لٹانا ہے اور ان کے متعلق سکینڈلوں پر مشتمل خبریں عموماً گردش میں رہتی ہیں۔
>
> اپنی بات کو سمیٹتے ہوئے میں یہ کہوں گا کہ مقدس کتابوں میں درج مضامین کوئی واضح فرمان جاری نہیں کرتے، عام طور پر ثقافتی روایات اپنے قواعد و ضوابط کے اعتبار سے، اپنے فرامین کے لحاظ سے اور اپنے نظریاتی متن کے حوالے سے یا اوّل الذکر سے جو رویہ اُبھرتا ہے، اس کی روشنی میں تصورات اور نظریات کے بے شمار نمونے سامنے آ جاتے ہیں اور ان سے یہ گنجائش پیدا ہو جاتی ہے کہ ایک دوسرے سے متضاد مضامین کو بھی درست قرار دے دیا جائے۔

جس طرح قرآن کے بغیر اسلام کا کوئی وجود نہیں ہے، اسی طرح پہلے دو تجزیوں کے بغیر اس تیسرے تجزیے کی تفسیر یا تشریح بھی ممکن نہیں ہو سکتی، اگر مسلمان قرآن کو نہیں پڑھتے، اس کی تفسیر نہیں کرتے، ان کا تعلق رسوم و رواج اور سماجی حقیقتوں کے ساتھ جوڑنے کی کوشش نہیں کرتے تو قرآن کا بھی کوئی وجود نہیں رہتا، پھر جب تفسیر میں سنی اسلام جیسا بڑا کٹر رجحان موجود ہو تو انقلابی ہنگامے بڑی آسانی کے ساتھ برپا ہو سکتے ہیں، ہمیں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ سنت کا مطلب ہی اتفاق رائے سے مذہبی کٹر پن قائم کرنا ہے، یہاں میں مصر میں سادات کی حکومت اور نام نہاد بنیاد پرستوں کے درمیان اختلاف کا ذکر کروں گا، اس اختلاف کی وجہ مذہبی کٹر پن ہی تھا، سادات اور اس کے ساتھ اقتدار میں شامل اس کے مسلمہ ساتھی سنت جماعت سے تعلق

کا دعویٰ تو ضرور کرتے تھے مگران کا عمل ان کے اس دعوے کی تصدیق نہیں کرتا تھا، اس کے برعکس اس کے مخالفین یہ ثابت کرنے میں کامیاب رہے تھے کہ وہ صحیح معنوں میں سنت پر کاربند ہیں۔

اگر ہم اسلام کے ان تینوں درجوں میں مسلمانوں کے ماضی، حال اور مستقبل کو بھی شامل کردیں تو ساتویں صدی سے لے کے آج تک ''اسلامی پیش قدمیوں'' کا دورانیہ، چین سے نائجیریا، سپین سے انڈونیشیا، روس اور افغانستان سے تیونس تک پھیلی ہوئی جغرافیائی حدبندیوں سے پھوٹتے ہوئے مختلف اسلامی معاشرے مل کر یہ بات سمجھا دیتے ہیں کہ مغربی میڈیا اور مغربی ثقافت اپنے سیاسی تقاضے پورے کرنے کے لیے انھیں ''اسلام'' کا خوشامدی دربار کیوں قرار دیتے ہیں، میں اس نتیجے پر بھی پہنچا ہوں کہ اسلام نے اسلامی اور مغربی حالات سے عہدہ برآ ہونے کی جس قدر کوششیں کی ہیں، ان کی جس قدر اقسام ہیں یا ان کے درمیان جتنا تضاد پایا جاتا ہے، وہ سب سیاست کے زمرے میں آتا ہے اور ان مختلف رنگوں کا جب عمل، جدوجہد اور تفسیر کی حکمت عملی کے حساب سے تجزیہ کیا جاتا ہے تو وہ کسی سے کم ثابت نہیں ہوتے، اب میں سرسری انداز میں یہ سمجھانے کی کوشش کروں گا کہ اس سارے عمل میں چیزوں کا کتنا چکرا دینے والا پیچیدہ مجموعہ شامل ہے، شاید مجھے اس بات کو یوں کہنا چاہیے تھا کہ سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ کسی شخص کو بنیادی طور پر جس چیز کا اندازہ لگانا ہوتا ہے وہ اسے تحریر میں ضبط نہیں کرتا۔

ابھی ہم یہ بات کہنے کے لائق نہیں کہ ''اسلامی تاریخ'' جیسی کوئی چیز بھی ہے، اسلامی دنیا اور یورپ یا جاپان کے درمیان فرق کے لیے ہم اس اصطلاح کو استعمال ضرور کرتے ہیں، اسلامی اور یورپی سکالر اس بات پر متفق نہیں ہیں کہ کیا اسلام نے اپنی جڑیں کسی جغرافیائی خطے میں آبادی یا سماجی اور اقتصادی ڈھانچے کی موجودگی کی بدولت قائم کی تھیں یا ایک خانہ بدوش زندگی اور ایک مخصوص علاقے میں بیٹھ رہنے کے درمیان جو تعلق ہوتا ہے وہ اس کی بنا پر قائم ہوئیں، جہاں تک اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار کا تعلق ہے یہ بھی خود اتنے پیچیدہ ہیں کہ ان سے بھی ''اسلامی'' تاریخی کردار کی تصویر نہیں اُبھرتی، غور کرنے کی بات یہ ہے کہ علوی، عثمانی، صفوی، ازبک اور مغل جنھوں نے بیسویں صدی تک ہندوستان، ترکی، مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ میں عظیم ریاستیں قائم کیں، ان کی اور آج کی اسلامی ریاستوں کے درمیان کیا قدر مشترک ہے؟ اسلامی علاقوں میں ترک ایرانی اور ترک عربوں کے درمیان جو فرق پایا جاتا ہے اور جس طرح ہمیں ان نسلوں کا ماخذ بھی مختلف ملتا ہے، اس کی ہم کس طرح وضاحت کرسکتے ہیں؟ البرٹ ہورانی (Albert Hourani) اسے یوں بیان کرتا ہے کہ اسلام کے اندر...... چیزوں کو بیان کرنے، ان کی تشریح کرنے اور صفات متعین کرنے کے مسائل اس قدر

زیادہ ہیں کہ ان مغربی باشندوں کی تو بات ہی کیا جو سکالر نہیں ہیں خود مغربی سکالروں کا یہ حال ہے کہ وہ ان کے سلسلے میں سوچ میں پڑ جاتے ہیں۔

یہ بات بڑی واضح ہے کہ مختلف مضامین میں اسلامی تاریخ جیسے الفاظ کے معنی ایک جیسے نہیں ہیں اور اگر کسی مضمون کے بغیر صرف اس لفظ کو لے لیا جائے تو یہ لفظ اپنی جگہ کچھ بھی واضح کرنے کے لائق نہیں ہوتا، دوسرے الفاظ میں ''اسلام'' اور اس سے اخذ کی گئی تمام اصطلاحات ''تصوراتی نوعیت'' کی ہوتی ہیں، اگر انھیں تاریخی وضاحتوں کے لیے اصولوں اور طریق کار کا درجہ دینا مقصود ہو تو ضرورت اس بات کی ہوگی کہ انھیں بڑی نفاست کے ساتھ، موزوں انداز میں، معانی میں ردوبدل کرتے ہوئے اور دوسری تصوراتی چیزوں کے ساتھ ملا کر استعمال کرنا ہوگا، یہ استعمال کس حد تک ممکن ہے اس کا انحصار تاریخ کی اس قسم پر ہے جسے تحریر کیا جارہا ہے۔ ان اصولوں کا اقتصادی تاریخ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں بنتا، ان کے متعلق روڈن سن اپنی کتاب ''اسلام اور سرمایہ دارانہ نظام'' (Islam et Capitalisme) میں لکھتا ہے کہ جن معاشروں میں اسلام کی بالادستی ہے ان کی اقتصادی زندگی کو مذہبی اعتقادات یا قوانین کے حوالے سے بیان نہیں کیا جاسکتا، اس میں کوئی شک نہیں کہ تجارتی معاملات سے متعلق اسلامی قوانین نہ صرف موجود ہیں بلکہ ان کا اپنی جگہ اثر بھی ہے لیکن ان کی وضاحت کے لیے اسلام سے ہٹ کے دوسری اصطلاحیں زیادہ موزوں سمجھی جاتی ہیں، کاہن (Cahen) اور کچھ دوسرے دانشوروں کا کہنا ہے کہ اس سلسلے میں اسلامی معاشرے کی جگہ ''مشرق قریب کا''، ''بحیرۂ روم''، ''قرونِ وسطیٰ''، ''صنعتی دور سے پہلے کا'' معاشرہ جیسی اصطلاحیں زیادہ استعمال ہوتی ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ اسلام سماجی سیاسی تاریخ کو واضح تو کرسکتا ہے مگر وہ تمام معلومات بہم نہیں پہنچا سکتا جن کی ضرورت ہوتی ہے، اس بات کو یوں سمجھیے کہ وہ ''اسلامی'' ریاستیں جو اسلام کے بہت قریب ہیں ان کے اداروں اور ان کی پالیسیوں کی بھی وضاحت کرنے کے لیے اسلام کو نہیں، ان کے جغرافیائی محل وقوع، ان کی اقتصادی ضروریات، ان کے حکمران خاندانوں اور فرمانرواؤں کے مفادات کو سامنے رکھنا پڑتا ہے، حتیٰ کہ جن اداروں کی بنیاد ہی اسلامی قوانین پر ہوتی ہے انھیں بھی پوری طرح اسلامی اصطلاحات کے حوالے سے سمجھنا ممکن نہیں ہوتا، اس دلیل کو سامنے رکھ کر اگر ''اسلام میں غلامی'' جیسے تصورات کو لیجیے تو ان کا قریب سے مطالعہ انھیں بے معنی بنا دیتا ہے، اس سلسلے میں میلیٹ (Milliot) نے مراکش کے عمال کا مطالعہ کیا ہے جس کے بعد وہ کہتا ہے کہ اسلامی قوانین میں نہ صرف مقامی رسوم ورواج کو شامل کرنے کی گنجائش ہمیشہ سے موجود رہی ہے بلکہ ان کو قانون کے طور پر رائج بھی کیا جاتا رہا ہے، اس لیے کسی قسم کی ادبی تاریخ، جس کا تعلق دور جدید سے پہلے کے زمانے سے ہو اسے خالص اسلامی

حوالوں سے اسی صورت میں بیان کیا جاسکتا ہے جب یہ ظاہر کرنا مقصود ہو کہ خود کو برقرار رکھنے اور ترقی دینے کے نظام کے تحت اسلامی نظریات میں غیر ملکی نظریات آ کر شامل ہو گئے ہیں، چنانچہ ہمیں فلسفے تک کو اس نظر سے دیکھنا ہے کہ مسلمانوں نے یونانی فلسفے کی سوچ اور طریق کار کو اس لیے نہیں اپنایا کہ یونانی فلسفے پر عربی لبادہ ڈال دیا جائے بلکہ اس طرح انھوں نے اسلامی ایمان اور اعتقاد کے متعلق اپنی تشریح پیش کرنے کا یونانی انداز اختیار کیا ہے۔

اور آگے بڑھتے ہیں تو ہمیں بشریات کے ماہرین سے اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملتا کہ انسان کا قدیم زمانے سے جو سلسلہ چلا آ رہا ہے اس میں کوئی سلسلۂ نسب اسلامی بھی ہے اور اس نوع کی کوئی تجزیاتی یا علمی اقدار سے بھی ہے یا نہیں، ہمیں اسلامی معاشرے میں اقتدار اور اختیارات کی تقسیم کے متعلق اس سے بھی کم معلومات میسر آتی ہیں، ہم یہ جانتے ہیں کہ جغرافیہ اور تاریخ میں کئی اسلامی معاشرے بکھرے ہوئے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ہم اسلامی قانونی ضابطوں اور ان کے اطلاق کے یا قواعد وضوابط اور ان کے نفاذ کے درمیان جو تعلق ہے، اس کے متعلق ہم یہ اندازہ کیونکر لگا سکتے ہیں کہ اس کی صورت ایک ہی رہی یا اس میں تبدیلیاں آتی چلی گئیں، مثال کے طور پر ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ کیا تمام اسلامی معاشروں نے یا ان میں سے چند ایک نے اپنے اختیارات کے بنیادی نکات کو مقدس نظریات سے قانونی نظریات میں تبدیل کر دیا تھا، زبان، جمالیاتی ڈھانچا، ذوق کی سماجی حیثیت، عبادت کے مسائل، شہری علاقہ، آبادی کا منتقل ہونا، احساسات کے انقلاب، ان سب کا تعلق ان مضامین سے ہے، جن کا مسلمان اور غیر مسلم سکالروں نے ابھی بمشکل مطالعہ شروع کیا ہے، پھر یہ سوال بھی ہے کہ کیا مسلمانوں کا کوئی سیاسی رویہ بھی ہے؟ مسلم معاشروں میں طبقات کیسے وجود میں آتے ہیں اور یہ کس اعتبار سے پوری طبقاتی تقسیم سے مختلف ہوتے ہیں؟ وہ کیا تصورات، تحقیق کے آلات، تنظیمی ڈھانچے، اور دستاویزات ہیں، جن کے ذریعے ہم روزمرہ کی تمام مسلم زندگی کی نشاندہی کر سکتے ہیں؟ ''اسلام'' بالآخر ایک مفید خیال ثابت ہوتا ہے یا یہ جس قدر ظاہر کرتا ہے اس سے زیادہ چھپا لیتا ہے یا اسے مسخ کر دیتا ہے، اس کا رُخ کسی دوسری طرف موڑ دیتا ہے اور اسے زیادہ نظریاتی بنا دیتا ہے؟ سب سے بڑھ کر یہ بات بھی جاننا ضروری ہے کہ جو شخص یہ سوالات پوچھ رہا ہے اس کی حیثیت کا ان کے جوابات پر کیا اثر مرتب ہوگا؟ پھر ایک مسلم عالم دین کے لیے یہ سوالات ایران، مصر، سعودی عرب میں پوچھنا، دس سال پہلے کی نسبت آج کتنا مشکل ہوگا؟ اس طرح جو جوابات میسر آئیں گے، ان کا ہم ان سوالات سے کیونکر موازنہ کر سکیں گے جو ایک روسی مستشرق، فرانس میں عرب کا ماہر، پیرس کے جنوب مغربی علاقے اور سے، (Quai d' Orsay)

میں بیٹھ کر یا شکاگو یونیورسٹی سے ایک امریکی ماہر بشریات اس سلسلے میں پوچھے گا؟

سیاسی اصطلاح میں ردعمل کے طور پر جو اسلام کا معیاری رویہ اُبھرتا ہے؟ وہ ''اسلام'' کے متعلق مغرب کے اس خاکے مطابق ہی ہوتا ہے جس میں اسے تباہ کن متضاد چیزوں کا مجموعہ ظاہر کیا جاتا ہے، لبنان کے سوا مرکزی اسلامی علاقے کی وہ تمام ریاستیں جو شمالی افریقہ سے جنوبی ایشیا تک پھیلی ہوئی ہیں، شعوری طور پر اپنا اظہار اسلامی انداز میں کرتی ہیں، یہ ایک سیاسی اور ثقافتی حقیقت ہے کہ اب اس انداز کو مغرب نے بھی سمجھنا شروع کر دیا ہے، مثال کے طور پر سعودی عرب کا نام ہی یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ سعود کے شاہی گھرانے کی ریاست ہے، جس نے اس علاقے کے دوسرے بڑے قبائل کو شکست دے کر یہ ریاست قائم کی ہے، یہ خاندان، ریاست اور اسلام کے نام پر جو کہتا ہے اور کرتا ہے اس سے اس کی خاندانی قوت کا اظہار ہوتا ہے، یہ قوت اس کے علاوہ ہے جو اسے عالمی برادری کے رکن کی حیثیت سے اور اپنے عوام پر قابلِ ذکر اختیار اور قانونی حق سے حاصل ہوئی ہے، اُردن، عراق، کویت، شام اور آج سے پہلے کے ایران اور پاکستان کے متعلق بھی یہی بات کہی جا سکتی ہے لیکن ان سب کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان پر ایک ہی خاندان کی حکمرانی ہوتی ہے۔ تاہم یہ درست ہے کہ ان ممالک میں زیادہ تر ایک اقلیت کی ہی حکمرانی قائم ہوتی ہے، اس میں ایک مذہبی فرقہ، واحد سیاسی جماعت، ایک خاندان یا ایک علاقائی گروپ ریاست اور اسلام کے نام پر دوسروں کو اپنے تابع بنا لیتا ہے، اس معاملے میں لبنان اور اسرائیل دوسروں سے مختلف ہیں، یہ دونوں اگرچہ اسلامی دنیا کے اندر واقع ہیں مگر ان میں سے ایک پر عیسائی اقلیت کی حکمرانی ہے، جسے چیلنج کرنے والے دوسرے طبقوں کا زور مسلسل بڑھتا چلا جا رہا ہے جبکہ دوسری میں یہودیوں کی حکمرانی ہے اور یہ دونوں کسی حد تک اپنی بالادستی کو مذہبی حوالے سے ظاہر کرتے ہیں۔

ان تمام ریاستوں میں ہر ایک نے اپنے اپنے طریقے سے بڑی حد تک محسوس کیا ہے کہ انھیں بیرونی خطرے کا سامنا ہے، اس لیے انھوں نے اپنے تحفظ کے لیے مذہب، روایات اور قوم پرستی کا سہارا لیا ہے، اس سلسلے میں یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ تحفظ کے ان اقدامات کے باوجود ان میں سے ہر ایک شدید مخمصے میں مبتلا ہے، اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ایک طرف تو مملکت کا ڈھانچا یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ اس کے اندر مختلف قوموں، مذاہب اور فرقوں کا اجتماع ہے، چنانچہ سعودی عرب میں مختلف قبیلے اور خاندان اپنے آپ کو ایک ایسی ریاست کی پابندیوں میں جکڑا ہوا محسوس کرتے ہیں، جو سعود خاندان کا عرب کہلاتی ہے، اسی طرح ایران میں آج تک جو ریاستی ڈھانچا چلا آ رہا ہے اس میں آذربائیجان، بلوچی، کرد، عرب اور دوسروں کو

اس طرح دبا کر رکھا جاتا ہے کہ ان کے انفرادی نسلی وجود کی نفی ہو جاتی ہے، اسی نوعیت کی کشیدگی، زیادہ وسیع پیمانے پر شام، اُردن، عراق، لبنان اور اسرائیل میں بھی پائی جاتی ہے، دوسری طرف ان ریاستوں میں سے ہر ایک میں جو قوت غالب ہے، اس نے قومی اور مذہبی نظریات کو اس قوت کے خلاف اتحاد کا تاثر دینے کے لیے استعمال کیا ہے، جس سے وہ بیرونی خطرہ محسوس کرتی ہے، یہ بات سعودی عرب کے معاملے میں زیادہ واضح ہے وہاں اسلام ہی وہ نظریاتی تحریک ہے، جس نے وسیع اور جائز انداز میں لوگوں کو متحد کر رکھا ہے، 1980ء کے عشرے کے آخری برسوں میں سعودی عرب کے شاہ کو خادم الحرمین یعنی مکہ اور مدینہ کی دو مقدس ترین عبادت گاہوں کا نگران قرار دیا گیا، اس طرح اس لقب نے بڑی صراحت کے ساتھ شاہ کے اسلامی استحقاق کو واضح کر دیا ہے، سعودی عرب میں اور انقلاب آنے کے بعد ایران میں ''اسلام'' کو قومی سلامتی کے مختلف درجات کے ساتھ پہچان کے طور پر منسلک کر دیا گیا ہے، چونکہ یہ دونوں سیاسی اکائیاں اسلام کے متعلق مغرب کے دقیانوسی تصور پر بھی پوری اُترتی ہیں، اس لیے ان پر اندرونی اور بیرونی دباؤ اور بھی بڑھ جاتا ہے۔

اس لیے ایک متحدہ یا کم از کم ہم آہنگ تحریک ہونے کے بجائے ''اسلام کی طرف واپسی'' متعدد سیاسی حقیقتوں کی حامل ہو گئی ہے، امریکا کے نزدیک یہ انتشار اور تفرقہ بازی کے تصور کی نمایندگی کرتی ہے، بعض حالتوں میں جس کی مزاحمت ضروری ہے اور بعض حالتوں میں جس کی حوصلہ افزائی لازمی قرار پاتی ہے، ہم کمیونزم کے مخالف سعودی مسلمانوں کا ''افغانستان کے دلیر باغیوں کا، سادات، سعودی شاہی خاندان، حسنی مبارک اور اُردن کے شاہ حسین کا ذکر ''معقول مسلمانوں کے طور پر کرتے ہیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ ہم (امام) خمینی کے اسلامی مزاحمت کاروں اور قذافی کے تیسرے اسلامی راستے کو بُرا بھلا کہتے ہیں اور ہم ''اسلامی سزاؤں'' سے جن پر خلخلی[1] عمل درآمد کر رہا ہے ایک عجیب طرح کی حریفانہ محبت رکھتے ہیں، ان کے بارے میں ایک متضاد رویہ اختیار کرتے ہیں اور اس کی حمایت اس لیے کرتے ہیں کہ یہ اقتدار کو قائم رکھنے کا ایک مؤثر طریقہ ہے، مصر میں اخوان المسلمین، سعودی عرب کے وہ جہادی جنھوں نے مسجد نبوی پر قبضہ کر لیا تھا، شام میں اخوان المسلمین اور ان کے ہراول دستے، جنھوں نے ایک بار بعث پارٹی کی حکومت کی مخالفت کی تھی، ایران میں مسلم مجاہدین، فدائین اور آزاد خیال لوگ یہ سب اس معاندانہ لہر کا ایک چھوٹا سا حصہ ہیں، جو مسلم امہ کے اندر رواں دواں ہے مگر جس کے بارے میں لوگ بہت کم جانتے ہیں، اسی طرح مختلف مسلم قوتیں بھی ہیں، جن کی پہچان کے آگے نو آبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد قائم ہونے والی ریاستوں نے، رکاوٹیں کھڑی کر دی

۱۔ صادق خلخلی کو امام خمینی نے حاکم شرع مقرر کیا تھا، یہ شریعت کے معاملے میں بڑے سخت تھے اور کوئی رو رعایت نہیں کرتے تھے، ان کے زمانے میں اسلامی سزائیں رائج ہوئیں، ان کا انتقال 26 نومبر 2003ء کو ہوا۔ (مترجم)

ہیں، یہ قوتیں بھی اپنے اسلام کے لیے نعرہ زن ہیں، اور ان کے زیر سایہ ساری مسلم دنیا میں، مدرسوں، مسجدوں، برادریوں، انجمنوں، سیاسی جماعتوں، یونیورسٹیوں، تحریکوں، دیہاتوں اور بڑے شہروں کے مراکز میں اسلام کی کہیں زیادہ اقسام اُبھر رہی ہیں اور ان میں سے کئی کا یہ دعویٰ ہے کہ ''سچے اسلام'' کی طرف واپسی کے لیے یہ اپنے ارکان کی رہنمائی کر رہی ہیں۔

اس متنوع اسلامی توانائی کا انتہائی مختصر سا حصہ مغرب کے علم میں ہے اور اسے دیکھ کر ہی مغربی میڈیا اور سرکاری ترجمانی کی حالت یہ ہو گئی ہے کہ وہ ''اسلام'' پر توجہ مرکوز کرنے پر زور دے رہے ہیں، یہاں سمجھنے کی بات یہ ہے کہ جب اسلام کی ''حیات نو'' پر اصرار کیا جاتا ہے تو بہت سی سنگین غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں، اسلام اپنے ماننے والوں کے ذہنوں اور دلوں میں یقیناً ہمیشہ زندہ اور جیتا، جاگتا رہا ہے اور فکر و تصور، احساسات اور انسانی پیداوار کے حوالے سے بھرپور رہا ہے اور ڈبلیو منٹگمری واٹس (W. Montgomery Watts) کی ''اسلامی فکر و تصور'' (Islamic vision) کے مطابق اسلام کے مخلص پیروکاروں کو ہمیشہ تخلیقی الجھنوں نے مصروف رکھا ہے، انصاف کیا ہے؟ بدی کیا ہے؟ روایات اور ابتدائی اعتقادات پر کب انحصار کرنا ہے؟ ذاتی تشریح یعنی اجتہاد کب درست اور جائز ہوتا ہے؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن میں بڑی تیزی کے ساتھ اضافہ ہوتا رہتا ہے مگر ان الجھنوں کو دور کرنے کا کام بھی ہوتا رہتا ہے، اتنے بڑے پیمانے پر ہونے والے اس کام کے متعلق اہلِ مغرب کو بہت کم علم ہوتا ہے، کیونکہ اسلامی زندگی کا ایک بڑا حصہ نہ تو کتب و رسائل کے صفحات پر پھیلا ہوتا ہے، اور نہ شخصیتوں پر اور نہ صاف اور واضح طریقوں تک محدود ہے، اس طرح بکثرت استعمال ہونے والا لفظ ''اسلام'' ان تمام باتوں کے سمجھنے کی کوشش کے لیے اعتماد کے لائق نہیں رہتا۔

اس کے باوجود ''اسلام'' اور ''مغرب'' میں تصادم بڑا حقیقی ہے اور اس تصادم میں یہ بات نظر انداز کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے کہ تمام جنگوں میں خندقوں اور رکاوٹوں کے دو سلسلے قائم کیے جاتے ہیں، ان میں افواج بھی دو ہوتی ہیں اور ان دونوں کے آلاتِ حرب بھی ہوتے ہیں، جس طرح مسلم قوت کے خلاف مغرب متحد ہو گیا ہے، اسی طرح مغرب کے خلاف جنگ نے اسلام کے کئی طبقوں کو متحد کر دیا ہے، اس سلسلے میں اس بات کی بھی اپنی جگہ بڑی اہمیت ہے کہ جس طرح امریکا کو اسلام مقابلتاً ایک نیا عنصر معلوم ہوتا ہے، اسی طرح مسلمانوں کی اکثریت کو امریکا مغرب کا حصہ معلوم پڑتا ہے، اس سوچ سے جو بات اُبھری ہے اس پر کئی عشروں سے مختلف اسلامی حلقوں میں غور و فکر ہو رہا ہے جبکہ اسلامی ثقافت کے بے شمار مغربی سکالروں کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ پچھلی دو صدیوں سے وہ اسلامی فکر و تصور پر ''مغرب'' کے اثرات کے متعلق مبالغہ آرائی سے کام

لیتے رہے ہیں اور ان کا یہ فرض کر لینا بالکل غلط ہے کہ ''مغرب'' اور ''جدیدیت'' نے عرصہ ہوا بحراوقیانوس سے لے کر خلیج فارس تک اسلامی علم وشعور پر قبضہ کر لیا ہے، مغربی سکالروں کا یہ نتیجہ اخذ کرنا اس لیے بھی درست نہیں ہے کہ دوسرے معاشروں کی طرح اسلامی معاشرہ بھی ایک وقت میں بعض چیزوں پر توجہ دیتا ہے جبکہ دوسری دفعہ اس کا دھیان ان سے ہٹ کر دوسری چیزوں کی طرف ہو جاتا ہے، تاہم یہ بات درست ہے کہ ''مغرب'' نے مباحثوں، مقالوں اور تشریحات کے ڈھیر لگا دیے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ اس نے اسلامی دنیا کی بے شمار شخصیتوں، جماعتوں اور تحریکوں کو نہ صرف کئی منصوبے بھی دیے ہیں بلکہ کئی بڑے معاملات میں ان کی رہنمائی بھی کی ہے، چنانچہ اس سلسلے میں یہ تصور کر لینا غلط ہوگا کہ پورے عالم اسلام کی توجہ صرف اس بات پر مرکوز ہے جو اس کے لیے اجنبی یا اسلامی دنیا سے باہر کا ہے۔

یہ یاد رکھنا بڑا ضروری ہے کہ اسلامی ثقافت کا سب سے عظیم کارنامہ اس کی وہ انتہائی ذہنی قوت اور استعداد ہے جو تفسیر بیان کرتے ہوئے سامنے آتی ہے، شاید یہ بات درست ہے کہ اسلام نے کوئی زیادہ طاقتور بصری اور جمالیاتی روایات تخلیق نہیں کی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ پسپائی بھی کسی سے کم اور غیر دلچسپ نہیں ہے کہ کسی بھی تہذیب نے اتنے بڑے پیانے پر معاملات کی زبانی ترجمانی کی حوصلہ افزائی نہیں کی جتنی اسلام نے کی ہے، پورے کے پورے ادارے، تمام روایات، تمام مکاتب فکر، زبانی تبصرے، لسانی نظریے اور بصری کاموں سے اُبھرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسری مذہبی روایات ہیں، اس طرز عمل کا وجود ہی نہیں ہے، ان کا وجود ہے مگر سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اسلام میں زبانی اور لفظی تجربات کرنے کے عمل نے اپنے کسی میدان کو مخصوص کیے بغیر اور مقابلے کے بہت کم رجحان میں ترقی پائی ہے اور یہ بات کہیں اور دکھائی نہیں دیتی، اس لیے یہ بات حیران کن نہیں ہے کہ ایران کے لیے آئین میں فقیہ کو قومی رہنما کا درجہ دے دیا گیا ہے، میڈیا کا یہ سمجھنا غلط ہے کہ فقیہ، فلسفی بادشاہ کا دوسرا نام ہے، حقیقت میں فقہ پر مکمل عبور رکھنے والے کو فقیہ کہتے ہیں اور فقہ، فلسفہ قانون کی تعبیر کو کہتے ہیں، اس لیے فقیہ عام فہم میں زبردست مطالعہ کرنے والا ہوتا ہے۔

المیہ یہ ہے کہ بنیادی طور پر میڈیا نے ترجمانی کے جن اسلامی، مغربی یا امریکی طبقوں کو قائم کیا تھا اس نے اپنی تمام تر توانائیاں ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرانے پر لگا دی ہیں اور اس تصادم میں وہ ان امور کو فراموش کر بیٹھے ہیں، جن کا اس تصادم سے کوئی تعلق نہیں ہے، چونکہ ہم اس بات پر یقین کرنے کے لیے پوری طرح تیار بیٹھے ہیں کہ مسلمان، ''شیطان'' امریکا کے مخالف ہیں، اس لیے اس بات پر توجہ دینا زیادہ موزوں

ہوگا کہ درحقیقت ہوا کیا ہے، یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ مغرب میں ''خبروں'' اور ''تصویر وتصور'' کا کنٹرول مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں ہے اور یہ بات بھی درست ہے کہ مسلمان چونکہ اس بات کو سمجھنے میں تاخیر سے کام لے رہے ہیں کہ انھیں خبروں کے معاملے میں مغرب پر انحصار نہیں کرنا چاہیے، اس لیے اس تاخیر نے انھیں کچھ کرنے سے روک رکھا ہے، تیل کی دولت سے مالا مال ممالک یہ شکایت نہیں کر سکتے کہ ان کے پاس وسائل کی کمی ہے، دراصل بھرپور انداز میں دنیا کے ساتھ شامل ہونے کے ٹھوس سیاسی فیصلے تک پہنچنے کی کمی رکاوٹ بنی ہوئی ہے اور اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ مسلم ریاستیں نہ تو سیاسی طور پر، پوری طرح حرکت میں آئی ہیں نہ ان میں ہم آہنگی ہے اور نہ ابھی تک یہ ایک متحدہ قوت کا روپ دھار سکی ہیں، اس مقام تک پہنچنے کے لیے بہت سی صلاحیتوں کو اُبھارنے کی ضرورت ہے، ان میں ایک صلاحیت یہ بھی ہے کہ شعوری طور پر اپنا ایک بھرپور اور بولتا ہوا تشخص پیدا کیا جائے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ ردعمل کے طور پر یا اپنے دفاع کے لیے نہیں بلکہ سنجیدگی کے ساتھ ان مثبت اقدار کا جائزہ لیا جائے جن پر مسلمان مختلف انداز میں قائم ہیں، اس موضوع پر مسلم دنیا میں ایک بحث چل رہی ہے، یہ بحث تورث (Turath) کے انداز میں ہوتی ہے یعنی اس میں اسلامی وراثت پر گفتگو کی جاتی ہے، اس بحث سے جو نتائج برآمد ہوئے ہیں اور ان سے جو مسائل متعلق ہیں انھیں باقی ماندہ دنیا تک پہنچانے کی ضرورت ہے، اس بات کا کوئی فائدہ نہیں ہے کہ عربوں اور اسلام کے متعلق ''مغرب'' کی جارحیت پر واویلا کیا جائے، پھر اپنے آپ کو درست سمجھتے ہوئے غصے میں بھر کے پیچھے بیٹھ رہا جائے، جب اس جارحیت کی وجوہ اور مغرب کے ان پہلوؤں کا بلاخوف وخطر تجزیہ کیا جائے گا، جو اس جارحیت کی حوصلہ افزائی پر انھیں آمادہ کرتے ہیں تو اس صورت حال کو تبدیل کرنے کا یہی ایک اہم قدم بن جائے گا، لیکن صورت حال کو تبدیل کرنے کا یہ مکمل حل نہیں ہے، اگر ہم یہ نہیں چاہتے کہ اسلام کے خلاف پروپیگنڈے کا ایک نیا سلسلہ چل نکلے تو ہمیں موجودہ صورت حال کا کوئی متبادل لانا ہوگا، اس میں کچھ کلام نہیں کہ اسلام کے جارحانہ تصور پر کاربند رہنے، اسے حقیقی معنوں میں جاری رکھنے اور اس پر عمل کرنے میں آج بڑے خطرات ہیں اور اب تک جنھوں نے اس پُرخطر راستے کو اختیار کیا ہے ان میں چند مسلمان، کچھ عرب، کچھ سیاہ فام افریقی ہوں گے، پوری مسلم امہ اس راہ کی طرف نہیں بڑھی، مگر کچھ کا اس راہ پر چل نکلنا اس کی نہ صرف اہمیت کو ظاہر کرتا بلکہ اس بات کو بھی اجاگر کرتا ہے کہ اس معلوم صورت میں کیا کرنے کی ضرورت ہے۔

اس وقت صنعتی ترقی کرنے، جدیدیت کو اختیار کرنے اور ترقی دینے کی ایک دوڑ لگی ہوئی ہے، اس دوڑ میں کئی مسلم ممالک نے اپنے آپ کو صارفین کی ایک منڈی میں ڈھالنے کے حکم کی تعمیل ہے، حالانکہ

ضرورت اس بات کی ہے کہ امریکی میڈیا اور خود مسلمان بھی پوری دنیا کو یہ موقع فراہم کریں کہ وہ مستشرق کے گھسے پٹے اور خیالی مفروضوں کو رد کر سکے، پھر مسلمانوں اور مستشرقین کو اس راہ پر ڈالے کہ یہ ایک ایسی نئی تاریخ رقم کرے جو تلخیوں کو مٹا دے اور ایک نئی سماجی اور ثقافتی آگاہی کو عام کرے، مختصر یہ کہ یہ مسلمانوں کی ضرورت ہے کہ وہ ایک نئی قسم کی تاریخ میں زندہ رہنے پر زور دیں اور جسے مارشل ہوج سن (Marshall Hodgson) نے اسلامی دنیا کہا ہے، اس کی اور اس کے مختلف معاشروں کی چھان بین کریں اور ان مقاصد کو حاصل کرنے میں اتنے سنجیدہ اور اتنے مگن ہو جائیں کہ حاصل ہونے والے نتائج کو مسلم دنیا سے باہر بھی بھیج سکیں، یقیناً ایرانی مسلمانوں کے لیے علی شریعتی کے ذہن میں اس وقت یہی خاکہ موجود ہوگا جب اس نے محمد (ﷺ) کی مکہ سے مدینے کی طرف ہجرت کو اس آفاقی خیال میں بدلا کہ ''انسان کا اپنا انتخاب، اس کی جدوجہد اور اپنی اصلاح کرتے رہنے میں ہے، اس کے لیے ہجرت کا عمل لامتناہی ہے، اس نے اپنے اندر اس وقت ہجرت شروع کر دی تھی جب وہ محض مٹی تھا، اور اس اندر کی یہ ہجرت اسے خدا کی طرف لے جا رہی ہے وہ اپنی روح میں بھی ایک مہاجر ہے''۔

شریعتی جیسے افکار نے ایرانی انقلاب کے پہلے ادوار میں ان عقائد کو بیان کر دیا تھا جنھوں نے اس مفروضے کو یکسر مسترد کر دیا تھا کہ مسلمان نہ تو صحیح معنوں میں انقلاب لانے کے اور نہ ظلم و جبر کی اور ناانصافیوں کی ترجمان حکومت کو اکھاڑ پھینکنے کے متحمل ہو سکتے ہیں، اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ جس طرح شریعتی اصرار کرتے رہے تھے ویسا ہی ہوا اور ایرانی انقلاب کو اپنے ابتدائی ادوار میں اس بات کا عملی مظاہرہ کرنا پڑا کہ اسلام کو ایک انسان یا خدا کے سامنے عاجزانہ انداز میں جھکے رہنے کے لیے نہیں بلکہ اسے اسلام کو ایک تقویت بخش وجودی چیلنج کے طور پر اختیار کرنا اور اس کے مطابق زندگی گزارنا ہوتی ہے، شریعتی کے مطابق ایک ایسا دین جہاں ''معیار متعین نہ ہوں اور اس کے سامنے صرف یہی مقدس فرمان موجود ہو کہ اس نے خاکی انسان کے طور پر خدا کی طرف ''ہجرت'' کرنا ہے تو اس معلوم صورت میں مسلمان کو اپنا راستہ خود بنانا ہے، انسانی معاشرہ خود ایک ہجرت سے وجود میں آیا ہے، جو قابیل اور ہابیل کے قطبین کے درمیان ڈولتا رہتا ہے۔ ''قابیل کا قطب'' وہ حکمران بادشاہ اور اشرافیہ ہیں یعنی قوت کا کسی ایک فرد کے ہاتھ میں ہونا اس کی ترجمانی کرتا ہے جبکہ ''ہابیل کا قطب'' عوامی طبقے اور جنھیں قرآن الناس کہتا ہے اور جس میں جمہوریت، محکومیت اور برادری آتی ہے، آیت اللہ خمینی کی اخلاقی تعلیمات بھی شروع میں اتنی ہی پُر اثر تھیں لیکن وہ شریعتی کے مقابلے میں ان کے اندر لچک کم تھی علاوہ ازیں وہ مسلمانوں کی اس مشکل کو سمجھتے تھے کہ انھیں زندگی بھر حلال اور

حرام، حق اور باطل کے درمیان امتیاز کرتے رہنا ہے، اسی لیے انھوں نے ایک ایسی ''اسلامی جمہوری مملکت کے قیام کی آواز بلند کی جس کے ذریعے اُنھوں نے حق کی بالادستی قائم کرنا اور پسے ہوئے طبقے کو مصیبتوں سے آزادی دلانا تھی''۔

اس طرح کے تصورات نے ایران میں زبردست ہلچل پیدا کر دی، تاہم مغرب کے اندر اسلامی انقلاب کی طرف کوئی ہمدردانہ توجہ نہ دلائی گئی، اسلامی ممالک میں بھی ایران کے اس تجربے کی قوت، اس کا جنون، اس کی افراتفری پیدا کرنے کی قوت، اس کے ذوق و شوق سے ابھی تک خوف محسوس کیا جاتا ہے، حالانکہ اس صورت حال پر خود ایران کے اندر (امام) خمینی کے دور سے ایک بحث و مباحثہ جاری ہے جس پر زیادہ توجہ نہیں دی جا رہی، اس طرح اسلامی دنیا کے اندر اسلامی زندگی کے متعلق جو سرکاری، قدامت پسند تصورات ہیں ان کی مخالفت کی کئی صورتیں موجود ہیں، جن میں ایک جوابی ثقافتی اسلام بھی ہے جس کا اعلیٰ نمونہ ایران کا انقلاب ہے۔ چنانچہ پہلے سے موجود سرکاری اسلام اور ایرانی انقلاب کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ ''اسلام'' کے متعلق مغرب کے خیالات اپنا سلسلہ اس ''اسلام'' سے جوڑنے کو ترجیح دیتے ہیں جس کی مخالفت موجودہ دور میں خود مسلمان کی اکثریت کر رہی ہے، ان میں سزائیں، مطلق العنانیت، قرونِ وسطیٰ کے عقل و دانش کے انداز اور مذہبی حکومت شامل ہیں۔

باب اوّل

شہزادی کی کہانی

(حصہ سوم)

جب ہم اسلام کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کرتے ہیں تو اس کی قوت کو گھٹا دیتے ہیں، اسی طرح ایک ریاست، ایک حکومت، ایک گروہ بھی ضرورتاً اسلام کی ایسی ترجمانی کرتا ہے جو اس کے اپنے مقاصد سے مطابقت رکھتی ہو، ان دونوں حالتوں میں جو اسلام ہمارے سامنے آتا ہے، وہ اسلام تو نہیں ہوتا، مگر اپنی اس طرح اختیار کی ہوئی شکل میں یہ ''ہمارے'' اور ''ان کے'' درمیان تصادم کا جو رخ متعین کرتا ہے، اس سے دونوں میں سے کسی کو بھی فائدہ نہیں پہنچتا، سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ اس انداز میں یہ جس قدر ظاہر کرتا ہے اس سے کہیں زیادہ چھپالیتا ہے، میں جو کہنا چاہتا ہوں وہ اس بدنام زمانہ کہانی کے تجزیے سے کھل کر سامنے آجائے گا، جو کافی پہلے وجود میں آئی تھی۔

12 رمئی 1980ء کو پبلک براڈ کاسٹنگ سروس نے ایک فلم ''شہزادی کی موت'' دکھائی، اس فلم کو ایک برطانوی فلم ساز انتھونی تھامس (Anthony Thomas) نے تیار کیا تھا، اس فلم کی نمائش سے ایک ماہ پہلے اسی کی بنا پر برطانیہ اور سعودی عرب کے درمیان سفارتی تعلقات میں تلخی پیدا ہوئی تھی، جس کے نتیجہ میں لندن سے سعودی سفیر کو واپس بلالیا گیا تھا، جواباً برطانیہ نے یہ پابندی عائد کردی تھی کہ سعودی عرب کے باشندے وہاں تفریح کے لیے نہیں آسکتے اور دھمکی دی تھی کہ دوسری پابندیاں بھی لگائی جائیں گی، یہ تمام اقدامات تو زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکے مگر ان سے یہ سوال ضرور پیدا ہوگیا کہ یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ سعودیوں کے مطابق یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ اس فلم میں نہ صرف اسلام کی توہین کی گئی تھی، بلکہ اس میں بالعموم عرب معاشرے اور بالخصوص سعودیوں کے طرز انصاف کی غلط عکاسی کی گئی تھی، اگر ہم اس فلم کو دیکھیں تو اس کی کہانی ایک نوجوان شہزادی اور اُس کے اُس عاشق کی ہے جو ایک عام آدمی تھا، ان دونوں کو سزائے موت دی جاتی ہے اس فلم کے متعلق اسے بنانے والے کا موقف یہ ہے کہ اس نے سچ کی تلاش میں اس فلم کو ڈرامائی دستاویز کی شکل دے دی ہے، بات دراصل یہاں سے شروع ہوئی کہ ایک برطانوی رپورٹر نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی تھی کہ اس

جوڑے کے ساتھ کیا ہوا ہے، اس کھوج میں وہ بیروت گیا، جہاں اس نے لبنانیوں اور فلسطینیوں سے معلومات اکٹھی کیں، پھر وہ سعودی عرب گیا، جہاں اسے سرکاری موقف سے آگاہ کیا گیا، ان معلومات کو اکٹھا کرنے کے دوران اسے صرف اتنا پتا چلا کہ جن لوگوں سے اس نے بات کی ہے انھوں نے شہزادی کی اس کہانی کو اپنے سیاسی اور اخلاقی دکھوں کی علامت بنا دیا ہے، فلسطینیوں کے لیے وہ ان کی طرح بے گھر اور اس تلاش میں تھی کہ اپنا اظہار کر سکے اور اپنی آزادی کو پا سکے، کچھ لبنانیوں کے لیے وہ عربوں کی اس باہمی کشمکش کی علامت تھی، جس نے لبنان کا امن وسکون تہ وبالا کر رکھا ہے، سعودی حکام کے نزدیک یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے جس میں کسی کو دخل دینے کی ضرورت نہیں، ان کا کہنا تھا کہ مغرب کے باشندوں کو اس معاملے میں صرف اس لیے دلچسپی ہے کیونکہ اس طرح سعودی حکومت کی بدنامی ہوتی ہے، اندر کے چند گنے چنے لوگوں کی رائے یہ بھی تھی کہ شہزادی جس المیے سے دوچار ہوئی وہ سعودی حکومت کی منافقت کا منھ بولتا ثبوت ہے اور شاہی خاندان نے اپنی بدعنوانی کو چھپانے کے لیے ''اسلام'' اور اسلامی سزاؤں کا استعمال کیا ہے، اس طرح بیان کی گئی فلم کی یہ کہانی اپنے طور پر کوئی نتیجہ نہیں نکالتی اور اس میں جس قدر وضاحتیں کی گئی ہیں، ان میں کچھ سچائی بھی ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی اس حقیقت سے پردہ نہیں اٹھاتی کہ صحیح معنوں میں ہوا کیا تھا۔

سعودی حکومت نے امریکا پر یہ واضح کر دیا تھا کہ وہ اس فلم کی نمائش کے خلاف ہے، اس سے دو ناخوشگوار نتائج برآمد ہوئے، ایک تو یہ کہ دفتر خارجہ کے وارن کرسٹوفر (Warren Christopher) نے کھلے عام سعودی ناراضگی سے پبلک براڈ کاسٹنگ سروس کو جسے پی بی ایس کہتے ہیں، کو آگاہ کر دیا، اس پر ایکسین (Exxon) نے معروف اخباروں میں اشتہارات شائع کرنے شروع کر دیے جن میں پی بی ایس سے کہا گیا تھا کہ وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرے، متعدد شہروں میں اس فلم کی نمائش منسوخ کر دی گئی اور فلم کی متنازعہ حیثیت کو سامنے رکھتے ہوئے پابندی کے اعلان کے بعد پی بی ایس نے ساٹھ منٹ کے ایک مباحثے کا بندوبست کیا، اس مباحثے میں میزبان کے علاوہ چھ شخصیات نے حصہ لیا، ان میں سے ایک عرب لیگ کا نمائندہ، دوسرا ہاورڈ میں قانون کا پروفیسر، تیسرا بوسٹن کے علاقے کا ایک مسلمان عالم دین تھا، چوتھا عرب معاملات'' کا ایک نوجوان امریکی ماہر تھا، یہاں میں یہ واضح کرتا چلوں کہ عرب معاملات کے ماہر کی یہ اصطلاح ایسے شخص کے لیے استعمال ہوتی ہے جس کا نہ تو کوئی ادبی اور نہ سرکاری مقام ہوتا ہے، اس مباحثے میں شرکت کرنے والی پانچویں شخصیت ایک نوجوان قانون دان کی تھی، جس کا مشرق وسطیٰ میں کاروبار بھی تھا اور وہ صحافت کا تجربہ بھی رکھتا تھا، چھٹی شخصیت ایک برطانوی صحافی کی تھی، جس نے بڑی ایمانداری کے ساتھ یہ بات جتادی تھی کہ

سعودی جو کچھ کر رہے ہیں وہ اسے پسند نہیں کرتا، ان چھ افراد نے مل کر ایک گھنٹے تک بڑی بے ربط گفتگو کی، مباحثے کے شرکا میں سے جو زیر بحث معاملے کے متعلق کچھ جانتے تھے ان کے ہاتھ سرکاری طور پر معذرت خواہانہ ''مسلم'' پالیسی نے باندھ رکھے تھے، جنھیں صورت حال کا بہت کم علم تھا، وہ اپنی اس پوزیشن کو چھپا نہیں سکتے تھے، چنانچہ ان حقائق سے ہٹ کر جو کہا اور سنا گیا وہ قطعی بے معنی تھا۔

اس فلم کو نہ دکھانے کے لیے جو دباؤ ڈالا گیا تھا اس پر امریکی آئین کی پہلی ترمیم کو سامنے لانا درست اقدام تھا اور میری رائے یہ ہے کہ اس فلم کو دکھانے میں کوئی حرج نہیں تھا، اس فلم کے بارے میں جو اہم باتیں بیان نہیں کی گئیں اور جنھیں میں سینما کی فنی حیثیت کے حساب سے عامیانہ تصور کرتا ہوں، وہ یہ تھیں کہ (الف) یہ فلم کسی مسلمان نے نہیں بنائی تھی، (ب) اس بات کا امکان موجود تھا کہ اور اگر یہ پہلی نہیں تو وہ واحد فلم تھی جس کا شمار ان انتہائی متاثر کن فلموں میں ضرور ہوتا ہے، جنھیں مغربی ناظرین مسلمانوں کے متعلق اس رنگ میں دیکھنا پسند کرتے ہیں جس رنگ میں یہ پیش کی گئی تھی، (ج) اس فلم پر ٹیلی وژن اور دوسری جگہوں پر جس قدر مباحثے ہوئے ان میں سے کسی میں بھی اس فلم کے موضوع، اس کی اثر انگیزی اور اس کی پیش کش کے انداز پر کوئی بات نہیں کی گئی، تھامس نے اس موضوع پر فلم بنائی ہی اس لیے تھی کہ اس میں بنی بنائی کشش موجود تھی، اگر مثال کے طور پر وہ یمن پر فلم بناتا تو اسے لوگوں کی ایسی دلچسپی میسر نہ آتی چنانچہ اس نے سیکس اور اسلامی سزا کا سہارا لے کر اس تصور کو ابھارا جو مسلمانوں کی بربریت کے حوالے سے مغرب میں موجود ہے، اسی لیے اس ڈرامائی دستاویز کو عام پذیرائی حاصل ہوئی، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اپریل 1980ء میں اکانومسٹ (Economist) لکھتا ہے کہ ''مغربی باشندوں کی اکثریت کے نزدیک اسلامی قوانین کا مطلب اسلامی سزا ہوتا ہے، اس فلم میں اسلامی قانون کے اسی سادہ تخیل کو اچھالنا مقصود تھا'' جب یہ بات عام ہوئی اور اسے عام کرنے میں ایکسین نے اہم کردار ادا کیا کہ سعودی حکومت اسے دکھانے کی راہ میں روڑے اٹکا رہی ہے تو اس پس منظر نے اس کے ناظرین کی تعداد میں مزید اضافہ کر دیا، ان سب باتوں نے مل کر اس بات کو نمایاں کیا، کہ شہزادی کی موت بلاشبہ ایک مسلم فلم نہیں ہے بلکہ ایک ایسی فلم ہے جس کے متعلق مسلمانوں کے پاس کہنے کو تو بہت کم تھا مگر جو وہ کہہ رہے تھے وہ بھی نہ تو قابلِ قبول تھا اور نہ اس نے کسی کو اپنے حق میں قائل کیا تھا۔

فلم بنانے والوں اور پی بی ایس کو اس بات کا ادراک ہونا چاہیے تھا کہ کسی بھی مسلمان کو یا تیسری دنیا سے تعلق رکھنے والے فرد کو اس سے قطعی کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس فلم میں کیا شامل کیا گیا ہے اور نہ انھیں اس فلم کے بنانے پر کوئی اعتراض ہو سکتا ہے، اعتراض کی گنجایش اس بات سے پیدا ہوتی ہے کہ اس میں ایسے

تصوراتی مناظر پیش کیے گئے ہیں جنھیں پیش کرنے کا حق صرف اسی سے حاصل کیا جا سکتا تھا جسے میں نے کہیں ثقافتی قوت کا نام دیا ہے، اس فلم کی ثقافتی قوت کون ہو سکتی تھی، یہ تو پتا نہیں چل سکا، البتہ فلم بنانے والے نے مغرب کی ثقافتی قوت کو استعمال کیا ہے، پھر اس معاملے میں یہ بات قطعی کوئی معنی نہیں رکھتی کہ سعودیوں کے پاس زیادہ دولت ہے، اگر دیکھا جائے تو خبریں بنانے، انھیں استعمال کرنے، انھیں تیار کرنے اور تقسیم کرنے کا کام اپنے اثرات کے اعتبار سے دولت کی بہ نسبت زیادہ طاقتور ہوتا ہے، کیونکہ خبر سرمائے سے بالاتر ایک ایسی چیز ہے، مغرب جسے بہت وقعت دیتا ہے، اس نظام کے خلاف دلائل دیتے ہوئے سعودی عرب کے افسروں نے یہ اعتراض اٹھایا تھا کہ اس فلم سے اسلام کی توہین ہوئی ہے، اس نکتہ اعتراض کو سامنے لاتے ہوئے سعودی حکومت نے اپنے اسلام کے محافظ کے اس خود ساختہ تصور کو اس لیے آگے بڑھایا تھا تاکہ مغرب کے نام نہاد موقف کی نفی ہو سکے، حالانکہ ایسا کرتے ہوئے اس نے اپنے نظام کے انتہائی کمزور پہلو کا سہارا لیا ہے۔

پی بی ایس نے جس مباحثے کا بندوبست کیا تھا، اس نے بھی مغرب کے معلوم نظام کو ہی فاتح قرار دیا، تاہم اس سے ایک طرف تو ٹیلی وژن نیٹ ورک کا یہ دعویٰ درست ثابت ہوا کہ اس نے سعودی ناراضگی کو دور کرنے کے لیے اس صورت حال کے تناظر میں ایک مباحثہ پیش کر دیا ہے، اور دوسری طرح پی بی ایس نے اس مباحثے کو کنٹرول میں رکھنے کے لیے اس بات کو یقینی بنایا کہ مختلف خیالات کو نسبتاً غیر معروف ''نمایندہ'' افراد کے ذریعے ایسا ''متوازن'' بنا دیا جائے کہ ان کی غیر مدلل اور پھسپھسی گفتگو، بڑی شدت اور کسی رکھ رکھاؤ کے بغیر کیے جانے والے تجزیوں کو بے اثر بنا دے، ایک مباحثے کا ہونا ہی ایک محتاط تجزیے کا متبادل ثابت ہوتا ہے، یہ اس واقعہ کی کامیابی کا ہی ثمر ہے کہ کسی نے اس فلم کی کہانی کے ریشومن سٹائل[1] (Rashomon Style) کے ڈھانچے اور مباحثے سے برآمد ہونے والے اس ''متوازن'' فیصلے پر کوئی تبصرہ نہیں کیا جو معاصر مسلم معاشرے کے متعلق اور گمراہ کن حد تک کھلا ہوا تھا، اس سارے منظر کا المیہ یہ ہے کہ ہمیں یہ پتا نہیں چل سکا کہ آخر شہزادی نے کیا کیا تھا یا شاید حقیقی معنوں میں کوئی یہ جاننا ہی نہیں چاہتا تھا کہ آخر شہزادی کا جرم کیا تھا، چنانچہ جس طرح مباحثہ کرنے والوں نے یہ فیصلہ صادر کیا تھا کہ ''فلم بُری تھی'' اور اس کے ساتھ یہ بھی کہا تھا کہ اس کے باوجود یہ بڑی دیانتدارانہ اور اچھی تھی ہم سب بھی اسی نتیجے پر مائل تھے، تاہم ''اس فلم اور اس مباحثے کے پس منظر میں یہ تسلیم نہ کی گئی بات عیاں تھی کہ اگر کوئی سعودی ایک ایسی فلم بناتے جو میسحیت، امریکا یا صدر کارٹر

1۔ ریشومن 1951ء میں اکیرا کوروساوا نے پیش کی تھی، اس فلم میں قتل کو موضوع بنایا گیا ہے، مگر یہ عام طرح کا قتل نہیں ہے بلکہ ایسا ہے کہ اس سے کئی کہانیاں نکلتی ہیں اور یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں کون سی سچی ہے، چنانچہ بعد میں ایسی تمام فلموں کو جو اس طرح کا گھماؤ پھراؤ پیدا کریں ریشومن کی طرح کی فلم کا نام دیا جانے لگا۔ (مترجم)

کے خلاف ہوتی تو اس کے جو نتائج برآمد ہوتے وہ فلم شہزادی کی موت سے کہیں زیادہ سنگین ہوتے۔

سعودی عرب جب اس فلم کی نمائش کو روکنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا تو اس نے ایک طرح سے اس واقعہ سے انکار کی پوزیشن اختیار کر لی تھی، حالانکہ وہ اس واقعہ سے انکار نہیں کر سکتا تھا، اس کے ساتھ ساتھ وہ اس صورت حال کے متعلق کوئی جوابی اسلامی موقف بھی پیش کرنے سے قاصر رہا، میں جس دہرے بندھن کا پہلے ذکر کر چکا ہوں اس نے اس فلم سے متعلق کئی اعتراضات کو غیر مؤثر بنا دیا تھا، دونوں میں سے کوئی بھی یہ بات کہہ سکتا تھا کہ نہیں یہ واقعہ ایسے نہیں ہوا یا یہ کہ یہ واقعہ اس طرح ہوا ہے، بشرطیکہ یہ بات کہنے کا کوئی مؤثر طریقہ ہوتا ہے اور کوئی جگہ ایسی ہوتی جہاں کھڑے ہو کر یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہی جا سکتی، سعودی عرب کے سرکاری ترجمان کے لیے اپنی بات کہنے کے لیے نہ تو کوئی موزوں جگہ تھی اور نہ ہی کوئی مناسب طریقہ دستیاب تھا، اس کے پاس صرف ایک ہی ترکیب تھی کہ وہ ثقافتی طور پر ایک نامعقول طریقہ اختیار کرتے ہوئے اس فلم کی نمائش کو مکمل طور پر رکوانے کی کوشش کرے، سعودی حکام نے اس سلسلہ میں نیم دلی کے ساتھ یہ جتانے کی کوشش کی کہ اسلام کے ''اچھے'' پہلو بھی ہیں، لیکن مباحثے میں اس دلیل کا کوئی اثر دکھائی نہیں دیا، اس سے بھی بدتر صورت یہ تھی کہ امریکا کا کوئی بھی حلقۂ انتخاب اتنا مضبوط نہیں تھا کہ وہ یہ نشاندہی کر سکے کہ یہ فلم نہ تو ایک آرٹ کی حیثیت میں اور نہ سیاسی طور پر کسی عظیم لمحے کو گرفت میں لینے کا پتا دیتی ہے۔ تاہم برطانیہ اور امریکا میں اس فلم کی نمائش کے مخالفین پر اس سے زیادہ حرف نہیں آیا کہ انھیں سعودی عرب کی مالی مفادات سے جڑے ہوئے چمچوں کے نام سے پکارا جانے لگا، 17 رمئی 1980ء کو جے بی کیلی نے نیوری پبلک میں کھل کر یہ بات کہہ بھی دی، اس صورت حال کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ فلم کے مخالفین کے پاس کوئی ایسا ذریعہ بھی نہیں تھا جس سے فلم کو تنقیدی انداز میں چیلنج کیا جا سکے، اگر مارسل اوفولس (Marcel Ophuls) کی ''انصاف کی یاد'' (The Memory of Justice) یا ''مکمل تباہی'' (Holo Caust) پر مباحثے کو لیا جائے یا لینی رِفینس ٹال (Leni Riefenstall) کی مختلف فلموں کی دوبارہ نمائش کو سامنے رکھا جائے تو ان کے مقابلے میں شہزادی کی موت پر اختلافی مباحثہ بڑا بے معنی اور فرسودہ معلوم ہونے لگتا ہے۔

شہزادی کی موت کی خبر سے بہت پہلے، امریکی میڈیا، اس پر چھائے ہوئے دانشور اور ثقافتی ماہرین مل کر اسلام اور عربوں کے خلاف فقرے بازی میں مصروف تھے، فلم کی نمائش سے صرف اتنا ہوا کہ انھیں کہنے کو کچھ اور میسر آ گیا، ورنہ توہین کا سلسلہ تو یوں بھی جاری تھا، اس سے پہلے دو دفعہ نیویارک شہر کے میئر نے براہ راست سعودی عرب کے بادشاہ کی اس وقت توہین کی تھی جب وہ نیویارک آئے، میئر نے نہ تو ان کا استقبال کیا اور نہ

مروت کے عام تقاضے ہی پورے کیے، توہین کا یہ سلسلہ یہیں تک محدود نہیں ہے، اس کے متعلق بڑی محنت کے ساتھ چھان بین کرنے کے بعد یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ امریکی ٹیلی وژن کا کوئی ایک بھی ایسا پرائم ٹائم شو نہیں ہے، جس میں نسلی امتیاز کی کہانیوں اور مسلمانوں کے متعلق توہین آمیز خاکوں کو شامل نہ کیا جاتا ہو، یہ تمام پروگرام واضح علامتی انداز میں پیش کیے جاتے ہیں چنانچہ ایک مسلمان یا اسلام کا جو تصور باندھا جاتا ہے، اس کا ان خاکوں کے ذریعے تمام مسلمانوں پر اطلاق کر دیا جاتا ہے، یہ سلسلہ یہیں تک نہیں ہے بلکہ ہائی سکول کی نصابی کتب، ناولوں، فلموں، اشتہاروں تک کو دیکھیے، ان میں بھی یہ ملیں گے ان کے مضامین کو دیکھ کر یہ سوچ ابھرتی ہے کہ ان سے اسلام کے متعلق کس قدر آگاہی ہو سکے گی، لوگ اسلام کے کتنے قریب ہوں گے؟ شیعہ اور سنی اسلام کے متعلق معلومات کتنے بڑے پیمانے پر پھیل سکیں؟ ان مضامین سے ان میں سے کوئی بھی بات ممکن نہیں ہوتی البتہ اسلام اور مسلمانوں کے متعلق ایک منفی تاثر ضرور پھیلتا ہے، آیئے اب ان علوم بشریات پر غور کریں جو امریکی یونیورسٹیوں میں پڑھائے جاتے ہیں، اگر تمام نہیں تو ان کے نصاب میں ''بشریات'' کے حوالے سے جو شاہکار شامل کیے گئے ہیں، ان میں ہومر (Homer) اور ایٹک ٹریجیڈن (Attic Tragedians) سے لے کر دوستو وسکی (Dostoevsky) اور ٹی ایس ایلیٹ (T.S. Eliot) تک، بائبل سے ہوتے ہوئے شیکسپیئر (Shakspeare)، دانتے (Dante) اور سروِنٹس (Cervantes) تک کو شامل کیا جاتا ہے، اس معلوم صورت حال میں سوال یہ اٹھتا ہے کہ نسلی گروہ کی بنیاد پر قائم ہونے والے اس نصاب میں عیسائی یورپ کے ساتھ ملحقہ اسلامی تہذیب کے ذکر کو کس طرح جوڑا جا سکتا ہے اس کا جواب وہ کتابیں نہیں جو حال ہی میں سامنے آتی ہیں اور جن کے سرورق پر ''جنگجو اسلام'' (Militant Islam) یا ''اسلام کا خنجر'' (The Dagger of Islam) یا ''آیت اللہ خمینی کی مین کیمف'' (Ayatollah Khomeini's Mein Kampf) جیسے عنوان درج ہیں، ان سے ہٹ کر، مغرب میں اسلامی تہذیب پر ایسا کوئی کام نہیں ہوا، جسے وسیع پیمانے پر پھیلایا گیا ہو یا جس کا حوالہ دیا جاتا ہو یا جس کی مانگ ہو؟ جس طرح ہم امریکا میں آبادی کے ایک طبقے کو برطانیہ نواز، فرانسیسی نواز کہہ کر پہچانتے ہیں، کیا ہم امریکا کے کسی علاقے کی آبادی کو اسلام دوست قرار دے سکتے ہیں؟ کچھ عرصہ پہلے تک تو یہ ممکن نہ تھا مگر اب صورت حال قدرے مختلف ہو گئی ہے، 1980ء کے اواخر میں مسلم تارکین وطن کی آمد میں اضافہ اور افریقی امریکیوں کا بڑے پیمانے پر اسلام قبول کرنا، اب حالات کو اس موڑ پر لے آیا ہے کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک انتخابی حلقے کے برابر امریکا میں مسلمانوں کی تعداد ہو گئی ہے، یاد رہے کہ اسلام قبول کرنے والوں میں لیوئس یوجین والکاٹ بھی شامل ہے جو افریقی امریکیوں کی ایک بھاری تعداد کا لیڈر سمجھا جاتا ہے اور جس کا اب اسلامی نام لیوئس فرخ خان ہے۔

جب شہزادی کا ہنگامہ ٹھنڈا پڑ گیا تو بدقسمتی سے سعودی اس وقت ناراضگی کا مظاہرہ کرنا بھول گئے جب امریکن سپیک ٹیٹر (American Spectator) میں ایرک ہافر (Eric Hoffer) کا ایک مضمون شائع ہوا جس کا عنوان تھا ''محمد'' (ﷺ) کی تن آسانی (Muhammad's Sloth)، ہافر نے اس کا ذیلی عنوان ''محمد (ﷺ) نہ چلنے والا پیغمبر (Muhammad Messenger of Plod) رکھا، اس مضمون پر احتجاج تو ایک طرف سعودیوں نے اس میں درج باتوں کو اسلام کا غلط تصور پیش کرنے کی فہرست میں بھی شامل نہیں کیا اور نہ یہ یاددہانی کرانے کی ضرورت محسوس کی کہ دنیا کے تین اسلامی ممالک پر امریکا کے اتحادیوں کا قبضہ ہے۔ ہاں جب سعودی عرب کے شاہی خاندان کی شہرت پر حرف آنے لگا تو سعودی حکومت نے جوابی کارروائی کی دھمکی دی، ان دونوں واقعات کو سامنے رکھ کر خود ہی فیصلہ کیجیے کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک معاملے میں تو اسلام مجروح ہوا اور دوسرے میں نہیں؟ پھر یہ سوال بھی اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ آج تک سعودیوں نے اسلام کے متعلق سوجھ بوجھ پیدا کرنے کی طرف کیوں بہت کم توجہ کی ہے؟ تعلیمی میدان میں ان کا حصہ صرف اسی قدر تو ہے کہ انھوں نے جنوبی کیلی فورنیا کی یونیورسٹی میں مشرق وسطیٰ پر اس تعلیمی پروگرام کو شروع کیا ہے جسے آرامکو (Aramco) کے سابق ملازم چلاتے ہیں۔

تاہم شہزادی کی موت کی داستان کا مکمل مضمون کہیں زیادہ پیچیدہ ہے، اسے یوں سمجھیے کہ تقریباً پانچ برسوں سے یا یوں کہیے کہ 1990-91ء میں خلیج فارس کے بحران اور جنگ سے بھی پہلے سے خلیج میں امریکا کی فوجی مداخلت موضوع بحث بنی ہوئی تھی، 1978ء کے اواخر میں جب سعودیوں نے قیام امن کے لیے کیمپ ڈیوڈ کے مذاکرات میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا تھا، تب سے ایسے مضامین باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہے تھے، جن میں سعودی حکومت کی غلطیوں اور کمزوریوں کی نشاندہی کی گئی تھی، ان مضامین میں سے کچھ تو ایسے ہوتے ہیں کہ جنھیں دیکھتے ہی یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ بڑے مستند انداز میں غلط معلومات عام کی جا رہی ہیں، اس سلسلے میں جولائی 1980ء میں یہ بات سامنے آ گئی تھی کہ ان کہانیوں میں سے کچھ کے پس پردہ سی آئی اے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ ان میں ''واشنگٹن کا انکشاف جو نقصان دہ ثابت ہوا'' (The Washington Leak That went wrong)، سی آئی اے کی غلطی سے سعودی عرب کو صدمہ (A CIA Gaff That Shocked Saudi Arabia): ڈیوڈ لیہ (David Leigh) کا یہ مضمون 30/جولائی 1980ء کو واشنگٹن پوسٹ میں شائع ہوا، یہاں یہ تذکرہ بھی ضروری ہے کہ نیویارک ریویو آف بکس نے اپنی اشاعت کے پہلے سولہ برسوں میں کم و بیش خلیج فارس پر بے شمار مضامین شائع کیے، ان تمام مضامین میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ سعودیوں کا حکمرانی کا موجودہ نظام بڑا

کمزور ہے، اسی دورانیے میں روزناموں نے بڑی باقاعدگی کے ساتھ اسلام کے تسلط، اس کی تعزیرات، فلسفۂ قانون اور خواتین کے بارے میں اسلامی تصور پر لکھنا شروع کر دیا تھا اور کسی نے بھی یہ نکتہ نہیں اٹھایا کہ اسرائیلی ربی بھی خواتین یا غیر یہودیوں، ذاتی صحت و صفائی اور تعزیرات کے متعلق ویسا ہی تصور رکھتے ہیں جیسا کہ اسلام میں پایا جاتا ہے، کسی نے یہ بھی نہیں کہا کہ لبنانی علمائے دین بھی اتنے ہی خون کے پیاسے اور دقیانوسی ہیں، جتنا کہ مسلمان علما کو ظاہر کیا جاتا ہے، سعودی عرب کی اسلامی حکومت پر توجہ خصوصیت کے ساتھ اس لیے مرکوز کی گئی کہ یہ حکومت قدرے غیر محفوظ اور مخصوص حالات کا شکار تھی لیکن یہ ارتکاز بھی اسے اس کیفیت میں سے نہ نکال سکا، اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ سعودی عرب نے چونکہ امریکا کا حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا، اس لیے اسے دیانتدار ''رپورٹنگ'' کا مزہ چکھایا جا رہا تھا اور مقصود یہ مطالبہ منوانا تھا کہ سعودی عرب سنسر شپ ختم کر دے، ستم ظریفی دیکھیے کہ کسی کو اس بات پر کوئی اعتراض نہیں تھا کہ اسرائیل سے جو خبر باہر آتی ہے، اسے فوجی سنسر شپ سے گزرنا پڑتا ہے، اسی طرف اس بات پر بھی بڑے غم و غصے کا اظہار کیا گیا کہ سعودی عرب میں پریس کی آزادی مفقود ہے، مگر اس طرف کوئی دھیان نہیں دیا گیا کہ مغربی کنارے کے عرب اخباروں، سکولوں اور یونیورسٹیوں پر اسرائیل نے کیا قوانین لاگو کر رکھے ہیں؟ اس مخصوص صورت حال میں سعودی عرب اچانک ایک انوکھی چیز بن گیا آزاد خیال اور صیہونی قوتوں نے اس کے خلاف محاذ بنا لیا اور ہم آواز ہو کر نکتہ چینی کرنا شروع کر دی، دوسری طرف سرمایہ دار اور اعلیٰ سرکاری شخصیات اس کی ناز برداری کرنے اور تعریفوں کے پل باندھنے میں لگ گئے، اس سے سعودی عرب کی حیثیت مزید کم ہو گئی، اسے پہلے سے زیادہ ناقابل قبول اور دانش و تدبر کے لحاظ سے کم تر سمجھا جانے لگا، اس میں کوئی شک نہیں کہ کئی اعتبار سے سعودی عرب دانش و تدبر کے معاملے میں کمزور ہے، مگر اس اعتبار سے یہ بڑا مضبوط ہے کہ اسے ''اسلامی دنیا کی علامت'' کے طور پر پہچانا جاتا ہے۔

ان سب باتوں کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ جب شہزادی کی فلم کا واقعہ پیش آیا تو ''ہم'' نے ان کی منافقت اور بدعنوانی کی بہت بلند آواز میں مذمت کی جس کے جواب میں ''انھوں'' نے ہماری طاقت اور بے حسی پر افسوس کا اظہار کیا، یہ تصادم آگے چل کر ''ہمارے'' اور ''ان کے'' درمیان مباحثے کی شکل اختیار کر گیا لیکن حقیقی معنوں میں نہ تو گفتگو ہوئی نہ تجزیہ اور نہ تبادلۂ خیال ہی ممکن ہو۔۔ تاہم اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سخت گیر بلاک جو خود کو ''مغربی تہذیب'' کا نمائندہ کہتا ہے، اس کے ساتھ متاہوں میں مسلسل ناکامی سے مسلمانوں کا ذاتی تشخص بالآخر مضبوط ہونے لگا، اسے محسوس کرتے ہوئے مغربی لیڈروں نے قدامت پرستانہ مذہبی جنون اور ظلم و جبر کو

برا بھلا کہنا شروع کر دیا، چنانچہ ہر مسلمان کا اسلامی شناخت اختیار کرنا آفاقی قوانین سے انحراف سمجھا جانے لگا، مگر ایسا کرنا مسلمانوں کے لیے ان کی بقا کی ضرورت بن گیا، اس صورت حال کا انتہائی منطقی نتیجہ جنگ کو قرار دیا گیا، اور یوں ہنٹنگٹن کا تہذیبوں کے تصادم کا تصور وجود میں آیا۔

شہزادی کی موت کی طرح کی ایک اور اسلامی فلم 1995ء میں سامنے آئی، اس کا نام ''امریکا میں جہاد'' تھا اور شہزادی کی موت کے پندرہ سال بعد پی بی ایس نے اسے نمائش کے لیے پیش کیا تھا، جہاں پہلی دستاویزی فلم بڑی لبھانے والی اور اسلام سے ہٹا ہوا نکتہ نظر پیش کر رہی تھی، وہاں دوسری فلم میں اس بات کا بندوبست کیا گیا تھا کہ یہ بات دماغوں میں بیٹھ جائے کہ امریکا میدان جنگ بن چکا ہے، ہر طرح کے پاگل مسلمان امریکا میں رہتے ہوئے، نہ صرف دہشت گردی میں ملوث ہیں بلکہ ایک بھیانک جنگ کی سازشیں بھی کر رہے ہیں، ''امریکا میں جہاد'' نامی فلم کو سٹیون ایمرسن (Steven Emerson) نے بنایا تھا اور اگر اس کی شخصیت کا جائزہ لیا جائے تو مشرق وسطیٰ کی سیاست، تاریخ، ثقافت یا مذہب سے اس کا کوئی تعلق دکھائی نہیں دیتا، اور اس فلم کے شروع میں بڑے فخر کے ساتھ اس کا تعارف یوں پیش کیا گیا تھا کہ وہ اسلامی دہشت گردی کی رپورٹنگ کرتا رہا ہے، یہ کوئی ایسا تعارف نہیں ہے جو اسے ایک ایسی فلم بنانے کا اہل ثابت کر دے، تاہم اس کا شمار اس طبقے میں کیا جا سکتا ہے جو پچھلے ایک عشرے کے دوران وجود میں آیا ہے اور جس میں ایسے مشکوک ماہرین شامل ہیں جن کی ہر بات ان لوگوں کے دلوں میں اتر جاتی ہے جو مضطرب ہیں اور جن کا اضطراب سمجھ میں آتا ہے، ...... ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر بموں سے حملہ ایک ڈراؤنا واقعہ تھا اور یقیناً یہ جرم مٹھی بھر انتہا پسند مسلمانوں سے سرزد ہوا ہے، اگرچہ ایمرسن نے براہ راست ان کے لیڈر شیخ عمر عبدالرحمٰن کے ساتھ اپنی فلم کے واقعات کا سلسلہ نہیں جوڑا مگر اشارتاً یہ بات اس فلم میں موجود ہے، شیخ عمر عبدالرحمٰن کوئی غیر معروف شخصیت نہیں ہیں، ان کا شمار ان نامور مجاہدین میں ہوتا ہے جنھیں امریکا نے ایک طے شدہ پالیسی کے تحت افغانستان بھیجا تھا اور ان کے ذمے یہ کام لگایا تھا کہ وہ افغانستان میں ایسے انتہا پسندوں کو تیار کریں، جو دہشت گردی کے خلاف جنگ کے حوالے سے سوویت یونین کا مقابلہ کر سکیں اور اس عمل سے گزرتے ہوئے خود دہشت گردی کے ماہر بن جائیں، اسلامی خطرے اور اس سے جڑی ہوئی دوسری باتوں نے شیخ عمر عبدالرحمٰن کو سنسنی خیز میڈیا میں بڑی آسانی کے ساتھ ایک جانا پہچانا نام بنا دیا تھا، اگرچہ ''امریکا میں جہاد'' میں ایک ذمہ دارانہ طرز عمل اور اسلام کے متعلق گفتگو میں بڑا محتاط رویہ اختیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور فلم میں اس طرح کے بیانات کے باوجود کہ مسلمانوں کی اکثریت بھی ہماری طرح امن پسند ہے، اس فلم کا بنیادی مقصد ان جذبات کو ابھارنا ہے کہ اسلام

باب دوم

ایران کی کہانی

باب دوم

مقدس جنگ

(حصہ اوّل)

ایران کے متعلق امریکیوں کے جذبات بدستور بھڑکے ہوئے ہیں، جذبات کی اس برہمی کا تعلق 4 رنومبر 1979ء کے اس واقعہ سے ضرور ہے، جس میں ایرانی طلبہ نے تہران کے سفارت خانے پر غیر قانونی قبضہ کرلیا تھا اور جس نے امریکیوں پر توہین کا گہرا تاثر چھوڑا تھا، مگر بات یہیں تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کے نتیجے میں میڈیا نے جس طرح اس واقعہ کی تفاصیل پیش کیں، جس طرح گہری توجہ مرکوز رکھی اور بعد کے کئی برسوں تک جس طرح ایران کو ایک شیطانی قوت بنا کر پیش کرتا رہا، اس نے امریکیوں کے جذبات کو سرد نہیں ہونے دیا، اس میں کوئی شک نہیں کہ اس بات کا علم ہونا کہ امریکی سفارت کار پکڑ لیے گئے ہیں اور امریکا اس سلسلے میں بظاہر کچھ کرنے سے قاصر ہے، اپنی جگہ ایک الگ طرح کا اثر مرتب کرتا ہے اور جب ٹیلی وژن کے پرائم ٹائم شو میں ہر رات بلا ناغہ اس واقعہ کو دیکھنا پڑتا ہے تو اس سے ایک اور طرح کا جذباتی تلاطم پیدا ہوتا ہے، مگر میں سمجھتا ہوں کہ برس ہا برس گزر جانے کے بعد اب ہم اس مقام پر آ گئے ہیں کہ اس واقعہ کا جس کا نام ''ایران کی کہانی'' میں رکھا گیا تھا اس کے ہم مطالب و معنی کا ایک تنقیدی جائزہ لیں اور عقلی دلائل سے اور غیر جذباتی انداز میں امریکیوں کے شعور میں اس کی موجودگی کو سمجھ سکیں، اس جائزے کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ امریکی ایران کے متعلق جو کچھ جانتے ہیں اس کا تقریباً نوے فی صد انھوں نے ریڈیو، ٹیلی وژن اور اخبارات سے حاصل کیا ہے۔ اس میں کچھ کلام نہیں کہ امریکیوں کو یرغمال بنا لیے جانے والے واقعہ سے انھیں جو دکھ پہنچا ہے اور اس کے جو غیض و غضب بھڑکا ہے اس کا کوئی مداوا نہیں کیا جاسکتا اور نہ اس واقعہ سے اسلامی دنیا میں پیدا ہونے والے ابہام کا ہی کچھ علاج ممکن ہے، لیکن میرے نزدیک ہمیں اس بات پر خوشی کا اظہار کرنا چاہیے کہ اس واقعہ کے دوران ایک [1] موقع کے سوا، امریکا نے ایران کے خلاف فوجی طاقت استعمال

1۔ 24 راپریل 1980ء کو امریکا نے یرغمالیوں کو رہائی دلانے کے لیے کارروائی کی، اس میں آٹھ ہیلی کاپٹروں نے حصہ لیا، ان کے ذریعے امریکی فوجیوں کو اس مقام تک پہنچانا تھا جہاں یرغمالیوں کو رکھا گیا تھا، انھیں یہاں سے ایک سی 130 طیارے میں پہنچا کر واپس لے جانا تھا، مگر ہوا یہ کہ دو ہیلی کاپٹر آندھی میں پھنس کر تباہ ہو گئے، ایک فنی خرابی کا شکار ہو گیا، ایک ہیلی کاپٹر بے قابو ہو کر سی 130 سے جا ٹکرایا اور یہ دونوں بھی جل گئے، اوپر تلے کے ان حادثات میں آٹھ امریکی فوجی، فضائی عملے کے پانچ ارکان اور تین پائلٹ ہلاک ہوئے، چنانچہ یہ منصوبہ ترک کر دیا گیا۔ (مترجم)

نہیں کی، چنانچہ ہمیں اپنی بات کا آغاز اس جائزے سے کرنا چاہیے کہ امریکا اور مغرب کے اسلامی دنیا کے ساتھ جو تعلقات تھے، ان کی روشنی میں ایران امریکا کے لیے کیا تھا اور جب یہ واقعہ پیش آیا تو اس وقت ایران کو کس نظر سے دیکھا گیا پھر اس کا احاطہ کرنا بھی ضروری بنتا ہے کہ امریکی میڈیا نے کس طرح ہر روز بلا ناغہ اس واقعہ کو بار بار پیش کیا۔

سفارتخانے پر قبضے کے فوراً بعد امریکا کے تمام ٹیلی وژن چینلوں پر رات کی خبروں کا زیادہ تر حصہ ایران کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا، اے بی سی کئی ماہ تک روزانہ رات گئے تک امریکی یرغمالیوں کے سلسلے میں خاص پروگرام پیش کرتا رہا اور پی بی ایس کی میک نیل، لہرر رپورٹ نے تو اسی بحران سے متعلق اتنے زیادہ پروگرام پیش کیے کہ ان کی مثال نہیں ملتی، کئی ماہ تک والٹر کرون کائٹ اپنے پروگرام ''تو ہوایوں'' میں یہ یاد دلاتا رہا کہ امریکیوں کو کتنے دنوں تک یرغمال بنائے رکھا گیا وہ اپنی بات اس فقرے سے شروع کرتا تھا کہ ''دو سو سات دن'' پھر آگے کی کہتا تھا، ٹیڈ کوپل (Ted Koppel) نے یرغمالیوں کے بحران کے سلسلے میں اے بی سی پر پروگرام نائیٹ لائن (Night Line) شروع کیا تھا، اس پروگرام کو اس بحران کی وجہ سے کامیابی ملی اور یہ اسی کی بدولت دیر تک جاری رہ سکا، دفتر خارجہ کے ترجمان ہوڈنگ کارٹر (Hodding Carter) نے اس بحران کے نتیجے میں صرف دو ہفتوں کے اندر اندر ہی فلمی ستاروں جیسا مقام حاصل کر لیا، دوسری طرف نہ تو سیکرٹری سائرس وینس (Cyrus Vance) اور نہ زبگنیف برزنسکی (Zbigniew Brzezinski) ہی اس وقت تک سامنے آئے جب تک کہ اپریل 1980ء کے اواخر میں یرغمالیوں کو رہائی دلانے کی کوششیں ترک نہیں کر دی گئیں، اس دوران میڈیا پر ابوالحسن، بنی صدر، صادق قطب زادہ اور یرغمالیوں کے والدین کے انٹرویو، ایرانیوں کے مظاہروں کے ساتھ ادل بدل کے دکھائے جاتے رہے، تین منٹ تک اسلامی تاریخ کے اسباق بھی پیش کیے جاتے تھے، سابق شاہ کی صحت کے متعلق ہسپتال سے بلیٹن بھی جاری ہوتا اور، سنجیدہ چہروں والے مبصرین اور ماہرین صورت حال کا تجزیہ کرتے، غور و فکر فرماتے، مباحثہ کرتے، پرجوش تقریروں میں الجھتے اور آنے والے حالات کے متعلق اپنے اپنے دلائل دیتے ہوئے یہ بتاتے تھے کہ آئندہ کیا طرز عمل اختیار کرنا ہوگا، یہ مفروضہ سامنے لاتے تھے کہ آنے والے دنوں میں حالات کس رخ پر آگے بڑھیں گے، میڈیا کے ان پروگراموں میں نفسیات، سوویت اقدامات اور مسلمانوں کا ردعمل تک زیر بحث آیا، لیکن ان سب سے کوئی فرق نہیں پڑا، وہ پچاس امریکی جو قید میں تھے بدستور قیدی رہے۔

اس تمام عرصے میں یہ بات ظاہر ہوگئی کہ ایرانی جس بات کو اپنے حق میں بہتر تصور کرتے ہیں اس

کے مطابق امریکی میڈیا کو استعمال کر رہے ہیں اور امریکی میڈیا استعمال ہو رہا ہے، سفارتخانے میں موجود ایرانی طلبہ اکثر اوقات ''واقعات'' کی ترتیب اس طرح سے بناتے تھے کہ سیٹلائٹ کے بند ہونے کا وقت جب قریب ہوتا اور امریکا میں رات کی خبریں شروع ہونے والی ہوتیں، تو وہ پھلجھڑی چھوڑ دیتے، اس دوران میں ایرانی حکام نے وقتاً فوقتاً یہ اظہار بھی کیا کہ ان کا منصوبہ یہ ہے کہ امریکی عوام کو امریکی حکومت اور اس کی پالیسیوں کا مخالف بنا دیا جائے، ان کا یہ سوچنا کہ کیا ایسا ہو جائے گا، شروع سے ہی غلط تھا، بعد میں اس پالیسی پر بہت برے تو نہیں مگر کچھ خاص نوعیت کے اثرات ضرور مرتب ہوئے، جنھوں نے امریکی میڈیا کو یہ ترغیب دی کہ وہ زیادہ کھرا تحقیقی طرز عمل اختیار کرے، لیکن میں یہاں جس بات کو زیر بحث لانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ انتہائی کشیدہ بحرانی دور میں امریکیوں کو ایران کیسا نظر آیا، جہاں تک اس کہانی کا دوسرا رخ ہے اس کو ہمیں امریکی نکتہ نظر کے تابع رکھنا ہوگا۔

جیسا کہ میں نے باب اول میں بھی ذکر کیا ہے کہ پچھلے عشرے کے دوران جو بڑی ڈرامائی خبریں سنائی دی ہیں ان میں صرف ایران ہی کی خبریں شامل نہیں ہیں بلکہ عرب اسرائیل تنازع، تیل اور افغانستان، بھی ''اسلام'' سے متعلق خبروں میں شمار ہوتے ہیں، تاہم ان سے زیادہ ایران پر توجہ مرکوز رہی اور طویل ایرانی بحران کے دوران ایک تسلسل کے ساتھ امریکیوں کو ایک خطے کے لوگ، ایک ثقافت، ایک مذہب کے متعلق اطلاعات فراہم کی جاتی رہیں اگرچہ یہ اطلاعات اپنی جگہ بڑی ناقص تھیں لیکن اس سے بھی بڑھ کر یہ ہوا کہ انھیں صحیح طور پر سمجھا بھی نہیں گیا، یہ بات اس عمل کے دوران اتنی واضح اور نمایاں ہوگئی تھی کہ کہیں بھی، کبھی بھی اس سے پہلے اس طرح نمایاں نظر نہیں آئی تھیں، ان خبروں کا خاصہ یہ تھا کہ ان میں ایران کو ہمیشہ عسکریت پسند، خطرناک اور امریکا دشمن بنا کر پیش کیا گیا۔

ایرانی بحران اس اعتبار سے امریکی میڈیا کی کارکردگی کو جانچنے میں بڑا سودمند ثابت ہوا کہ کس بات نے امریکیوں کی اکثریت کے لیے اس بحران کو اذیت ناک بنا دیا تھا، دراصل اس بحران کے دورانیے اور اس بات نے اسے اذیت ناک بنا دیا کہ زمانے میں ایک ایران مسلم دنیا کے ساتھ امریکا کے تعلقات کی مثال بنا رہا تھا، تاہم میرا خیال ہے کہ ہمیں بڑے محتاط انداز میں دو تین ماہ کے اس ابتدائی دور کا جائزہ لینا چاہیے کہ اس دوران میڈیا کے رویے میں کیا چیز ابھر کے سامنے آتی ہے اور یہ جانتے ہوئے کہ اس واقعہ کے بعد سے، مغرب کو نئے بحرانوں، نئی سیاسی تبدیلیوں اور چیلنجوں کا سامنا ہوگا، میڈیا نے خبروں کو اس انداز میں کیوں پیش کیا، کیا اس کا مدعا اپنے اس رویے کو دوام بخشنا تھا، وقت گزرنے کے ساتھ میڈیا کی رپورٹنگ کے انداز میں

تبدیلی آئی ہے اور واقعہ کے ابتدا میں ان کا جو طرزِ عمل تھا اس میں کسی قدر بہتری پیدا ہوئی ہے۔

تہران کے امریکی سفارت خانے پر قبضے سے متعلق بے پناہ مواد جمع ہو گیا ہے، اس کی اگر چھان بین کی جائے تو بہت سی باتیں سامنے آئیں گی، سب سے پہلے تو یہ معلوم ہوگا کہ صرف ''ہم'' امریکی ہی نہیں بلکہ ہمارے ساتھ ساتھ چیزوں کا جمہوری، دانشمندانہ اور معمول کا نظام بھی داؤ پر لگا ہوا ہے، اندر کی اور باہر کی کیفیت یہ ہے کہ ''اسلام'' بڑے اشتعال انگیز دور سے گزر رہا ہے اور پریشان کر دینے والا جنونی ایران اس وقت اس کا نمائندہ بنا ہوا ہے، ٹائمز نے اپنی 26 نومبر کی اشاعت میں ایرانی اہلِ تشیع کے اسلام پر جو کھٹے میں ایک مضمون شائع کیا ہے، جس کی سرخی ''نظریۂ شہادت'' (An Ideology of Martyrdom) لگائی ہے، یوں معلوم ہوتا ہے کہ نیوز ویک نے اسی سوچ کی نقل کرتے ہوئے اسی تاریخ کے اپنے شمارے میں ''ایران میں شہادت کا رجحان'' (Iran's Martyr Complex) پر فیچر شائع کر دیا ہے۔

7 / نومبر کو سینٹ لوئس پوسٹ ڈسپیچ (St. Louis Past Despatch) نے ایک ورکشاپ کی تفصیل شائع کی ہے جو ایران اور خلیج فارس کے متعلق سینٹ لوئس میں ہوئی تھی، اس رپورٹ میں ایک ماہر کے خیالات یوں درج کیے گئے ہیں کہ ''ایران کا ایک اسلامی طرزِ حکومت میں ڈھل جانا امریکا کے لیے حالیہ دور میں بہت بڑا نقصان ہے''۔ یہ فقرہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ امریکی مفادات کا واحد دشمن اسلام ہے، وال سٹریٹ جرنل (Wall Street Journal) نے اپنی 20 / نومبر کی اشاعت میں یہ اداریہ لکھا ہے کہ ''تہذیبوں کا زوال'' دراصل اس ''مغربی قوت'' کے زوال کی وجہ سے آیا ہے، جس نے شروع میں ہی یہ مہذب خیالات پھیلائے تھے''۔ اس بیان سے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے دنیا کی آبادی کی اکثریت نے جس میں اسلامی دنیا کی آبادی بھی شامل ہے، اگر خود کو مغرب کے سانچے میں نہ ڈھالا تو مہذب سوچ نہ رکھنا ان کا مقدر بن جائے گا اور کولمبیا یونیورسٹی کے پروفیسر جے سی ہرویٹز (J.C. Hurewitz) کو لیجیے جب 21 / نومبر کو ایک پروگرام میں اے بی سی کے رپورٹر نے ان سے پوچھا کہ کیا شیعہ مسلمان ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ یقیناً ''امریکا کا دشمن'' ہوگا؟ تو انھوں نے اس کے جواب میں واضح انداز میں کہا ہاں۔

امریکا میں ٹیلی وژن کے تمام بڑے بڑے مبصرین باقاعدگی کے ساتھ اس بات پر زور دیتے رہے ہیں کہ ''مسلمان اس ملک سے نفرت کرتے ہیں'' ان میں سی بی ایس کے والٹر کرون کائیٹ اور اے بی سی کے فرینک رینالڈ (Frank Reynolds) زیادہ نمایاں ہیں اور جب یہ اپنی گفتگو میں شاعرانہ انداز اختیار کر لیتے ہیں تو یوں کہتے ہیں کہ ''بحرانوں کا ہلال'' ایک طوفان کی طرح سرسبز و شاداب علاقوں کی طرف بڑھ رہا ہے''۔ یہ

فقرہ 21 / نومبر کو رینالڈ نے اے بی سی پر ادا کیا، پھر سات دسمبر کو جب ایک ایسا مجمع دکھایا جا رہا تھا جو ''اللہ اکبر'' کے نعرے لگا رہا تھا تو رینالڈ کی آواز ابھری اور اس نے اپنے اس مفروضے کو پیش کیا کہ اس مجمع کا ایسا کرنے کا مقصد یہ اظہار کرنا ہے کہ وہ ''امریکا سے نفرت'' کرتے ہیں، کچھ آگے چل کر اس نے اسی پروگرام میں ناظرین کو بتایا کہ (حضرت) محمد (ﷺ) ایک خود ساختہ پیغمبر تھے (نعوذ باللہ)، رینالڈ کو یہاں شاید یہ بات یاد نہیں رہی کہ یہ الزام تو ہر ایک پیامبر پر عائد کیا جا سکتا ہے جس نے نبوت کا دعویٰ کیا، (حضرت) محمد (ﷺ) پر یہ الزام عائد کرنے کے بعد اس نے ناظرین کو بتایا کہ ''آیت اللہ'' بیسویں صدی کا ایک ''خود اختیار کردہ لقب'' ہے جس کے معنی اللہ کا پرتو'' ہیں، بدقسمتی سے ان دونوں میں سے کوئی بات بھی درست نہیں ہے، اے بی سی نے اسلام پر اپنے تین منٹ کے کورس کا اہتمام اس طرح کیا تھا کہ سکرین پر ایک تصویر ابھرتی تھی، جس کے دائیں جانب مختصر عنوان یہ ناخوشگوار کہانی بیان کرتے تھے کہ ''اسلام'' کا جواب کس طرح مخالفت کے ذریعے، شک و شبہ کی زبان میں اور نفرت سے دینا موزوں، مناسب بنتا ہے، ان عنوانوں کے تحت محمڈن ازم، مکہ، پردہ، چادر، سنی، ملا، آیت اللہ خمینی اور ایران کا ذکر ہوتا تھا اور جب بات شیعہ کی آتی تو اس کے ساتھ ہی تصویر میں ایسے نوجوان دکھائے جاتے جو ماتم کرتے ہوئے خود کو پیٹ رہے ہوتے تھے، ان تصویروں کے فوری بعد پروگرام میں جینس ولا (Janesville)، وسکونسن (Wisconsin) ابھر آتے اور ان کے سکولوں کے صحت مند بچے، نہ تو پردے میں دکھائی دیتے نہ وہ سینہ کوبی کرتے نظر آتے اور نہ ان میں کوئی مولوی ملتا، بلکہ یہ سب وطن کی محبت میں ''یومِ اتحاد'' کی تیاریاں کرتے ہوئے دکھائی دیتے۔

نیویارک ٹائمز نے 6 / جنوری 1980ء کو اپنے سنڈے میگزین میں ایک مضمون ''عسکریت پسند اسلام: ایک تاریخی گرد باد'' (Militant Islam : The Historic Whirlwind) شائع کیا۔ جبکہ دی نیو ری پبلک کی 8 / دسمبر کی اشاعت میں مائیکل والزر کا مضمون ''اسلامی دھاکا'' (The Islam Explosion) شائع ہوا، دوسرے مضامین کی طرح ان دونوں مضامین میں بھی نہ صرف یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام میں کبھی تبدیلی نہیں آ سکتی، اس کی تاریخ، جغرافیہ، سماجی ڈھانچا اور ان چالیس مسلم اقوام کی ثقافت، جن کی آبادی ایشیا، یورپ اور شمالی امریکا میں اسی کروڑ بنتی ہے اور ان میں سوویت یونین اور چین میں رہنے والے مزید کروڑوں مسلمان بھی آتے ہیں، اور یہ سب ہی ایک لگے بندھے راستے پر چلتے ہیں، ان مضامین کا مقصد یہ بھی واضح کرنا تھا کہ جہاں کہیں بھی قتل ہوگا، جنگ ہوگی، ایسے جھگڑے ہوں گے جن میں خاص قسم کی دہشت شامل ہے تو ''اس میں اسلام کا ہاتھ یقیناً نظر آئے گا'' یہ بات والزر نے اپنے مضمون میں کھل کر لکھی ہے، ان

دونوں کے نزدیک یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ ثبوت کے بغیر یہ دلیل بے معنی ہوگی ہے، پھر انٔ دونوں کے متعلق یہ بات بھی بڑی واضح ہے کہ ان میں سے کوئی بھی نہ توان زبانوں اور نہ ان معاشروں سے واقف ہے جن کے متعلق وہ فیصلہ صادر کر رہا ہے، انھوں نے تو اسلام کو زیر بحث لاتے ہوئے عام فہم وفراست سے بھی کام نہیں لیا ہے، اسی طرح جب دی نیوری پبلک نے اپنے اداریے میں بڑے عالمانہ انداز میں ''اسلام کے مقدس قوانین'' جنھیں شریعت کہتے ہیں کو اپنی دلیل بنایا ہے۔ اور جاسوسی، اچھے چال چلن اور دوسری چیزوں کے متعلق ان کے ذریعے وضاحت کرنے کی کوشش کی پھر اسی ضمن میں ایران پر یہ فقرہ چست کر ڈالا کہ ''یہ ناکام مذہبی جذبات سے اٹھنے والا غیض وغضب ہے'' تو اس سے نیوری پبلک کے کسی اعلیٰ علمی مقام کا یقین نہیں ہوگیا بلکہ یہ سب کم عقلی کی باتیں معلوم ہوئیں، نیوری پبلک کا اس تمام گفتگو سے مقصد صرف قاری کو اس موڑ پر لانا تھا کہ اگر اسلام ہمارے خلاف جنگ کر رہا ہے تو ہمیں بھی آنکھیں کھول کر اس جنگ میں کود پڑنا چاہیے۔

نیوری پبلک نے اس معاملے میں جس طرح ''اسلام'' کو ملوث کیا وہ کچھ زیادہ اچھا نہیں تھا، اس بات کو آگے بڑھانے کے اس سے بھی بہتر طریقے ہو سکتے تھے، ایک مناسب طریقہ تو یہ تھا کہ کسی ماہر کو عوام کے سامنے لایا جاتا اور اس سے یہ بات کہلوائی جاتی کہ (امام) خمینی حقیقی معنوں میں ''مسلم علمائے دین کے نمایندے نہیں ہیں'' میں نے یہ الفاظ ایل ڈین براؤن (L..Dean Brown) سے لیے ہیں اور اس نے یہ بات میک نیل، لہرر رپورٹ میں 16 رنومبر کو کہی تھی، براؤن اردن میں امریکا کا سفیر اور لبنان میں خصوصی ایلچی رہ چکا ہے اور وہ مڈل ایسٹ انسٹی ٹیوٹ کا صدر بھی رہا ہے، براؤن نے ہی یہ بات کہی تھی کہ اس ''فولاد پوش'' ملا کا تعلق اسلام کے ابتدائی دور سے ہے یہ وہی براؤن ہے جسے تہران کے ہجوم کو دیکھ کر نیرم برگ یاد آ گیا تھا اور اس نے کہا تھا کہ گلیوں میں ہونے والے مظاہرے ''اس سرکس کی علامت تھے جو تفریح کے لیے'' حسب روایت آمر کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں۔

دوسرا طریقہ یہ ہوسکتا تھا کہ یہ بات عام کی جاتی کہ کچھ نظر نہ آنے والے خطوط نے مشرق وسطیٰ کے کئی دوسرے پہلوؤں کو بھی ایرانی اسلام کے ساتھ منسلک کر دیا ہے، اس لیے ان سب کو حالات کے تقاضوں کے مطابق ظاہری طور پر اور تیزی کے ساتھ واصل جہنم کر دیا جائے، جب سابق سینٹر جیمز ابورزاق (James Abourezk) تہران گیا تو اس کا اعلان اے بی سی اور سی بی ایس پر کرتے ہوئے اس بات کو خاص طور پر بتایا گیا کہ ابورزاق ''لبنانی نژاد'' ہیں، یہ اس لیے عجیب بات تھی کہ جب جارج ہین سن (George Hansen) ایک

نمایندے کی حیثیت سے ایران پہنچا، تو ڈنمارک کے ساتھ ان کے تعلق کا کوئی ذکر نہ کیا گیا تھا، اس طرح جب ریمسی کلارک (Ramsey Clark) کو بھیجا گیا، تو یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی کہ اس کے آباواجداد کا تعلق اس سفید فام اینگلوسیکسن پروٹسٹنٹ فرقے سے رہا ہے جسے ویسپ (Wasp) کہتے ہیں، ایسے میں ابورزاق کے ماضی میں اسلامی رنگ کی جھلک کو سامنے لانے کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی، یہ بات اس لیے بھی کچھ عجیب لگتی ہے کہ ابورزاق کا تعلق لبنان کے مسیحی طبقے سے تھا اور وہ مسلمان نہیں تھا، اس لیے گمان ہوتا ہے کہ کہیں اس کا تعلق ایبسکم کیس[1] (Abscam Case) کے جعلی ''شیخ'' سے تو نہیں بنتا۔

اس ساری صورت حال میں دوسروں کا ملوث کرنے کا سب سے شاندار طریقہ اٹلانٹا کانسٹی ٹیوشن نے اپنی 8 رنومبر کی اشاعت میں اختیار کیا، اس دن کے اخبار کے صفحہ اول پر ڈینیل بی ڈروز (Daniel B. Drooz) کا مضمون شائع ہوا ہے جس میں الزام لگایا گیا ہے کہ سفارت خانے پر قبضے کے پیچھے فلسطین کی تنظیم آزادی یعنی پی ایل او کا ہاتھ ہے، اس نے اپنے مضمون میں یہ بات بھی واضح کر دی کہ اسے اس بات کا علم ''سفارتی اور جاسوسی کے یورپی حکام'' سے ہوا ہے۔ اس کی ہی طرح جارج بال (George Ball) واشنگٹن پوسٹ کی 9 ردسمبر کی اشاعت میں یہ دور کی کوڑی لایا کہ ''اس بات پر یقین کرنے کی بڑی ٹھوس وجوہ ہیں کہ یہ ساری کارروائی انتہائی تربیت یافتہ مارکسسٹ کر رہے ہیں'' اس سلسلے کا ایک اور واقعہ 10 ردسمبر کو یوں پیش آیا کہ این بی سی نے اپنے پروگرام ٹوڈے شو میں ایموس پرلی میوٹر (Amos Perlemutter) اور حسی کارمل (Hasi Carmel) کا انٹرویو نشر کیا اور پروگرام کے شروع میں ان دونوں کا تعارف یوں کرایا کہ یہ ''امریکی یونیورسٹی کے پروفیسر'' اور پیرس کے ہفت روزہ لا ایکسپریس (L' Express) کے نمایندے'' ہیں، حقیقت میں یہ دونوں افراد اسرائیلی تھے، اور ان کا ان میں سے کسی ایک منصب کے ساتھ بھی کوئی تعلق نہیں تھا، انھوں نے اس پروگرام میں یہ موقف اختیار کیا کہ سوویت یونین، پی ایل او، اور ایران کے ''انتہاپسند'' مسلمانوں کے ''باہمی مفاد'' نے اس واقعہ کو جنم دیا ہے، ان سے انٹرویو رابرٹ ابرنتھی (Robert Abernethy) کر رہا تھا، جب اس نے پوچھا کہ کیا واقعی یہ

۱۔ ایبسکم کیس۔ امریکی ادارے ایف بی آئی کے کچھ ایجنٹوں نے 1978ء میں عبدل انٹر پرائز لمیٹڈ قائم کی، اور خود کو مشرق وسطیٰ کے تاجر ظاہر کرنا شروع کر دیا، انھوں نے واشنگٹن میں ایک مکان، فلوریڈا میں ایک کشتی، پنیسولا اور نیوجرسی کے ہوٹلوں میں کمرے مخصوص کروائے اور امریکی افسروں کے ساتھ اس فرضی شیخ کی ملاقات کا ڈراما شروع کر دیا جس کا نام کمبیر عبدالرحمٰن رکھا گیا تھا، اس کے لیے انھوں نے ایک سزا یافتہ دھوکے باز میلون برگر کی خدمات حاصل کیں، جب اس شیخ سے امریکی حکام کی ملاقات ہوتی تو وہ یا تو ان سے امریکا میں سیاسی پناہ کی بات کرتا اور اس کے بدلے میں بھاری رقم کی پیشکش کرتا، یا اپنا سرمایہ ملک کے باہر لے جانے میں ان کی مدد خریدتا یا انھیں سرمایہ کاری کی کسی سکیم میں شمولیت کی پیشکش کرتا، یہ لوگ جب پکڑے گئے تو امریکا کے ایک سینٹر، ایوان نمایندگان کے چھ ارکان، نیوجرسی کے میئر، فلاڈلفیا سٹی کونسل کے رکن اور امیگریشن کے ایک انسپکٹر کو سزا ہوئی۔ (مترجم)

تینوں قوتیں سفارت خانے پر قبضے کے واقعے میں ملوث تھیں؟ تو جواب ملا کہ نہیں ملوث تو نہیں تھیں، لیکن اس واقعہ سے انھیں فائدہ ضرور ہوا ہے، اس پر جب ابرنتھی نے بڑی نرمی کے ساتھ یہ سوال اٹھایا کہ آپ اصحاب جو بات کہہ رہے ہیں اسے سن کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اسرائیل کی طرف سے ''پی ایل او کے تشخص کو بگاڑنے'' کی کوشش کی جارہی ہے، تو اس پر پروفیسر پری میوٹر نے ندامت بھرے غصے میں کہا وہ تو صرف اپنی ''ادبی صداقت اور وقار'' سے کام لے رہے ہیں۔

سی بی ایس نے جب سفارت خانے پر قبضے کے معاملے میں دوسروں کو آگے بڑھتا ہوا محسوس کیا تو اس نے بارہ دسمبر سے ''رات کی خبروں'' (Nightly News) کا سلسلہ شروع کر دیا، جن میں دفتر خارجہ کے ماروِن کلب (Marvin Kalb) اپنی ہر دلیل کے لیے ان ''سفارتی اور جاسوسی'' ذرائع کا حوالہ دیتا رہا جن میں کسی کا نام نہیں آتا، ایک ماہ پہلے ڈروز نے بھی ان ہی ذرائع کا حوالہ دیا تھا، اس پروگرام میں ایک بار پھر یہ بات ابھری کہ سفارت خانے پر قبضے پی ایل او، اسلامی بنیاد پرستوں اور سوویت یونین کے تعاون سے ہوا ہے، ماروِن کلب نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ سفارت خانے کے صحن میں پی ایل او کے آدمیوں نے بارودی سرنگیں بچھائی تھیں اور اس کی تصدیق اس بات سے ہوتی ہے کہ سفارت خانے کے اندر جو ''عرب آوازیں'' سنائی دیں وہ فلسطینیوں کی تھیں کلب کی اس ''کہانی'' کی مختصر رپورٹ اگلے دن لاس اینجلس ٹائمز میں شائع ہوئی اس طرح کی گفتگو اگر ان اصحاب تک ہی محدود رہتی تو خیر تھی مگر بات ان تک محدود نہیں رہی اور کونسٹینٹائن مینکس (Constantine Menges) جیسی شخصیت نے بھی پہلے 15/دسمبر 1979ء کو نیو ری پبلک میں اور پھر میک نیل، لہرر رپورٹ میں یہی نظریہ بیان کر دیا اور وہ بھی اس نظریے کو ثابت کرنے کے لیے اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا کہ ساحرانہ قوت رکھنے والا کمیونزم ہی، پی ایل او جیسے مسلم شیاطین کا قدرتی حلیف ہوسکتا ہے، اس کے اس بیان کے بعد توقع تو یہ تھی کہ وہ اخبارات اور ٹیلی وژن پر نظر آتا رہے گا مگر حیرت کی بات ہے کہ جب افغانستان پر سوویت یونین نے حملہ کیا تو میک نیل اور لہرر نے اسے اپنے پروگرام میں شرکت کی دعوت نہیں دی اور ایران پر سرکاری تنقید کے دوران بھی مینکس کو اس سے باہر رکھا گیا۔

ڈینیل پی ڈروز نے 2/نومبر کو اٹلانٹا جرنل کانسٹی ٹیوشن میں یہ دلیل پیش کی تھی کہ ''جہاں شیعہ ہوگا وہاں ہنگامہ آرائی لازمی ہے''۔ اس بات کو زیادہ بہتر انداز دینے میں 18/نومبر کو نیویارک ٹائمز نے ایک مختصر سرخی کے ذریعے پیش کیا تھا کہ ''سفارت خانے پر قبضہ اہل تشیع کی حاکمیت کو تسلیم کروانے اور شاہ کے خلاف غم و غصے کے اظہار کے لیے کیا گیا ہے''...... سفارت خانے پر قبضہ 4/نومبر کو ہوا تھا اس کے ایک ہفتے کے اندر اندر

آیت اللہ خمینی کی ایسی تصویریں ایک تسلسل کے ساتھ نظر آنے لگی تھیں جو انھیں بدمزاج ظاہر کرتی تھیں، ان تصویروں کے ساتھ ادل بدل کر ایرانیوں کے بڑے بڑے ہجوم کی تصویریں بھی دکھائی جاتی تھیں اور اس سارے سلسلے میں کہیں کوئی تبدیلی نہیں کی جاتی تھی، پھر اس دوران ایرانی پرچم کو نذر آتش کرنا، فروخت کرنا، امریکیوں کا ایک مشغلہ بن گیا تھا، اور پریس بڑی ایمانداری کے ساتھ حب الوطنی کے ان مظاہروں کی خبریں شائع کر رہا تھا، اس دوران ایسی خبروں کو بھی اچھالا گیا جو ایرانیوں اور عربوں میں کھنچاؤ کو ظاہر کرتی تھیں، ان میں سے ایک مثال بوسٹن گلوب کی ہے، جس نے اپنی دس نومبر کی اشاعت میں سپرنگ فیلڈ کے ایک ہجوم کو دکھایا جو ''عربو واپس جاؤ'' کے نعرے لگا رہا تھا، اس واقعہ کے دوران ہر اخبار اور رسالے میں کثرت کے ساتھ اہل تشیع کے اسلام پر فیچر آرہے تھے، لیکن موجودہ دور کے ایران کی تاریخ کے متعلق نسبتاً بہت کم مضامین شائع ہوئے اور ایرانی علما کی اس تحریک کا ذکر بھی برائے نام ہوا، جو انھوں نے انیسویں صدی کے اواخر سے شہنشاہیت اور بیرونی مداخلت کے خلاف شروع کر رکھی تھی، پھر ایسے مضامین بھی بہت کم سامنے آئے جن میں اس بات پر غور کیا گیا تھا کہ (امام) خمینی نے ویڈیو کیسٹوں اور غیر مسلح عوام کی مدد سے کیونکر شاہ کا تختہ الٹ دیا اور شکست نہ کھانے والی فوج کو زیر کر لیا۔

ایک طرح سے یہ بات بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ والٹر کردن کائیٹ، ناموں کا صحیح تلفظ ادا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا، جب بھی اس نے قطب زادے کا نام لیا اس کا تلفظ بگاڑ دیا، زیادہ تر وہ اسے ''گابوز ڈے'' کہتا رہا، اسی طرح 28/نومبر کو سی پی ایس نے بہشتی کو ''باشاتی'' کہہ دیا اور یہ بات بھی کہنے سے نہ رہ جائے کہ 7/دسمبر کو اے بی سی نے منتظری کا نام بدل کر ''مونٹی سری'' بنا دیا، بے خبری کے اس انداز کو سامنے رکھیں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جب مغرب اسلام کی مختصر تاریخ پیش کرتا ہے، تو اس کا الجھاؤ یا تو اسے احمقانہ بنا دیتا ہے یا اس میں شامل غلط بیانیاں اسے خوفناک روپ دے دیتی ہیں، اس کی بہترین مثال سی پی ایس کی 21/نومبر کی رات کی خبریں ہیں، ان میں رپورٹر رینڈی ڈینیل (Randy Daniel) محرم کے متعلق بتاتا ہے کہ اس میں شیعہ مسلمان ''(حضرت) محمد (ﷺ) کی طرف سے دنیا بھر کے لیڈروں کو چیلنج کرنے'' کی یاد مناتے ہیں، محرم کی یہ تشریح انتہائی احمقانہ ہے، محرم ایک اسلامی مہینہ ہے، جس کے ابتدائی دس دنوں میں شیعہ مسلمان حضرت امام حسینؓ کی شہادت کی یاد تازہ کرتے ہیں، آگے چل کر ڈینیل ہمیں یہ بتاتا ہے کہ شیعہ مسلمانوں میں اذیت رسانی کا جذبہ ہوتا ہے، اس لیے یہ بات ''حیران کن نہیں ہے کہ انھوں نے (امام) خمینی کو اپنا لیڈر بنا لیا ہے'' یہ بیان اگرچہ امریکیوں کے لیے بڑا اطمینان بخش تھا کہ (امام) خمینی پوری اسلامی دنیا کی

نمایندگی نہیں کرتا مگر یہ بھی غلط بیانی میں دوسروں سے کسی طرح کم نہ تھا، اسی پروگرام میں میرا بھی ایک دانشور کے طور پر انٹرویو کیا گیا مگر غلطی سے میرا تعارف مطالعہ اسلام کے پروفیسر کے طور پر کرا دیا گیا، اسی طرح 27 نومبر کو سی بی ایس کے رپورٹر نے ہم سب کو یہ بتایا کہ ایران دراصل ''انقلاب کا نشہ اترنے کے فوری بعد کی کیفیت'' سے دوچار ہے، اس تشریح سے صرف یہی احساس ابھرتا تھا کہ ایران بلانوش ہے۔

اس کے بعد یوں ہوا کہ نیویارک ٹائمز کی نامور شخصیات نے اپنا تمام تر زور اس بات پر لگا دیا کہ ''امریکیوں کو یرغمال بنانے والی'' قوتیں اسلام کے نام پر اکٹھی ہیں، ٹائمز نے جو اسلام پیش کیا اس کا تعلق اس بات سے ہے کہ ٹائمز کیا ہے، ٹائمز امریکا کا ایک سرکردہ اخبار ہی نہیں ہے بلکہ اس کی ہمہ گیریت کو ماہرانہ رپورٹنگ کے معیار، ذمہ دارانہ انداز، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قومی سلامتی کے امور پر صحت کے ساتھ لکھنے کی صلاحیت نے مل کر اسے ایک الگ طرح کی قوت بنا دیا ہے، دوسرے الفاظ میں ٹائمز کسی بھی موضوع پر پورے یقین کے ساتھ نہ صرف گفتگو کر سکتا ہے بلکہ یہ بھی منوا سکتا ہے کہ یہ موضوع قوم کے لیے انتہائی اہمیت کا حامل ہے، ٹائمز اکثر اوقات ایسا جان بوجھ کر کرتا ہے اور کامیاب بھی رہتا ہے، ہری سن سالسبری (Harrison Salisbury) اپنی یادداشتوں میں لکھتا ہے کہ 1961ء کے موسم بہار میں صدر کینیڈی نے ٹرنر کیٹ لیج (Turner Catledge) کو بتایا تھا کہ ٹائمز نے خود چھان بین کر کے پگز کی کھاڑی (Bay of Pigs) پر رکے ہوئے حملے سے متعلق جو تفصیلات شائع کی تھیں اگر یہ اخبار کچھ اور تفصیلات شائع کر دیتا تو ''تم نے ہمیں ایک بھاری غلطی سے بچا لیا ہوتا''، سالسبری بتاتا ہے کہ پگز کی کھاڑی کے واقعہ کے بعد نہ تو ٹائمز کو، نہ دنیا کو ہی یہ بات سمجھ آئی ہے کہ نہ تو ٹیڈ سلک (Tad Szulc) کی رپورٹنگ غیر معمولی تھی، اور نہ اخبار نے جو کارکردگی دکھائی وہ غیر معمولی تھی، یہ سب کچھ ایک معمول کے مطابق ہوا، لیکن دی ٹائمز غیر معمولی حد تک اتنا مضبوط ادارہ بن گیا ہے جو بذات خود ایسی قوت کے طور پر متحرک ہے جو قوت کسی قوم کی ہی ہو سکتی ہے۔

> دی ٹائمز اب انتہائی اہم بلندیوں تک پہنچ گیا ہے، اس کی اس وسعت کا پیمانہ صرف قارئین یا اشتہار نہیں ہیں، یہ دونوں باتیں بھی کسی حد تک اس کی اس ترقی سے جڑی ہوئی ہیں، لیکن اس کی شہرت کی بنیادی وجہ اس کی رپورٹیں اور اس کی ماہرانہ رائے ہے اور ان دونوں میں اس نے نام پیدا کر لیا ہے، اب یہ اتنا پھیل چکا ہے کہ یہ پوری دنیا کی خبریں دے رہا ہے، واشنگٹن کی خبریں دے رہا ہے، پوری قوم کی خبریں دے رہا ہے، ہر شہر کی خبریں دے رہا ہے، اور یہ خبریں اسے راہ گزر فراہم نہیں کرتے بلکہ ہر جگہ

> مردوں اور عورتوں پر مشتمل اس کا اپنا سٹاف خبریں لاتا ہے، جس طرح کے بہترین رپورٹر اور ایڈیٹر جمع کیے جا سکتے تھے اس طرح کے دی ٹائمز نے جمع کر لیے ہیں، دی ٹائمز کی تنخواہیں اچھی ہیں لیکن بہت زیادہ شاندار بھی نہیں ہیں، اس لیے جو لوگ دی ٹائمز کے سٹاف میں شامل ہوتے ہیں، ان کے مدنظر بہترین مالی معاوضہ نہیں ہوتا بلکہ وہ اس اخبار میں شمولیت کو اس لیے پسند کرتے ہیں، کیونکہ یہ اخبار انھیں رپورٹنگ اور ایڈیٹنگ کے لیے بے مثال مواقع فراہم کرتا ہے اور کہیں بھی پیشہ ورانہ کارکردگی کا معیار اس اخبار جیسا بلند نہیں ہے، رپورٹروں کی تعداد پگز کی کھاڑی کے واقعہ کے بعد سے اتنی زیادہ ہوئی ہے اور ان کا معیار اتنا بہتر ہے کہ وہ کسی سمت کا شعوری تعین کیے بغیر کام کر سکتے ہیں، دنیا بھر میں دی ٹائمز کے لوگ موجود ہیں، وہ خبروں کو سونگھنے، تلاش کرنے، کھود نکالنے اور سوال کرنے میں مصروف ہیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہوا ہے کہ ایک فیصلہ کن قوت کا اظہار کرنا اس اخبار کا ایک اجتماعی مشن بن گیا ہے اور ٹائمز کے رپورٹر ''کسی سمت کے شعوری تعین کے بغیر'' عادتاً'' رپورٹنگ کرتے ہیں، 1971ء میں جب ٹائمز نے پینٹا گان کے کاغذات شائع کرنا شروع کیے، اس وقت ٹمینی ہال سے باس ٹویڈ (Boss Tweed) کے ٹولے کے خلاف متعلقہ سرکاری دستاویزات شائع کر کے اسے حکومت سے باہر نکالنے کے واقعہ کو سو سال ہو چکے تھے، سالسبری کے مطابق یہاں ایک بار پھر، قانون سے بالاتر ہو کر، مثالی اخلاق پیش بنی کے تحت اور قوم کے مفاد میں عمل کرتے ہوئے اخبار نے سچ کو ظاہر کرنے اور حکومتوں کو ہلا کر رکھ دینے کی اپنی قوت کا مظاہرہ کیا، یہ ایک حقیقت ہے کہ حال ہی میں مینجنگ ایڈیٹر اے ایم روزن تھال (A.M. Rosen Thal) کی نگرانی میں ''گھر'' اور ''آداب زندگی'' جیسے فیچر شروع کیے گئے ہیں، ان سے بڑا مالی فائدہ پہنچا ہے، مگر یہ مالی فائدہ اس شعبے تک محدود نہیں ہے بلکہ غیر ملکی رپورٹنگ میں توسیع نے بھی آمدنی میں اضافے کو ممکن بنایا ہے۔

> فیچروں کے نئے سیکشن قائم ہونے سے اخبار کو ایک ایسا میدان میسر آ گیا جس نے اس کی حیثیت کو تمام مالی خطرات سے بالاتر کر دیا ہے اور یہ اس وقت ہوا ہے جب ''نیوز'' اور ''پوسٹ'' اس میدان میں ٹھوکریں کھا رہے تھے، اب دوسرے اخباروں سے ہٹ کے دی ٹائمز کی پوزیشن یہ ہو گئی ہے کہ وہ سقوط ایران کے لیے ''تنخواہوں اور سٹاف کے اخراجات کے علاوہ تیس سے پچاس ہزار ڈالر تک ماہانہ خرچ کر سکتا ہے اور اس نے

یہ خرچہ اٹھایا بھی ہے۔

جس سال ''سقوط''[1] ایران ہوا اس کے ختم ہونے سے کچھ پہلے دی ٹائمز بالآخر اسلام کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے گیارہ دسمبر کو اپنے دو صفحات اس سمپوزیم کے لیے مخصوص کر دیئے جس کا عنوان تھا ''دنیائے اسلام کا دھماکا'' (The Explosion in the Moslem World)، اس سمپوزیم میں سات افراد نے حصہ لیا ان میں سے تین سکالروں کا تعلق مسلم دنیا سے تھا، وہ اس وقت امریکا میں رہائش پذیر تھے اور وہیں کام بھی کر رہے تھے، باقی چار اسلامی دنیا کی تاریخ، ثقافت اور معاشروں کے جانے پہچانے ماہرین تھے، ان کے سامنے بحث کے لیے جتنے سوال رکھے گئے وہ سب سیاسی نوعیت کے تھے، اور ہر سوال میں اس موضوع کو ضرور چھیڑا گیا تھا کہ اسلام سے امریکی مفادات کو کتنا خطرہ لاحق ہے، گفتگو کے دوران ماہرین نے مسلم دنیا کو اس طرح زیر بحث لانے کی کوشش بھی کی جیسے اس کا ماضی بڑا تکلیف دہ رہا ہے، یہ مختلف سیاسی عملوں سے گزر رہی ہے اور مسلمانوں کی کئی مختلف اقسام ہیں، لیکن ان تمام کوششوں کو سوالوں کی قوت نے نکیل ڈال دی، یہ سوال کچھ اس طرح کے تھے کہ ''اگر ہم آج کٹر مسلمانوں کی نظروں میں شیطان ہیں تو ہمیں ان قوتوں، ان لیڈروں اور ان حکومتوں کے ساتھ کس طرح کا طرز عمل اختیار کرنا چاہیے، جن کے ساتھ ہمارا قریبی تعلق ہے؟ بازرگان جب برزنسکی سے ہاتھ ملاتا ہے تو اسے فارغ کر دیا جاتا ہے، بنی صدر کہتا ہے کہ وہ نیویارک جانا چاہتا ہے تو اس سے اس کی سیاست کا خاتمہ ہو جاتا ہے، کیا اس میں ہمارے لیے یہ سبق پوشیدہ نہیں ہے کہ ہمیں دوسری حکومتوں سے کس طرح کا معاملہ کرنا چاہیے؟ کیا اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہمیں خود پر قابو رکھنا ہے یا اس کے علاوہ کوئی بات ہے؟'' ان سوالات کی نوعیت ایسی تھی جو دی ٹائمز کو یہ احساس دلا رہی تھی کہ وہ اصل ماخذ کی طرف بڑھ رہا ہے، وہ اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ اگر مسلمانوں پر ''اسلام'' کی حکمرانی ہے تو آمنے سامنے بیٹھ کر اسلام پر سوال کیوں نہ اٹھایا جائے، اس سمپوزیم کا دلچسپ پہلو یہ تھا کہ سکالر اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ ''اسلام'' کو اس کے مختلف اہم حصوں میں تقسیم کر دیا جائے جبکہ دی ٹائمز ٹکڑوں کو جوڑ کر ان کو اس قوت میں بدلنا چاہتا تھا جو یا تو امریکا کے مفادات کی ''دشمن'' یا ''حامی'' ہے، اس سمپوزیم کا نتیجہ بے سود اور تھکا دینے والی بحث نکلا، ٹائمز کی طرف سے آخر میں جو سوالات پوچھے گئے ان سے یہ بات سامنے آئی کہ ترغیب اور منطق سے کام نہیں بن سکتا، اس لیے آخری حربے کے طور پر شاید قوت کا استعمال کرنا پڑے۔

''ہمیں'' اسلام کے متعلق کیا سوچنا چاہیے، اس کے بارے میں تمام شکوک و شبہات اس وقت دور

1۔ امریکا کے حوالے سے یہ سقوط تھا جبکہ ایرانی اسے عوام کی فتح قرار دیتے ہیں۔ (مترجم)

ہو گئے جب 1979ء کے آخری چار دنوں میں دی ٹائمز نے چار طویل مضامین شائع کیے، یہ مضامین فلورا لیوئس نے لکھے تھے اور ان مضامین میں بحرانوں کے شکار اسلام پر سنجیدگی کے ساتھ گفتگو کی گئی تھی۔ 30,29,28, اور 31 دسمبر کو شائع ہونے والے ان مضامین کا عنوان تھا ''اسلام میں تلاطم'' (Upsurge in Islam)، فلورا کے مضامین میں کچھ باتیں بہت اچھی ہیں، مثال کے طور پر اس نے پیچیدگی اور تنوع کی بہت کامیاب نقشہ کشی کی ہے، تاہم ان مضامین میں کئی سنجیدہ نوعیت کی کمزوریاں بھی ہیں اور ان میں سے زیادہ تر کا تعلق آج کے اس مفروضے سے ہے جس کی روشنی میں اسلام کو دیکھا جاتا ہے، اس نے یہودیوں اور مصریوں یا لبنان میں عیسائیت کے تلاطم کا خال خال ذکر کیا ہے اور مشرق وسطیٰ میں اسلام کو تنہا کر کے اپنی سوچ کا محور بنایا ہے، پھر اس نے اپنے مضامین میں کچھ بیان بھی جاری کیے ہیں، خاص طور پر تیسرے مضمون میں وہ عربی زبان کے متعلق کہتی ہے کہ ''شاعری اندورنی جذبات اور ذاتی احساسات پر مبنی نہیں بلکہ خطیبانہ ہوتی ہے'' اس طرح وہ اسلامی ذہن کے متعلق یہ اظہار کرتی ہے کہ ''اس میں سوچ سمجھ کر ایک ایک قدم اٹھانے کی صلاحیت نہیں ہوتی'' اگر فلورا کسی دوسری زبان، مذہب یا نسلی گروہ کے متعلق ایسے ہی خیالات کا اظہار کرتی تو اسے یا تو نسل پرست سمجھا جاتا یا اس کے طرز عمل کو احمقانہ قرار دے دیا جاتا۔

اس مضمون کے دس سال بعد ٹائمز میں ہی کرس ہیج (Chris Hedgevs) کا مضمون شائع ہوا جس کا عنوان تھا کہ ''ایک زبان جو خود ہی اپنے خلاف تقسیم ہو گئی'' (A Language Divided Against Itself)، اس کا کہنا تھا کہ اس زبان کو پہلے قوم پرستی نے خراب کر دیا تھا، پھر وہ بتاتا ہے کہ انتہا پسند مسلمانوں نے کس طرح اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے اس میں سے نفرت، سادہ مطالب اور مذہبی جوش و جذبے کی ایک نئی زبان پیدا کی، اپنی اس بحث کو سمیٹتے ہوئے کرس کہتا ہے ''سیاسی مکالمے کے اس انداز اور اس سوچ پر وحشت نے بہت کم ایسے عرب باقی رہنے دیئے ہیں، جو ایک دوسرے کے ساتھ گفتگو کر سکتے ہیں''۔

فلورا نے اپنے مضمون میں ایسے مستشرقین کے حوالے دیے تھے جنھوں نے اپنے نظریات عام کر دیے تھے ان میں ایلی کیدوری (Elie Kedourie) تھا جس نے 1979ء کے اواخر میں اسلامی انقلاب کا مطالعہ پیش کیا تھا اور یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ اس کے اثرات مارکسزم اور لینن ازم کے برابر ہیں، اس سلسلے میں وہ کہتا ہے کہ ''مشرق کی بدنظمی بڑی گہری ہے اور یہ کسی ایک ملک یا ملت کے لیے مخصوص نہیں ہے'' اور اسی نکتہ کو آگے بڑھاتے ہوئے برنارڈ لیوئس جو فلورا لیوئس کا رشتہ دار نہیں ہے، کہتا ہے کہ اسلامی دنیا میں ''آزادانہ سوچ اور تحقیق و تلاش کا خاتمہ'' ہو چکا ہے، اس کے خیال کے مطابق اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام ''جامد'' ہو کر رہ گیا ہے

اوراس کے عقائد نہ صرف ''قطعی نوعیت کے ہیں، موقع کی مناسبت کے مطابق، اور حاکمیت لیے ہوئے ہیں، یہاں یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ ایک سینئر مستشرق کی حیثیت سے 1980ء اور 1990ء کی دہائیوں میں برنارڈ لیوئس نے ''اسلام'' پر اپنے حملوں کو جاری رکھا، ویسے بھی فلورالیوئس یا برنارڈ لیوئس کا مطالعہ کرنے والوں سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اسلام کے متعلق کوئی متوازن تصور قائم کرسکیں گے کیونکہ حوالوں کے پیچھے تیزی سے بھاگتے ہوئے ایسے لوگ جنھیں موضوع سے کوئی واقفیت نہیں ہوتی وہ اپنے قاری کے اس احساس میں جو پہلے سے موجود نہیں ہوتا کوئی اضافہ تو نہیں کرسکتے، مگر اپنے متعلق یہ تاثر ضرور اجاگر کرسکتے ہیں کہ وہ کوڑے کے ڈھیر میں سے کوئی موضوع تلاش کررہے ہیں، بہرحال ایسے کروڑوں لوگوں کا کیسے احاطہ کیا جاسکتا ہے جن کے الفاظ ''کسی حقیقت کو بیان کرنے کی بجائے صرف آرزو کا ہی اظہار کرتے ہیں اس خیال کا صحیح موازنہ اٹلانٹک کانسٹی ٹیوشن کے 19 رنومبر کے شمارے میں شائع ہونے والے اس مضمون سے کیا جاسکتا کہ ''فارسی زبان میں نفاست اور پرفریبی دونوں موجود ہیں'' تاہم یہ طے ہے کہ اسلام کے متعلق مغرب کی ایک سوچ بن چکی ہے اور اس کا اظہار کچھ یوں ہوتا ہے کہ اگرچہ اسلام ''ہم'' پر قطعاً واضح نہیں ہے تاہم اس کے بارے میں ہمارے رویے یا وہ رویے جو ''ہم'' اس کے ساتھ منسوب کرنے کا حق رکھتے ہیں، پوری طرح واضح ہیں۔

اسکوائر (Esquire) کی مئی 1980ء کی اشاعت میں فلورالیوئس کا ایسا انٹرویو شائع ہوا ہے جس میں اس نے غیر ارادی طور پر کئی انکشافات کردیے ہیں اس میں وہ بتاتی ہے کہ کس طرح اس نے مفروضوں اور مفروضوں سے پیدا ہونے والے مضامین کو جوڑا اور انھیں اسلام پر ایک مضمون کی شکل میں ڈھال دیا، اس کا کہنا تھا کہ ٹکڑے جوڑ کر اس نے جو رپورٹیں تیار کی تھیں، ان کے بے ترتیب انداز سے یہ پتا چلتا تھا کہ دی ٹائمز انھیں کام کی چیز بنا سکتا ہے، کیونکہ اسلام تو اسلام ہی ہے، مگر دی ٹائمز کی بھی اپنی الگ شان ہے، وہ کہتی ہے کہ ''کوئی بھی یہ نہیں جانتا کہ اسلام کے اندر کیا آفتیں برپا ہیں'' اس کا یہ انٹرویو درج ذیل تھا۔

> ''چند ماہ پہلے مجھے اس پراجیکٹ میں شریک کیا گیا، یہ کام بہت بڑا تھا اور کسی طرح گرفت میں نہیں آرہا تھا، اس سلسلے میں نیویارک میں ایک اجلاس ہوا جس میں کسی نے کہا کہ ''یسوع کی قسم کوئی بھی نہیں جانتا کہ اسلام کے اندر کیا ہلچل برپا ہے، اس لیے ہمیں فلورا کو بھیجنا چاہیے'' یوں اسلامی دنیا میں جاری ہیجان کے متعلق یہ خصوصی مہم میرے سپرد کردی گئی، انھوں نے مجھے بلایا تو میں چلی گئی مگر اس سارے معاملے کو سنبھالنا مجھے دیوانہ پن لگتا تھا، کیونکہ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ جو مواد میں اکٹھا کروں گی اسے کیسے استعمال کیا جائے گا۔
>
> مجھے بڑی عجلت میں تمام انتظامات کرنا پڑے، میں چاہتی تھی کہ پہلے لوگوں سے ملاقاتیں کرلوں، لیکن میرے پاس کہیں جانے کا وقت نہیں تھا۔
>
> میں نے اپنے کام کی ابتدا پیرس اور لندن سے کی، اس کے بعد میں قاہرہ اس لیے گئی کہ وہاں اسلامی یونیورسٹی ہے، پھر میں الجزائر اور تیونس بھی گئی اور جب میں واپس لوٹی، میری بیس نوٹ بکیں بھر چکی تھیں کاغذوں سے بھرے دس فولڈرز تھے جن میں بے شمار معلومات جمع ہوگئی تھی، میں انھیں سامنے رکھ کر لکھنے بیٹھ گئی۔
>
> اس محنت اور مشقت میں میرے لیے سیکھنے کی بڑی گنجایش تھی، پھر اس میں ایک کشش یہ بھی تھی کہ دی ٹائمز اس کے بعد اس جیسا کوئی دوسرا علمی کام میرے سپرد کرسکتا تھا،
>
> خود رپورٹنگ کرنے میں صرف مشکل اس وقت پیش آتی ہے، جب میں کسی ایک جگہ مصروف ہوں اور دوسری جگہ نہ پہنچ سکوں، مثلاً اسلام کے متعلق اس کام کے دوران مجھے فلپائن سے متعلق بھی کسی قدر تفصیل کی ضرورت تھی، میں نے چاہا کہ اس سلسلے میں اخبار کا ایشیائی بیورو میرا یہ کام کردے مگر وہاں سب کمبوڈیا کی جنگ، جنوبی کوریا کی الجھنوں اور ٹوکیو کے بحران میں پھنسے ہوئے تھے، چنانچہ وہ تو میرے کسی کام نہ آسکے، البتہ نیویارک میں فلپائن کے متعلق جس قدر معلومات تھیں وہ کسی شخص نے جمع کرکے مجھے بھیج دیں۔

دی ٹائمز نے اسلام پر جو فیچر شائع کیے اور اس سلسلے میں لی مونڈے (Le Monde) نے جو مضامین تیار کیے، ان کا موازنہ بہت سی اہم باتوں پر روشنی ڈال سکتا ہے، دی ٹائمز نے تو اسے جلدی جلدی فلورا سے تیار کروالیا تھا، اس نے اپنے اس مضمون میں نہ تو ان عظیم الہیاتی اور نہ اخلاقی مسائل پر بحث کی جس پر پوری اسلامی دنیا میں بحث و تمحیص کا ایک سلسلہ جاری ہے، غور طلب بات یہ ہے کہ کوئی بھی شخص جب تک قرآن کی تفسیر کے مختلف طریقوں یعنی اجتہاد کے حامیوں...... انفرادی تفسیر...... تقلید کے حامیوں...... حکم کے درجے پر فائز علما کی تفسیر پر بھروسا نہ کرے، اس وقت تک اسلام پر کیونکر گفتگو کرسکتا ہے؟ فلورا نے نہ تو اس کی تاریخ پر، نہ ان مختلف اسلامی سکولوں کے ڈھانچوں پر ہی بات کی جو ''ہنگامہ آرائی'' کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں، اس نے تو اس بات کا بھی ذکر نہیں کیا کہ کس طرح ''اسلام'' غریب اور بے آسرا لوگوں کے لیے قدرتی پناہ گاہ ثابت ہوا

ہے،اس کے بجائے وہ اوٹ پٹانگ لوگوں کی اوٹ پٹانگ باتوں کا حوالہ دیتی، اور اپنے تجزیے میں قصے کہانیوں کواستعمال کرتی رہی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی زندگی کی حقیقی تصویر پیش کرنے میں کامیاب نہ ہوسکی، اتنے کاغذات جمع کرنے کے بعد اس کے علم کا یہ حال ہے کہ وہ یہ بھی نہیں بتاسکی کہ کیا اسلامی طرز حیات نظریاتی ہے مابعد الطبیعیاتی ہے، سیاسی ہے یا اقتصادی۔

اس لیے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ امریکا کے مشہور زمانہ اخبار کا اس سلسلے میں فرانس کے ایک معتبر اخبار سے موازنہ کیا جائے۔قریب قریب ایک سال پہلے لی مونڈے نے میکسم روڈن سن کی خدمات حاصل کیں، روڈن سن ایک ممتاز مارکسسٹ مستشرق ہے اور اس کا حوالہ فلورا نے بھی اپنے مضمون میں دیا ہے، روڈن سن کو بھی وہی مطالعہ کرنے کا کام سونپا گیا تھا جو فلورا نے کیا اور اس سلسلے میں روڈن سن کے مضامین 7,6 اور 8/دسمبر 1978ء کو لی مونڈے میں شائع ہوئے، دونوں مضامین میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے، تاہم روڈن سن کی اس موضوع پر مکمل گرفت ہے، اسے زبانوں پر عبور حاصل ہے، وہ مذہب کو جانتا ہے، سیاست کو سمجھتا ہے، چنانچہ وہ قصے کہانیاں کا سہارا نہیں لیتا، کوئی سنسنی خیز حوالے نہیں پیش کرتا، وہ ''مخالف'' اور ''حامی'' اسلامی ماہرین کے درمیان توازن قائم کرنے پر تکیہ نہیں کرتا، اس نے اپنے مضمون میں اسلامی معاشرے اور تاریخ کی ان قوتوں کا پتا لگانے کی کوشش کی بھی ہے جنھوں نے حالیہ سیاسی صورت حال اور موجودہ بحران کو پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے، اس کے نتیجے میں شہنشاہیت، طبقاتی کشمکش، مذہبی جھگڑا، سماجی اخلاقیات جیسی باتیں، اس کے مضمون میں ابھرتی ہیں چنانچہ وہ شکوک وشبہات میں گرفتار اور سہمے ہوئے قارئین کے سامنے مختلف رویوں کا پلندا رکھ دینے پر اکتفا نہیں کرتا۔

باب دوم

ایران کا ضیاع

(حصہ دوم)

وہ اصحاب جن کا دل ایران کے بارے میں سطحی اور بیہودہ گفتگو پر مبنی رپورٹنگ سے تنگ آگیا ہے وہ اس لائق ہوگئے ہیں کہ اطمینان کا سانس لینے اور واقعات کی اصلیت جاننے کے لیے پی بی ایس کے رات کے پروگرام میک نیل، لہرر رپورٹ کی طرف متوجہ ہوں، اشاعتی صحافت کی دنیا میں نیویارک ٹائمز کی طرح نشریاتی صحافت میں بھی ''رپورٹر'' کو بلند مرتبہ حاصل ہے لیکن رپورٹنگ کے حوالے سے جہاں تک میک نیل، لہرر رپورٹ کا تعلق ہے، یہ بڑے عجیب انداز میں غیر تسلی بخش ہے، اس پروگرام نے خود کو محدود کررکھا ہے، مباحثے کے موضوع سے لے کر گفتگو میں شرکت کرنے والے اصحاب کے انتخاب تک میں قدامت پسندی جھلکتی ہے، آیئے پہلے اس کے پروگراموں کی ساخت کو زیر بحث لائیں، امریکیوں کے لیے ایران دنیا کا ایک غیر معروف حصہ تھا جب اس کے متعلق ایک غیر روایتی خبر آتی ہے تو ''وہاں کے'' بے ہنگم ہجوم اور یہاں کے سلیقے سے ملبوس لوگوں کے ذریعے، ناظرین کو فوری طور پر ایک نمایاں فرق کا احساس دلا دیا جاتا ہے، پھر بڑی احتیاط کے ساتھ مہمانوں کا انتخاب ہوتا ہے اور صرف اس اہلیت کو نظر میں رکھا جاتا ہے کہ وہ ماہرین ہیں مگر اس بات کو نہیں دیکھا جاتا کہ وہ صاحب بصیرت اور فہم وفراست بھی ہیں یا نہیں، پھر کسی صورت حال کو دانشمندانہ انداز میں سمجھنے کی کوشش کرنا کوئی غلط بات بھی نہیں ہے چنانچہ جب یہ پروگرام شروع ہوتا ہے، تو اس سے یہی تاثر ابھرتا ہے کہ صورت حال کو دانشمندی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی جارہی ہے، لیکن جو سوال مہمانوں سے پوچھے جاتے ہیں، ان سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ میک نیل اور لہرر اس موڈ کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، جو قوم پر طاری ہے، وہ اپنے اس پروگرام میں ایرانیوں کے خلاف اشتعال کا سہارا لیتے ہیں، ایرانیوں کو کیا چیز ابھارتی ہے، اس کا وہ تاریخی تجزیہ کرتے ہیں، پھر اپنے اس مباحثے کو وہ یا تو سرد جنگ یا بحران پر قابو پانے کے طریقوں کی طرف موڑ دیتے ہیں، یہ طرز عمل دو پروگراموں کے دوران جو 28/دسمبر اور 4/جنوری کو ہوئے نمایاں نظر آیا، ان پروگراموں میں پادریوں کے ان دو گروپوں کو مہمان بنایا گیا تھا، جو حال

ہی میں تہران سے واپس آئے تھے، دونوں پروگراموں میں پادریوں نے ایرانیوں کے جذبات کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا اور کہا کہ پچیس سال تک شاہ کی جابرانہ حکمرانی کے دوران ان پر جو گزری ہے، وہ اسے اچھی طرح سمجھتے ہیں، لہرر نے اس پروگرام میں کھل کر ان پادریوں کی باتوں پر اپنے شکوک و شبہات کا اظہار کیا، پھر جب اس وقت کے ایران کے وزیر خارجہ بنی صدر اور ان کے جانشین صادق قطب زادہ بالترتیب 23 اور 29 نومبر کو اس پروگرام میں آئے تو سوالوں کا سلسلہ وہی تھا جو بعد میں امریکی موقف کے طور پر سامنے آیا، ان دونوں سے کہا گیا تھا کہ رعایتوں اور ان تحقیقاتی کمیٹیوں کو تو ایک طرف رکھیے، جو شاہ کی لاقانونیت اور جرائم کی چھان بین کر رہی ہیں، ہمیں تو یہ بتائیے کہ یرغمالیوں کو کب تک رہا کر دیا جائے گا، اس پروگرام میں سب سے زیادہ اچھنبے کی بات یہ تھی کہ بنی صدر نے پہلی بار شاہ کی واپسی پر زور نہیں دیا بلکہ اس کے بجائے ایک فارمولا پیش کیا جسے اقوام متحدہ کے کمیشن نے لاگو کرنا تھا، یہ کمیشن کئی ماہ بعد تہران گیا، لیکن میک نیل اور لہرر نے اپنے پروگرام میں حسب عادت بنی صدر کی تجاویز پر کوئی توجہ نہیں دی۔

1979ء میں نومبر کے شروع سے لے کے 1980ء میں جنوری کے وسط تک کے پروگراموں میں شامل ہونے والے مہمانوں کی فہرست پہلے سے زیادہ نمایاں تھی، اس پروگرام میں پانچ دفعہ ایرانیوں نے شرکت کی، پھر رچرڈ فالک (Richard Falk) اور اقبال احمد جن کا شمار تیسری دنیا کے حامیوں اور جنگ کے مخالفوں میں ہوتا ہے ایک ایک بار آئے، ان سے ہٹ کر جو لوگ آئے ان میں اخباری دنیا سے متعلق افراد، سرکاری افسر، مشرق وسطیٰ کے علمی ماہرین، کارپوریشنوں اور نیم سرکاری اداروں سے متعلق لوگ یا مشرق وسطیٰ سے تعلق رکھنے والے وہ اشخاص تھے جو ایرانی انقلاب کے مخالفوں کے طور پر مشہور تھے، اسی طرح کے غیر متوازن پروگرام 1990ء میں خلیج فارس کے چار ماہ کے بحران کے دوران بھی دیکھنے کو ملے تھے، جس انداز میں کچھ لوگوں کو اس پروگرام میں بلایا گیا، اس نے شک و شبے کی کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی، ہڈسن انسٹی ٹیوٹ کا مینکس، افغانستان میں امریکا کے سابق سفیر رابرٹ نیو مان (Robert Neumann) اور ایل ڈین براؤن (L.Dean Brown) دو دو دفعہ آئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانیوں نے جو کیا اور کہا، اسے اخلاقی حدود سے باہر قرار دے دیا گیا، اس طرز عمل سے ایرانیوں کے خلاف امریکیوں کے اشتعال کی تسکین تو ہو گئی مگر خبروں کو سمجھنے میں کوئی مدد نہیں ملی، مجھے اس بات پر بڑی حیرت ہوئی کہ نہ تو لہرر اور نہ میک نیل نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ بنی صدر کیا کہنا چاہتے ہیں، مثال کے طور پر بنی صدر نے کہا کہ ''دنیا بھر کے کچلے ہوئے لوگ'' اور اس کے ساتھ یہ سلسلہ جوڑا کہ انھوں نے اپنے دعاوی کی تسکین کے لیے شاہ کی ملک بدری کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ وہ یہ چاہتے ہیں

کہ امریکا اس بات کو تسلیم کرے کہ پسے ہوئے اور کچلے ہوئے لوگوں کی شکایات جائز ہیں، بنی صدر کی یہ بات اس امر کا تقاضا کرتی تھی کہ اس کے معنوں کی گہرائی تک اترا جائے، مگر میک نیل اور لہرر نے اس طرف توجہ ہی نہیں کی۔

چنانچہ میک نیل اور لہرر کی اس تحقیقاتی رپورٹ کا انداز اپنا سنسر خود کرنے کا ہو گیا ہے، اس طرح اس نے اپنے آپ کو انسانی تجربات کے اس وسیع علاقے کی طرف بھٹکنے سے روک لیا، جہاں معاندانہ خیالات اور گفتگو میں اپنی بات کہنے کو اہمیت حاصل ہے، اس پروگرم کو دیکھیں تو پہلی نظر میں سختی سے منظم کیے گئے شرکت کرنے والے ایک میز کے گرد بیٹھے ہوئے دکھائی دیں گے اور ان پر سوالوں کی بوچھاڑ کرتا ہوا ایک جوڑا پوری طرح چھایا ہوا معلوم ہوگا، مجموعی طور پر اس پروگرام میں ایسا متوازن نکتہ نظر نہیں آتا ہے، جس میں استحصال کا شکار ہونے والے ان ''غیر ملکیوں'' کے دکھ کو سمجھا جا سکے، جو اب تک بڑی خاموشی کے ساتھ مطلق العنانی کے امریکی اور مقامی دباؤ کو برداشت کرتے چلے آئے ہیں، اس پروگرام میں سوالات ہمیشہ اس نکتہ پر مرکوز رہے ہیں کہ موجودہ بحران سے نمٹنے کا کیا طریقہ ہے اور اس طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی رہی کہ سفید فام اور باقی دنیا سے ہٹ کر بھی ہر جگہ نئے جہاں روشن ہو رہے ہیں اور ان جہانوں کو سمجھنے کی کوشش بھی ہو رہی ہے۔ جغرافیائی سیاست، فرقہ وارانہ بدامنی، اسلام کے احیا اور طاقت کے توازن کے متعلق عقل و دانش کی باتیں سننے اور جاننے کی جبلی خواہش پیدا ہو چکی ہے، یہ وہ دباؤ تھے جن کے اندر میک نیل اور لہرر کو خود بھی کام کرنا پڑتا تھا اور پتا نہیں یہ بات اچھی تھی یا بری کہ حکومت اسی طرح کے دباؤ کے تحت کام کرتی ہے۔

اس صحافت نے جو حد سے زیادہ محتاط ہے اور اس نے ایران کو اپنے آپ پر طاری کر رکھا ہے، اس نے ایک عجیب ماحول بنا دیا ہے، اس ماحول میں ہم آئی ایف سٹون (I.F.Stone) کے مضمون ''اپنے موقف کی حمایت کا متلاشی شاہ'' (A Shah Lobby Next) کو لیتے ہیں یہ مضمون اس نے 17 جنوری 1979ء کو لکھا اور 22 فروری کو اسے نیو یارک ریویو آف بکس نے شائع کیا، اس مضمون میں اس نے بتایا ہے کہ شاہ کیونکر اپنے ''ان طاقتور دوستوں کو'' اپنے گرد جمع کر سکتا ہے، جن میں چیز مین ہیٹن بینک (Chase Manhattan Bank) سے اسلحہ کے صنعت کار تک، تیل کے ٹرسٹ، سی آئی اے اور ''بھوکے دانشور'' بھی شامل ہیں، لیکن اب جبکہ شاہ ''بذات خود یہاں موجود ہیں'' تو کئی احکامات ہمیں اپنی طرف کھینچ سکتے ہیں، اس ترغیب کے باوجود ہمیں اب تک یہ بات سمجھ لینی چاہیے تھی مگر ہم نے نہیں سمجھی کہ ہمیں ایران کی اندرونی سیاست سے باہر رہنا چاہیے، اس لیے بہت جلد حالات ہمیں یہ بات سمجھا دیں گے کہ ایران کی سیاست کو اپنی سیاست سے دور رکھنا ہمارے لیے

کتنا بہتر تھا''۔ ایسا کرنا کیوں ضروری ہے؟ سٹون اس کے جواب میں اپنی پر اسرار پیشین گوئیوں کو یوں سامنے لاتا ہے کہ ''اگر ایران کی نئی حکومت نے اپنے مطالبات پیش کر دیے تو کیا ہوگا...... اگر اس نے بیرونی اثاثوں، بینکوں میں شاہ کے اکاؤنٹس اور پہلوی فاؤنڈیشن کی ملکیت کا دعویٰ کر دیا تو کیا بنے گا؟ اگر اس نے شاہ پر ملک کو لوٹنے کا الزام عائد کر دیا اور ان پر مقدمہ چلانے کے لیے ان کی واپسی کا مطالبہ کیا تو کیا ہوگا؟ اگر ایران کی نئی حکومت نے شاہ کو مطلق العنان حکمران قرار دیتے ہوئے اس پر ان اذیتوں اور ہلاکتوں کی ذمہ داری ڈال دی جو ساواک (SAVAK) کے ہاتھوں ہوئیں اور جن میں بے شمار چیزوں کا کہیں ذکر بھی نہیں آیا تو اس صورت حال میں کیا کرنا ہوگا؟

میں نے سٹون کا یہاں ذکر اس لیے کیا ہے کہ ایک تو اس نے جو پیشین گوئیاں کی تھیں وہ درست ثابت ہوئیں اور دوسرے اس لیے کہ وہ نہ تو ایران کے معاملات کا ''ماہر'' تھا اور نہ اس نے کبھی خود کو ماہر قرار دینے کی کوشش کی تھی، پھر وہ لوگوں میں اسلام کے ساتھ ہمدردی رکھنے والے کی حیثیت سے پہچانا بھی نہیں جاتا تھا، اس کے مضمون کا جائزہ لیجیے تو آپ کو اس میں اسلامی ذہنیت یا شیعوں کے شوق شہادت یا ایران کے متعلق موزوں ''معلومات'' کا کوئی احمقانہ حوالہ نہیں ملے گا، بلکہ یہی نتیجہ اخذ ہوگا کہ وہ سیاست کو سمجھتا ہے، جانتا ہے اور اس کے متعلق کوئی ایسا جھوٹ بولنے کی کوشش نہیں کرتا کہ اس معاشرے اور دوسرے معاشروں میں عورتوں اور مردوں کو کیا چیز کسی عمل پر اکساتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ بات کہ اس کو اس میں ذرہ برابر شک نہیں ہے کہ ایرانی اگرچہ یورپی امریکی نہیں ہیں، اس کے باوجود ان کی شکایات، ان کے عزائم، جائز ہو سکتے ہیں پھر وہ بھی اپنے دل میں خواہشات پالنے کا حق رکھتے ہیں، ایسے میں مغرب کی طرف سے انھیں نظر انداز کرنا بہت بڑی غلطی ہوگی، سٹون کے ہاں نرمی اور مبالغہ آرائی دونوں نہیں ملتیں، اگر سٹون فارسی نہیں پڑھ سکتا تو وہ اپنے آپ کو اس بات کی اجازت نہیں دے گا کہ وہ اپنا آپ اس فقرے میں چھپالے کہ ''فارسی زبان بڑی نفیس اور پرفریب ہے''۔

جوزف کرافٹ (Joseph Kraft)، سٹون سے مختلف ہے وہ بڑی ہٹ دھرمی کے ساتھ اپنے خیالات کا خاکہ اپنے مضمون ''طاقت کے اظہار کا وقت'' (Time for Show of Power) میں پیش کرتا ہے، یہ مضمون 11 نومبر کو واشنگٹن پوسٹ میں شائع ہوا اور اس میں اس نے جو کچھ لکھا وہ سفارتی تحفظ اور ہمارے سفارتی خون کے تقدس کے متعلق تمام معیاری آرا سے کہیں بڑھ چڑھ کے تھا، اس سے میڈیا کی کارگزاری کے تمام پہلوؤں پر روشنی پڑتی تھی، کرافٹ لکھتا ہے کہ شاہ کے زوال سے ''امریکا کے قومی مفادات کو کاری ضرب لگی

ہے'' کیونکہ شاہ نہ صرف امریکا کو معمول کے مطابق تیل کی ایک مقدار بڑی باقاعدگی کے ساتھ فراہم کرتا تھا بلکہ اس نے ایرانی سطح مرتفع میں اس پر عمل درآمد کا باقاعدہ ایک ''شاہی فرمان'' بھی جاری کر رکھا تھا، یہ بات امریکا کے مفاد میں تھی، اس سے تیل کی آمد میں ایک باقاعدگی تھی، پھر شاہ ایران نے اس علاقے اور اس میں ''چھپے ہوئے قوم پرستوں'' کو بھی سیدھا کر رکھا تھا، اور وہ اس علاقے میں ''ہمیں'' بہت مضبوط ظاہر کرتا تھا، اتنا کہنے کے بعد کرافٹ یہ سفارش کرتا ہے کہ وہ حکومتیں جو آیت اللہ سے خطرہ محسوس کرتی ہیں، ان کے تحفظ کے لیے کوئی ایسا موقع تلاش کرنا چاہیے، جس میں کسی غلطی کے بغیر، بالخصوص دشمن کو خبر ہونے سے پہلے ہی امریکا اپنی قوت کا استعمال کر سکے'' اس کے بعد وہ ''ایران کے متعلق امریکی پالیسی کی تعمیر نو'' کے اس پہلو کی طرف آتا ہے کہ اس حکمت عملی کو کس طرح انجام دیا جا سکتا ہے؟

> ایران کے اندر صوبائی مزاحمت کو پیدا کرنے کے لیے عراق کی مدد کرنا ہوگی، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ ترکی کو فوجی امداد دی جائے...... ایسے مواقع کو تلاش کرنا اور ان سے فائدہ اٹھانا اسی صورت ممکن ہوگا، جب واشنگٹن کے اندر اہم اور نازک تبدیلیاں کی جائیں، امریکا کو میرینز بھیجنے اور بم گرانے سے ہٹ کر بھی اپنے اندر کچھ دوسری نوعیت کے اقدامات کی صلاحیت پیدا کرنا ہوگی، اسے در پردہ مداخلت کی اس صلاحیت کو پھر سے تیار کرنا ہوگا جسے چند سال پہلے خود ہی ختم کر دیا گیا تھا۔

کرافٹ کے اس مضمون سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ ایرانی انقلاب کو کسی صورت قبول کرنے کو تیار نہیں ہے، اس کی نظر میں یہ واقعہ پیش ہی نہیں آیا، اس لیے اس سے جڑی ہوئی ہر ایک چیز یعنی آیت اللہ، اسلام اور ایرانی عوام تک کو وہ ''نظر ثانی'' کے لائق گردانتا ہے، اور چاہتا ہے کہ اس کے قارئین اس واقعہ کو عام روش سے ہٹا ہوا یا بھٹکا ہوا سمجھیں، دوسرے الفاظ میں کرافٹ ایران اور اس کے ساتھ ساتھ امریکا کے متعلق پیچیدہ حقائق کو نظر انداز کرتے ہوئے اس فکر میں ہے کہ حقائق کے متعلق اس کا جو ذاتی نکتہ نظر ہے، اسے قبول کر لیا جائے، مگر کرافٹ نے جو نکتہ نظر پیش کیا، اس کی سب سے بڑی خوبی ہی یہ تھی کہ وہ اخلاقیات سے قطعی عاری تھا، اس کی ساری سوچ ہی قوت کے گرد گھوم رہی تھی اور اس کی خواہش تھی کہ امریکا قوت کے بل بوتے پر ساری دنیا کو ''ہماری'' شرائط کے مطابق اپنے آگے جھکا لے، وہ یہ خواہش اس طرح کر رہا ہے، جیسے ایران میں پچیس برسوں کی مداخلت کے نتائج سے امریکا نے کوئی سبق ہی نہیں سیکھا، کرافٹ کا مزاج یہ ہے کہ وہ اس عمل کے دوران اگر یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ دوسروں کو اپنی حکومتوں میں تبدیلیوں کے حق سے محروم کر رہا ہے اور

جو تبدیلیاں وقوع پذیر ہوگئی ہیں، انھیں بھی مسترد کر رہا ہے تو اسے ان دونوں باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا، وہ چاہتا تھا کہ امریکا نہ صرف دنیا سے اپنی قوت، اپنی ضرورت اور اپنی بصیرت منوائے بلکہ دنیا بھی اسے اس اعتبار سے پہچانے، کرافٹ کی نظر میں اس کے سوا باقی ہر بات بے معنی تھی۔

کرافٹ کے اس نظریے کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ اگر اسے صرف بے اصولی اور خود غرضی کے دائرے میں رکھا جائے تو بھی اس سے کوئی معنی نہیں ابھرتے بلکہ یہ بھدا ہونے کے ساتھ ساتھ حقیقتوں کو شناخت نہ کرنے کی صلاحیت سے بھی بھرا ہوا معلوم ہوتا ہے، جس وقت کرافٹ اور اس جیسے دوسرے لوگ ایرانی انقلاب پر حملے کر رہے تھے، اور شاہ کو گنوا دینے پر نوحہ خواں تھے، اس وقت ایران کے حالات پل پل بدلنے والے اور غیر یقینی ہو رہے تھے، وہ عوام جنھوں نے شاہ کی حکومت کا تختہ الٹ دیا تھا، وہ اس سیاسی اتحاد میں سب سے پیش پیش تھے، جس اتحاد کے سربراہ آیت اللہ خمینی تھے، اس وقت صرف آیت اللہ خمینی کے پاس یہ اختیار، یہ روحانی اور سیاسی استحقاق تھا کہ وہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکیں، تاہم ان کے اقتدار و اختیار کی سطح کے نیچے کئی گروہوں کے درمیان اس وقت بھی کشمکش ہو رہی تھی، یقیناً اس کشمکش میں وہ علما اور رہنما بھی شامل تھے جن کے پیروکار اسلامی ری پبلکن پارٹی کے پرچم تلے منظم ہوئے تھے، اس کشمکش کے درمیان میں آزاد خیال تھے جن میں سب سے آگے آگے بازرگان تھے، پھر آزاد خیال اور بائیں بازو کی جماعتوں اور شخصیتوں کا ایک اتحاد قائم ہوا، اور اسی اتحاد سے بنی صدر ابھر کے سامنے آئے، ان کے علاوہ غیر اسلامی بایاں بازو بھی تھا جو کئی مختلف جماعتوں اور گروہوں پر مشتمل تھا، انقلاب کے بعد فروری 1979ء سے مارچ یا اپریل 1980ء تک پھیلے ہوئے عرصہ میں ان مختلف طبقوں کے درمیان اقتدار کی کشمکش جاری رہی، اس کشمکش میں بعض اوقات بنی صدر کامیاب ہوتے معلوم ہوئے، پھر دوسرے لوگ ابھر کے آگے آ گئے، خاص طور پر موسم سرما کے آخری اور 1980ء کے موسم بہار کے ابتدائی دنوں میں وہ مذہبی رہنما جن کے قائد آیت اللہ محمد بہشتی تھے چھائے رہے، جس وقت یہ کشمکش ہو رہی تھی، اس کے متعلق امریکا میں بہت کم اطلاعات منظر عام پر آئیں، یوں ایران کو سمجھنے کا ایک بہترین موقع گنوا دیا گیا۔

پھر امریکیوں کا یہ یقین نظریاتی حدود تک پہنچ چکا ہے کہ اسلام پتھر کی ایک مورت کی طرح اور نہ تبدیل ہونے والا مذہب ہے، یہی وجہ ہے کہ ایران یا کسی دوسرے اسلامی ملک کے اندر رونما ہونے والے کسی سیاسی عمل پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی، چنانچہ جب ایران میں سیاسی کشمکش کے بعد قدامت پرست اسلامی گروپ کو کامیابی حاصل ہوئی تو اسلام کے متعلق مغرب کی سوچ درست ثابت ہوگئی، پھر جب یرغمالیوں کو

ہیلی کاپٹروں کے ذریعے رہائی دلانے کی کوشش ناکام ہوگئی اور کارٹر انتظامیہ نے یہ فیصلہ کیا کہ ایران کو کچھ عرصے کے لیے پس پشت ڈال دیا جائے تو اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی، تاہم ایسے میں امریکا نے پینترا بدلا اور بہشتی اور بنی صدر کے درمیان اقتدار کی کشمکش کی خبریں پھیلانا شروع کر دیں، اس تشہیر کا مقصد یہ تاثر قائم کرنا تھا کہ اگر بہشتی درمیان میں نہ ہوتا تو بنی صدر ایسا شخص ہے، جس کے ساتھ امریکا معاملہ کر سکتا ہے، لیکن جب 1979ء کے اواخر میں بنی صدر نے عروج حاصل کر لیا تو اسے امریکا نے یا تو قطعی کوئی اہمیت نہ دی یا اس کا ذکر بھی کیا تو نفرت بھرے انداز میں کیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ طاقت بڑی پیچیدہ چیز ہوتی ہے، یہ ہمیشہ نظر بھی نہیں آتی اور بڑی سیماب صفت ہوتی ہے البتہ جب اسے فوجی انداز میں لیا جائے تو نہ یہ سیماب صفت رہتی ہے، نہ نظروں سے اوجھل ہوتی ہے اور نہ ہی پیچیدہ رہ جاتی ہے، کرافٹ نے اس بات کا بالکل درست اندازہ لگایا ہے کہ حالات کی بعض صورتیں ایسی ہوتی ہیں جن میں طاقت کو نہ تو آسانی سے دیکھا اور نہ ہی آسانی کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے، نہ ہی دھاوا بول کر، سی آئی اے کے ذریعے کوئی تخریبی کارروائی کر کے یا کسی کو سزا دینے کے لیے حملہ کر کے، قوت کا براہ راست استعمال کیا جا سکتا ہے، البتہ اس کا بالواسطہ استعمال ممکن ہے اور اس کے لیے ''امریکی یرغمالیوں'' کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے، جنھیں اطلاعات کی اس مشینری نے جس کے وسائل لامحدود تھے بار بار پیش کیا اور اس لیے پیش کیا کہ میڈیا کو اس بات میں دلچسپی تھی کہ وہ ایک عرصے تک اپنی قوت کا اظہار کرے، میں اسے مبالغہ آرائی نہیں سمجھتا کہ ''قومی بے بسی'' کے جس احساس کا ذکر کرافٹ نے کیا ہے، اس کی حقیقت اس کے سوا کچھ بھی نہیں تھی کہ امریکی طاقت کو ایک دوسری طاقت نے عارضی طور پر اپنی گرفت میں لے لیا تھا، فوجی طاقت میڈیا کی طاقت کے آگے ماند پڑ گئی تھی، سفارت خانے پر قبضے کے بعد فوج کو اس طاقت نے روک دیا تھا جو براہ راست امریکی اختیارات سے باہر معلوم ہوتی تھی، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو اپریل کے آخر میں بزور قوت یرغمالیوں کی رہائی میں ناکامی کے بعد اس وقت سامنے آئی، جب رہائی کی ایسی تمام کوششوں کو ترک کر دیا گیا۔

لیکن میڈیا کی قوت بھی زد سے باہر نہیں تھی، میڈیا میں جو امیر لوگ طاقت کی علامت بنے ہوئے تھے انھوں نے میڈیا کی بھی حدود مقرر کر دی تھیں، لیکن یہ بات طے تھی کہ ایک ایرانی شخص نے شاہ اور امریکا سے اپنے لیے جس حد تک بھی آزادی حاصل کر لی تھی، اس کی حیثیت امریکی ٹیلی ویژن سکرین پر اس بے نام بڑے ہجوم کے ایک حصے سے آگے نہیں بڑھی تھی جس میں شامل ہو کر نہ اس کی انفرادیت رہی اور نہ اس کی

انسانی حیثیت ہی برقرار رہ سکی۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ایک بار پھر محکوم ہوگیا، تاہم ایسا شعوری طور پر کیا گیا یا نہیں مگر ہوا یہی کہ خبروں سے متعلق میڈیا نے اپنی نمائندگی کی قوت کو ایک مقصد کے حصول کے لیے استعمال کیا، یہ مقصد ہی تھا جسے ماضی میں حکومت امریکا نے حاصل کرنے کی کوشش کی تھی اور یہ مقصد ایران میں امریکا کی موجودگی کی توسیع تھا، اور اس توسیع کو ہم ایرانی انقلاب کی نفی کا نام دے سکتے ہیں، اس کا بنیادی طور پر مطلب خبریں پیش کرنا نہیں تھا، اور نہ ہی یہ مقصد یہ تھا کہ امریکا کے خارجہ تعلقات کی نئی صورت کا تجزیہ کیا جائے یا کسی اہم موڑ پر غور وفکر کیا جائے، چند تحفظات سے ہٹ کر اگر دیکھا جائے تو میڈیا کا مقصد ایران کے خلاف کسی قسم کی جنگ چھیڑنا تھا۔

دسمبر، جنوری، فروری اور مارچ 1980ء میں واشنگٹن پوسٹ نے والٹر پنکس (Walter Pincus) اور ڈین مارگن (Dan Morgan) کی تحقیقاتی رپورٹیں شائع کیں، یہ غیر معمولی رپورٹیں تھیں، ان میں ان دونوں نے امریکا کی اسلحہ ساز کمپنیوں کے ساتھ شاہ کے منافع بخش معاہدوں، پہلوی فاؤنڈیشن میں اس کے اثاثوں، اس کے جوڑ توڑ اور عوام پر اس کے ظلم و جبر کے متعلق بڑی بھاری تعداد میں ثبوت قارئین کے سامنے رکھے، ان میں سے کچھ کی تفصیل رابرٹ گراہم (Robert Graham) کی کتاب ''ایران: طاقت کا فریب'' (Iran: Illusion of power) میں ملتی ہے، امریکی میڈیا کی طرف سے بار بار جس اشتعال انگیز مزاج کا اظہار ہو رہا تھا اس میں اس طرح کے مضامین کا شائع ہوجانا بڑی بات تھی، برنارڈ نوسیسٹر (Bernard Nossiter) کا بھی 28 /نومبر 1979ء کو نیویارک ٹائمز میں ایک ایسا ہی مضمون شائع ہوا تھا جس میں (امام) خمینی کا شاہ کے ساتھ موازنہ کیا گیا تھا، یہ بات بڑی حیران کن ہے کہ کسی کو اس بات کا خیال نہیں آیا کہ ایک صدی سے اطاعت شعاری کا جو نام نہاد سلسلہ جاری تھا، اس کے پس منظر میں ایران سے متعلق امریکی پالیسی کا جائزہ لیا جائے، اس پالیسی کے تحت برطانیہ سے شروع ہوکر بہت سی قوتوں کو ایران میں غیر معمولی علاقائی، اقتصادی، سفارتی اور قانونی مراعات دی گئی تھیں، ان مراعات کو سامنے رکھتے ہوئے ہی 1964ء میں (امام) خمینی نے کہا تھا کہ ''اگر شاہ اپنی گاڑی کے نیچے کسی امریکی کتے کو کچل دیں تو انھیں اس کے لیے جوابدہ ہونا پڑے گا لیکن اگر کوئی امریکی باورچی شاہ کو کچل دے گا...... تو اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوسکے گی'' حیرت ہے کہ میڈیا میں ان مراعات پر بھی بات نہیں ہوئی، حالانکہ انھیں بڑی آسانی کے ساتھ ایرانیوں کے جذبات کی اس شدت کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیا جاسکتا تھا جو وہ صرف امریکیوں کے ہی نہیں بلکہ غیر ملکی سفارتکاروں کے لیے بھی اپنے دل میں رکھتے تھے اور جن کا اظہار وہ ان سب کو ''غیر ملکی شیطان'' کہہ کر کرتے تھے اس سے ہونا یہ تھا

کہ ان بے شمار مبصرین کا ریاکارانہ اجتماع ختم ہوجاتا جو یہ سمجھتے ہیں کہ امریکا نے ایران کے ہاتھوں دکھ اٹھائے ہیں اور امریکا معصوم ہونے کے ساتھ ساتھ ایرانیوں کے سلسلے میں ضرورت سے زیادہ فیاضی سے کام لے رہا ہے۔

اس لیے یہ بات حیران کن نہیں ہے کہ اس بحران کے ابتدائی تین ماہ کے دوران جو کچھ شائع ہوا، اس سے لوگوں کو حقائق کی بہت زیادہ سمجھ نہیں آسکی، اس عرصے میں میڈیا نے پیچیدگیوں سے مالا مال اس کہانی کی تفصیلی کوریج یا تجزیے پر توجہ دینے کے بجائے ایک موقف کو اختیار کر کے اس پر اپنے اصرار کو جاری رکھا، میں سمجھتا ہوں کہ اس معاملے میں امریکی یہ کہیں گے کہ میڈیا نے اس بات کا واضح ثبوت دیا ہے کہ ان کے پاس وہاں تک یعنی تہران تک پہنچنے کی طاقت ہے، اور ان کے اندر یہ صلاحیت بھی ہے کہ وہ ادھر ادھر سے واقعات کو جمع کر کے اگر ان کی ایک بھونڈی شکل بھی بنا دیں، تو وہ بھی چل جاتی ہے لیکن اس وقت پیچیدہ سیاست کا جو عمل جاری تھا، اس کا تجزیہ کرنے کے لیے وہاں کوئی مدد دستیاب نہیں تھی اور یقیناً کسی نے بھی بڑھ کر یہ کام کی بات نہیں بتائی ہوگی کہ میڈیا اس وقت ایک پیچیدہ اور کسی حد تک حیران کر دینے والے تاریخی عمل کی دستاویز تیار کر رہا تھا، تاہم اس سارے قصے میں یہ بات ضرور سمجھ میں آگئی کہ میڈیا کس طرح کام کرتا ہے۔

محاذ آرائی کے تجربات کی جس سنگدلانہ تصویر کشی کا میں نے اشاروں کنایوں میں ذکر کیا ہے، اس کے ساتھ ساتھ اس دورانیے میں ایران پر خبروں کے اخراجات اور ان خبروں کی ضخامت ہی دیکھنے کو ملتی ہے، اس محاذ آرائی کے دوران میں نے دس ہفتوں تک آٹھ روزناموں کا باقاعدگی کے ساتھ مطالعہ کیا، اور تین نیٹ ورکس، ٹائمز، نیوز ویک اور پی بی ایس پر گہری نظر رکھی، اس وقت یوں معلوم ہوتا تھا جیسے امریکا کا ہر بڑا اخبار ایران سے متعلق واقعات کو نمایاں طور پر پیش کر رہا ہے، اس کے ساتھ ایسے مضامین بھی شائع کر رہا ہے، جن سے ان واقعات کے ''پس منظر'' پر روشنی پڑتی ہے اور اس سے متعلق چھوٹے چھوٹے فیچر بھی لا رہا ہے، نیویارک ٹائمز کے جون کنفر نے 15 /دسمبر 1979ء کو لکھا کہ اس وقت تین سو مغربی رپورٹروں کی فوج تہران میں موجود تھی، میرے نزدیک صحافیوں کی یہ بھاری تعداد اس لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی کیونکہ ان میں سے اگر سب رپورٹر نہیں تو ان کی اکثریت فارسی سے نابلد تھی پھر ان پر بے تحاشا پیشہ خرچ ہو رہا تھا، کول ایلن (Col Allen) نے 16 /دسمبر 1979ء کو دی آسٹریلین میں یہ رپورٹ شائع کی کہ مل ملا کر تین بڑے امریکی نیٹ ورک تہران میں دس لاکھ ڈالر روزانہ خرچ کر رہے ہیں، ایلن نے اپنی اس رپورٹ میں بتایا ہے کہ بیورو چیف کے علاوہ سی بی ایس نے ''جو ٹیم متعین کر رکھی تھی اس میں 23 صحافی، ایک کیمرہ مین، آڈیو مین، فلم اور ٹیکنیکل ماہرین تھے

جن کی مدد کو بارہ ایرانی مترجم، ایک کار ڈرائیور اور گائیڈ شامل تھا'' اس ٹیم کے لیے ہوٹل میں کام کرنے کا جو مرکزی دفتر بنایا گیا تھا اس کا کرایہ چھ ہزار ڈالر ماہانہ تھا، اس کے علاوہ پینتیس اضافی کمرے لیے گئے تھے، جن میں سے ہر ایک کا کرایہ ستر ڈالر یومیہ تھا، ان کمروں میں صحافیوں، ڈرائیوروں اور مترجمین کو رکھا گیا تھا، ان اخراجات میں اگر پرائیویٹ طیاروں، ٹیلکس مشینوں، کاروں اور ٹیلیفونوں کے اخراجات بھی ڈال دیئے جائیں اور اس مواصلاتی سیارے کا خرچ شامل بھی کرلیا جائے، جسے سوڈالر فی منٹ کے حساب سے روزانہ چار گھنٹے تک استعمال کیا جاتا تھا تو لاگت کہیں سے کہیں جا پہنچتی ہے۔

بیرون ملک سفر سے واپس امریکا پہنچنے پر ورمنٹ رائسٹر نے 19 ردسمبر 1979 کو وال سٹریٹ جرنل میں لکھا کہ اخبارات اور ٹیلی وژن پروگراموں کا جو ڈھیر لگ گیا تھا انھیں دیکھنے سے یہ ثابت ہوا کہ:

> اتنی وسیع کوریج کے باوجود میں ایرانی بحران کے متعلق جس قدر جانتا تھا، میری اس معلومات میں اس کوریج سے بہت کم اضافہ ہوا، گھر پہنچ کر میں نے جب اپنے آپ کو ایران کے متعلق ٹیلی وژن، ریڈیو اور اخبارات کی کہانیوں کی اونچی اونچی اٹھتی ہوئی لہروں میں گھرا ہوا پایا تو انھوں نے مجھے حیران اور پریشان کردیا، اخبارات بڑی بڑی سرخیوں کے ساتھ لمبی لمبی کہانیاں شائع کر رہے تھے اور ٹیلی وژن نے اپنی شام کی خبروں کا زیادہ تر حصہ اسی موضوع کے لیے وقف کردیا تھا، یہ سلسلہ یہیں تک نہیں تھا بلکہ ہر رات وہ خصوصی پروگرام بھی پیش کیے جاتے تھے جنھیں ڈوبتی شام کے پروگرام کہا جاتا تھا، اور ان پروگراموں سے ہی مجھے یہ خیال آیا کہ اس واقعہ کو لے کر خبروں کا میڈیا، ایران کو کچھ زیادہ ہی مار دینے میں مصروف ہوگیا ہے۔

بات ایک کہانی کی تھی، جس کی اہمیت بہت نمایاں ہوچکی تھی اور ایک ایسا ردعمل ابھر رہا تھا جس نے...... اس کہانی کو مؤثر بنانے کے لیے الفاظ کا ڈھیر لگا دیا تھا، مگر لفظوں کے ڈھیر تو معلومات کا متبادل نہیں ہوتے اور نہ معلومات اس ڈھیر کے مطابق ہوتی ہے، اگر حقیقت کی نظر سے دیکھیں تو اس ڈھیر میں خبر کہیں نہیں تھی صرف لفاظی ہی لفاظی تھی۔

یرغمالیوں کے حساب سے ایک گنتی بھی جاری تھی اٹھائیسواں دن...... اڑتیسواں دن...... چالیسواں دن، اور یہ گنتی کوئی معنی نہیں رکھتی تھی سب دن ایک جیسے تھے اور زیادہ تر دنوں میں اس سے مختلف کوئی بات سامنے نہیں آتی تھی جس کی رپورٹ

پہلے سے ہی نہ کی جاچکی ہو۔

شاید رائسٹر بھی خبروں کی یکسانیت کے متعلق نہیں بلکہ ان مفروضوں کے متعلق اپنے ردعمل کا اظہار کر رہا تھا، جو غیر اطمینان بخش ہونے کے ساتھ ساتھ تنگ نظری سے بھی پُر تھے اور بڑی جلدی اپنا اثر کھو بیٹھتے تھے، ایسے رپورٹروں یا ماہرین پر کتنی دیر تک تکیہ کیا جا سکتا ہے جو بجا طور پر یرغمالیوں کے بارے میں فکرمند ہوں، جنھیں غیر متوازن حالات نے مشتعل کر رکھا ہو، شاید انھیں اسلام پر غصہ بھی آرہا ہو، اس صورت حال میں ان سے تازہ معلومات، خبروں اور تجزیوں کی توقع کیونکر کی جا سکتی ہے؟ اگر کسی کو 18 رنومبر کا شکاگو ٹریبون پڑھنے کا موقع ملا ہو تو اس میں اسے جیمز یوئنگر (James Yuenger) کا ایک طویل مضمون نظر آئے گا، اس مضمون میں اس نے ان ماہرین کے حوالے دیے ہیں جو کہتے ہیں کہ ''یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ جس پر دانشمندی کے ساتھ گفتگو کرنا ممکن ہو'' یا یہ کہ ایرانی ''شہادت کے بھوکے'' ہیں اور قربانی کے بکروں کی تلاش میں رہنا، ان کی فطرت ہے''۔ اسی مضمون کو پڑھنے کے بعد اگر اس کے ایک ہفتے بعد کا ٹائمز یا نیوز ویک اٹھا کر دیکھا جائے، نیویارک ٹائمز کے فیچر ملاحظہ کیے جائیں تو اس قسم کی معلومات بار بار سامنے آتی چلی جائیں گی کہ ایرانی وہ شیعہ ہیں، جو شہادت کی خواہش کرتے ہیں اور جن کی رہنمائی وہ بے عقل (امام) خمینی کر رہا ہے جو امریکا سے نفرت کرتا ہے، جس نے شیطانی جاسوسوں کو تباہ کردینے کا عزم کر رکھا ہے اور جو کسی طرح کے سمجھوتے کے لیے تیار نہیں، ان مضامین میں اسی طرح کی دوسری باتیں بھی ملیں گی، جن سے یہ سوال پیدا ہوجائے گا کہ کیا ایران میں سفارت خانے پر قبضے سے ایسے واقعات رونما نہیں ہورہے تھے، جو چیزوں کو روشن اور نمایاں کر کے ہمارے سامنے لے آتے ہیں؟ کیا ایران کی تاریخ یا معاشرے پر لکھنے اور بولنے کے لیے کوئی بات ایسی نہیں ہے جسے سامنے لا کر یہ ثابت کیا جا سکے کہ ایران حقیقت میں جنونی ہے اور بلاوجہ شریف امریکا پر لعن طعن کر رہا ہے؟ سب سے بڑھ کر یہ سوال اٹھتا ہے کہ امریکی حکومت تو یہ چاہتی تھی کہ امریکی عوام اس کی اس پالیسی کی تائید میں ''متحد'' ہوجائیں کہ یرغمالیوں کو غیر مشروط طور پر رہا کیا جائے؟ ایسے میں کیا پریس کی صرف اسی قدر دلچسپی تھی کہ خبروں کو ان کے صحیح تناظر میں پیش کرنے کی بجائے وہ امریکی حکومت کے موقف کی حمایت پر ڈٹ جائے، کہ یرغمالیوں کی رہائی غیر مشروط ہونی چاہیے، امریکی حکومت کے اس مطالبے کا ہاورڈ کے راجر فشر (Roger Fisher) نے بڑا خوبصورت تجزیہ کیا ہے، اس سلسلے میں اس کا مضمون 3 ردسمبر کو ٹوڈے شو (Today Show) میں شائع ہوا اس میں وہ لکھتا ہے کہ یہ مطالبہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ امریکا کی دلچسپی یرغمالیوں کی رہائی میں نہیں بلکہ اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ طاقتور ثابت کرنے میں ہے۔

اگر چہ یہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں ہے پھر بھی کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ حکومت اور میڈیا ایک دوسرے کے مخالف ہو گئے ہیں، مثال کے طور پر جب این بی سی نے گیلی گوس (Gallegos) کا انٹرویو استعمال کیا تو اس پر حکومت نے اسے تنقید کا نشانہ بنایا اور اس واقعہ نے کافی ہلچل پیدا کر دی، حکومت کی مخالفت یا حمایت میں بولنے والوں کی طرف سے جب اکثر و بیشتر ایک ہی بات کو بار بار دہرایا جاتا ہے تو اس سے ایک تناؤ کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، جیسا کہ جارج بال نے میک نیل، لہرر رپورٹ میں 12 دسمبر کو کہا کہ ''دنیا میں ابلاغ کے سب سے بڑے نیٹ ورک، حقیقت میں ایران کی نام نہاد حکومت کی خدمت انجام دے رہے ہیں'' اور اسی موضوع سے متعلق یہ بات سامنے آتی ہے کہ شہادتوں، بیانات، نشر ہونے والے اعلامیوں کو غیر مؤثر کرنے کا ایک سلسلہ جاری ہے، جب یہ شائع ہوتے تھے یا ان میں ردوبدل کر کے انھیں پیش کیا جاتا تھا یا میڈیا ان کی یوں تصویر کشی کرتا تھا کہ فلاں فلاں جب گفتگو کرتا ہے تو اس بات کا پتا چل جاتا ہے کہ اسے سکھایا، پڑھایا گیا ہے یا یہ کہا جاتا کہ ایکس اور وائی ایرانی پروپیگنڈہ کر رہے ہیں یا وہ خطرناک دشمن ہیں، شکاگو ٹریبون کے لیے لکھتے ہوئے 22 نومبر کو جیمز کوٹس (James Coates) نے کہا کہ ''اسے سرکاری افسروں سے پتا چلا ہے کہ تہران کے امریکی سفارت خانے میں جن امریکیوں کو یرغمال بنا کر رکھا گیا ہے، وہ اسی طرح کے نفسیاتی دباؤ سے گزر رہے ہیں، جس سے کوریا اور ویت نام کی جنگ کے دوران امریکی جنگی قیدیوں کو گزار کے ان کا ''برین واش'' کیا گیا تھا، بعد میں امریکی حکام نے اس بات کا اعتراف کیا کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی تاہم ''کچھ یرغمالیوں نے اپنی رہائی کے بعد جو بیانات دیے تھے ان بیانات نے انھیں تشویش میں مبتلا کر دیا تھا'' لوئس ٹم رنگ (Lois Timnick) نے 26 نومبر کو لاس اینجلس ٹائمز کے لیے یہ رپورٹ تیار کی کہ ایک ماہر کے مطابق ''دنیا اس بات کی توقع کر سکتی ہے کہ انھیں یرغمالیوں کے ایسے ٹیپ شدہ انٹرویو دیکھنے اور سننے کو ملیں گے، جس میں وہ اپنے ہر قسم کے برے اعمال کا اعتراف کریں گے اور ایسے بیان دیں گے، جو نہ صرف ان کے لیے بلکہ امریکا کے لیے بھی نقصان دہ ہوں گے''۔

اسی طرح کے اندرونی جھگڑوں کا ایک اور نمونہ سینیٹر کینیڈی کی ذات پر حملہ ہے، یہ حملہ نیویارک پوسٹ نے پانچ دسمبر کو اس عنوان کے تحت کیا کہ ''ٹیڈی تہران کا تر نوالہ ہے'' (Teddy is the toast of Tehran) اور یہ کردار کشی صرف اسی لیے کی گئی کیونکہ سینیٹر کینیڈی (Senator Kennedy) نے حکومت اور میڈیا کے خیالات سے مطابقت کرنے کے بجائے بالکل مختلف نظریات پیش کیے تھے، اسی طرح ایوان نمایندگان کے رکن جارج ہنسن (George Hansen) کی بڑی بے رحمی سے کردار کشی کی گئی اور ٹیپ اونیل (Tip O'Neill) نے اس پر جو الزام

لگائے تھے ان کو درست ثابت کرنے کے لیے اس کے ماضی کا تمام ریکارڈ دوبارہ شائع کر دیا گیا۔

میں یہ بات نہیں کہہ رہا کہ میڈیا اور حکومت کے درمیان براہ راست تصادم ہوتا رہا ہے اور نہ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ ایران میں جو بھی بات پیش کی جاتی تھی، اسے ان نظریاتی بندھنوں کے پیش نظر بگاڑ دیا جاتا تھا جن کا میں تذکرہ کرتا رہا ہوں، یقیناً میں اس پر بھی یقین نہیں رکھتا کہ یرغمال بنانے کا جو واقعہ ہوا ہے اسے معاف کرنے کا بھی کوئی طریقہ موجود ہے، اس بات کو اقوام متحدہ میں (امام) خمینی کے سفیر منصور فرہنگ نے 5 نومبر کو میک نیل، لہرر رپورٹ میں تسلیم کیا تھا، لیکن چند ماہ بعد اس نے اپنے بیان سے انحراف کر لیا تھا، تاہم اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ ایران میں جاری انقلاب کی جو پیچیدہ اور اثر انگیز صورت ہے، اس کا بھرپور تجزیہ کرنے میں یرغمالیوں کا بحران بھی کوئی مؤثر کردار ادا نہیں کر سکا، تاہم اس سفارت خانے پر قبضے سے ایرانی معاشرے کے ان افراد کے مقاصد کو ضرور تقویت حاصل ہوئی جو رجعت پسند ہیں، اب جبکہ عراق کے ساتھ جنگ کی بدولت ایران کی اندرونی سیاست کے لیے یرغمالیوں کا مقصد مفید نہیں رہا اور یہ بحران اختتام کی طرف بڑھ رہا ہے تو ایک نئی کیفیت ابھرنا شروع ہو گئی ہے، میں یہ کہہ رہا ہوں کہ جس دنیا میں ہم رہ رہے ہیں وہ بہت پیچیدہ اور بڑی مختلف ہو گئی ہے اور اس بات کا بہت زیادہ امکان ہے کہ اب یہ غیر روایتی حالات پیدا کرتی رہے گی، یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ حالات و واقعات ایک قوم کی حیثیت سے امریکا کے لیے پسندیدہ بھی ہوں لیکن یہ یا تو امریکی قوت کو مانیں گے یا اس کی مخالفت کرنے والوں کی صف میں آ جائیں گے، ان سے مفر تو ممکن نہیں اس لیے امریکیوں کی تمام تر توجہ اس بات پر مرکوز ہے کہ ''اسلام'' امریکیوں کے حق میں ہے یا ان کا مخالف ہے مگر اب حالات نے جو رخ اختیار کر لیا ہے، اس میں یہ جاننا بھی کوئی معنی نہیں رکھتا، حالات اس نہج پر آ گئے ہیں کہ اگر امریکا نے دنیا بھر کے غیر ملکیوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے کے انداز کو ترک نہیں کیا، تو یہ انداز امریکا اور باقی ماندہ ہٹ دھرم انسانوں کے درمیان تصادم کو یقینی بنا دے گا، اس طرح ہنٹنگٹن سٹائل میں سرد جنگ کو جاری رکھنے والی پالیسی ناقابل یقین حد تک دنیا کے بڑے حصے کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی، میرے نزدیک اس پالیسی کو ''مغربی طرز حیات'' کی عملی وکالت قرار دیا جا سکتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ میں اس نتیجے پر بھی پہنچتا ہوں کہ مغربی طرز حیات کی یہ خو بو نہیں ہے کہ دنیا میں اپنے مقام کی صحیح تصویر کو قائم کرنے کے لیے وہ اشتعال اور تصادم کا ماحول بنائے رکھے۔

میں یہ سوچتا ہوں کہ اب وہ موقع آ گیا ہے کہ میں نے جسے دنیا بھر میں ابھرتی ہوئی نئی سیاسی صورت حال قرار دیا تھا اور ایران نے جسے پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے، اس صورت حال کا ایک مختصر

جائزہ لیا جائے جو یوں بنتا ہے کہ کچھ لوگ امریکا کو ایک زوال پذیر طاقت سمجھتے ہیں، میرے نزدیک ایسا نہیں ہے بلکہ میں یہ کہوں گا کہ دنیا کا سیاسی شعور پہلے سے زیادہ ہو گیا ہے، اس لیے اب یہ بہت کم ممکن رہ گیا ہے کہ کوئی ملک اس پر آمادہ ہو جائے کہ اسے نوآبادی بنا لیا جائے یا ایسے اتحادی کا درجہ دے دیا جائے جو کسی معاملے میں اپنی فہم وفراست سے کام ہی نہ لے، میری اس بات کا بین ثبوت آج کا ایران، ترکی اور مشرقی یورپ ہیں، امریکا نے ایران کے ساتھ تجارت پر جو پابندی عائد کی ہے، اس یکطرفہ اقدام کو ان میں سے کوئی بھی قبول کرنے کو تیار نہیں ہے، اس سے بڑھ کر یہ کہ اگر اس بات پر یقین کرنے کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے کہ افغانستان کے عوام کی یہ خواہش تھی کہ سوویت یونین ان پر حملہ کرے تو اسی طرح یہ بات بھی درست نہیں ہو سکتی کہ امریکا شاہ کی جو حمایت کر رہا تھا اس پر ایرانی خوش تھے، میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ نہ صرف غلط بلکہ احمقانہ بات ہے کہ ''اسلام'' کو ایک بلاک کے طور پر لیا جائے اور اسی طرح یہ بھی ایک بڑی سیاسی غلطی ہوگی کہ ''امریکا'' کو ایک پیچیدہ نظام کے بجائے ایک مجروح شخص کے طور پر لیا جائے، اس لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہمیں دنیا کے متعلق کم از کم جاننے کے بجائے زیادہ سے زیادہ جاننے کی ضرورت ہے اور اس کے نتیجے میں ہمیں یہ توقع کرنا چاہیے کہ رپورٹنگ کا معیار زیادہ بہتر ہو، اطلاعات زیادہ عمدگی کے ساتھ فراہم کی جائیں اور جو کچھ واقع ہو رہا ہے اس کو آج کی نسبت زیادہ حساس اور صحیح طریقے سے بیان کیا جائے، آج کے جس طرز عمل کو ہم دیکھ رہے ہیں یہ 1991ء کی خلیج کی جنگ اور 1993ء کے اوسلو معاہدے کے دوران اختیار کیا گیا تھا، یہ وہی طرز عمل ہے جس میں بنیادی خبر کو لے کر اس میں بحیثیت مجموعی مسلم اور عرب دشمنی کی امریکی خارجہ پالیسی کو سمو دیا جاتا تھا، لیکن اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ ایک معاشرے میں کام کرنے والے، ان مردوں اور عورتوں کو جن کا تعلق خبروں سے ہے انھیں معمول کے مطابق جو حاصل ہو رہا ہے وہ اس سے آگے نکلیں، ان میں جو لوگ آتے تھے ان میں سے (الف) ایک تو وہ تھے جن کی غیر مغربی دنیا کے متعلق معلومات کا تعین، بحرانوں سے ان کی واقفیت اور ان کے لیے نسلی گروہ کی غیر مشروط حمایت کرتی تھی، (ب) دوسرے وہ تھے جنھیں یہ صلاحیت حاصل تھی کہ وہ جلدی میں بیان کی گئی کہاوتوں اور تنگ نظری کے ساتھ بیان کیے گئے ذاتی مفادات سے بڑی خوبی کے ساتھ اطلاعات کا ایک واضح ڈھانچا تعمیر کر سکتے تھے، (ج) تیسرے وہ تھے جو ان رابطوں کی تاریخ جانتے تھے جو اسلامی دنیا کے انتہائی متنوع لوگوں کے درمیان تیل اور شاہ ایران جیسے حکمرانوں کی بدولت وجود میں آئے، امریکا کے ساتھ ان کے اتحاد نے انھیں انعام میں ''جدیدیت'' اور کمیونزم کی مخالفت دی۔

ان سب سے آگے نکلنا یقیناً بہت مشکل ہوگا، اس بات کو ذہن میں رکھیے کہ امریکا کے بڑے

اخباروں اور ٹیلی وژن نیٹ ورکس کے نمائندوں کی اکثریت کو بعض اوقات ایک کہانی کے لیے بڑی جانفشانی سے کام کرنا پڑتا ہے، جس علاقے میں انھیں خبر لانے کے لیے بھیجا جاتا ہے، عموماً وہ اس علاقے کی زبان نہیں جانتے، اس علاقے سے ان کی وابستگی کا کوئی پس منظر نہیں ہوتا، انھیں ایک علاقے میں فرض کی ادائیگی کے مختصر دورانیے کے لیے رکھا جاتا ہے اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اہم اطلاعات ارسال کرنے لگتے ہیں تو انھیں وہاں سے ہٹا دیا جاتا ہے، رپورٹر چاہے کتنا ہی باصلاحیت کیوں نہ ہو اس سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ تھوڑی بہت تربیت کے بغیر اور ایران، ترکی اور مصر جیسے پیچیدہ علاقوں میں کسی قدر طویل قیام کے بغیر موزوں خبریں ارسال کر سکتا ہے، مثال کے طور پر جیمز مارک ہم (James Markham) کو لیجیے وہ بڑا لائق اور باصلاحیت رپورٹر ہے۔ 1975-76ء میں وہ ٹائمز کے لیے لبنان کی خانہ جنگی کی کوریج کرتا رہا ہے، حال ہی میں ویت نام سے آیا ہے اور مشرق قریب میں صرف ایک سال رہنے کے بعد اسے سپین بھیج دیا گیا ہے، اسی طرح جون کفنر کی تہران سے غیر حاضری میں تمام واقعہ کی ٹائمز کے لیے رپورٹنگ باری باری یا تو ہنری ٹینر (Henry Tanner) نے کی جو روم میں متعین تھا، یا نکولس گیگ (Nicholas Gage) نے کی، جبکہ مورین ہیووی (Marvine Howe) جو پہلے بیروت میں متعین تھیں اور بیروت میں رہتے ہوئے انھیں اردن، شام، عراق اور خلیج کے علاقے کی خبروں پر بھی نظر رکھنا پڑتی تھی، انھیں پرتگال سے بیروت لایا گیا تھا اور ایک سال بعد 1979ء کے موسم خزاں میں انھیں انقرہ منتقل کر دیا گیا، اگر اس صورت حال کو تمام اشاعتی اداروں پر منطبق کر کے دیکھا جائے تو یہ بات بڑی واضح طور پر سامنے آ جاتی ہے کہ اس طرح یہ ادارے اپنے آپ کو خود نقصان پہنچا رہے ہیں، لی مونڈے کے پاس ایرک رولیو (Eric Rouleau) ہیں جنھیں عربی پر دسترس حاصل ہے اور اس علاقے میں تقریباً ایک چوتھائی صدی سے رپورٹنگ کر رہے ہیں، مانچسٹر گارڈین کے پاس ڈیوڈ ہرسٹ (David Hirst) ہیں انھیں بھی یہ زبان آتی ہے اور انھیں اس علاقے کا کم از کم تیس سال کا تجربہ ہے دوسری بہت سی صورتوں میں بھی امور خارجہ سے متعلق یورپی صحافت اپنے ہم عصر امریکا سے کمزور نہیں ہے، نیٹ ورک رپورٹر کو مناسب رپورٹنگ کے لیے جن رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان میں ایک تو یہ ہوتی ہے کہ اسے زیادہ چل پھر کر کام کرنا پڑتا ہے، پھر اس کے لیے لازم ہوتا ہے کہ اسے مختلف علوم پر دسترس حاصل ہو۔

مجھے یقین ہے کہ مشرق اور ''اسلام'' کے متعلق امریکی میڈیا پر ہمیں رپورٹنگ کی جو خامیاں نظر آئی ہیں، اگر مغربی یورپ کی رپورٹنگ کرتے ہوئے اسی انداز کو اختیار کیا جاتا تو اسے کوئی برداشت نہیں کرتا، اس کا یہ مطلب نہیں کہ رپورٹنگ کے دوران مغربی یورپ میں جو مسائل پیدا ہوئے ہیں انھیں حل کر لیا گیا ہے،

میرے لیے یہ بات سمجھنا بڑا دشوار ہے کہ ریڈیو، ٹیلی وژن اور اخبارات کے منتظمین نے اس بات پر کیوں اتفاق کرلیا ہے کہ ایک رپورٹر جسے ایک علاقے کا اچھا خاصا تجربہ ہے، اس کی جگہ نئے آنے والے رپورٹروں کو قابل اعتبار سمجھا جاتا ہے، ایران کے بحران کے دوران ہم نے اپنی آنکھوں کے سامنے نیٹ ورک کے لائق رپورٹروں میں سے مارٹن ڈین(Morton Dean)، جوں کو چران(John Cochran) اور جارج لیوئس(George Lewis) کو اس لیے ''ماہرین'' کا درجہ حاصل کرتے ہوئے نہیں دیکھا کہ انھیں صورت حال کا دوسروں سے زیادہ علم تھا بلکہ انھیں یہ مقام اس مفروضے پر عطا کیا گیا کہ اگر یہ ایک جگہ زیادہ دیر تک ٹھہریں گے تو آپ اس جگہ کو زیادہ بہتر جان لیں گے اور اچھی طرح بیان کرسکیں گے؟ حقیقت یہ ہے کہ جو رپورٹ ہمارے سامنے ہوتی ہے اس میں رپورٹر کوئی تنقیدی جائزہ پیش نہیں کرتا بلکہ اس کی حتی المقدور کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی طرح اپنی رپورٹ مکمل کرلے......مثال کے طور پر این بی سی پر رات کو نیویارک سے جان چانسلر(John Chancellor) اور تہران سے کو چران اور لیوئس ایک مباحثے میں حصہ لیتے تھے جس میں تجزیے اور حقیقی خبروں کو پیش کرنے پر بہت کم توجہ دی جاتی تھی، صحت مند رپورٹنگ......میڈیا کی کبھی خصوصیت نہیں رہی......عموماً صحت مند رپورٹنگ کو رپورٹ جلدی سے نشر کردینے کے لیے قربان کردیا جاتا تھا اور اس بات کا قطعاً کوئی خیال نہیں رکھا جاتا کہ رپورٹ میں کوئی نئی بات پیش کرنے کے لائق ہے بھی یا نہیں۔

صرف یہی نہیں بلکہ دوسرے دباؤ بھی بڑا اہم کردار ادا کرتے ہیں، اخباری صحافی یہ جانتے ہیں کہ ٹیلی وژن نیٹ ورک کے نمائندے ہر رات ایسی کہانیاں پیش کرسکتے ہیں، جو دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کر لیں، چنانچہ وہ سوچتے ہیں کہ وہ قارئین کو اپنی طرف کیسے متوجہ کرسکتے ہیں، یہ ذہنی کشمکش انھیں حقیقی کوریج صحت مند رپورٹنگ اور بامعنی نمایاں خبر سے ہٹا دیتی ہے، چنانچہ اخباری اور تصویری صحافت میں ایک ایسا مقابلہ سامنے آجاتا ہے، جس میں اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ شیعہ کے اسلام میں کیا چیز بازاری ہے اور (امام) خمینی کے کون کون سے نفسیاتی پہلو نمایاں ہیں، عجیب بات ہے کہ یہ مقابلہ یہیں تک محدود رہتا ہے اور ایران میں دوسری اہم شخصیات اور قوتوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی، اس سے بھی زیادہ اہم......اور چیزوں کو مسخ کردینے والی بات...... یہ حقیقت ہے کہ میڈیا کو ایک سفارتی پائپ لائن کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے، یہ ایک ایسا پہلو ہے جسے ایران کی کہانی کے عنوان کے تحت لکھے گئے مضمون میں موضوع بحث بنایا گیا ہے، یہ مضمون 24/دسمبر 1979ء براڈ کاسٹنگ میگزین میں شائع ہوا، اس میں بڑی سوچ بچار کے بعد یہ بات لکھی گئی ہے کہ ایران اور امریکا دونوں ملکوں کی حکومتیں اس بات کو اچھی طرح سمجھتی ہیں کہ ٹیلی وژن پر جو بیانات جاری کیے جاتے ہیں،

وہ صرف ان لوگوں کے لیے نہیں ہیں جو خبریں سننا چاہتے ہیں بلکہ حکومتوں کے لیے بھی ہیں، ایک طبقے یا دوسرے طبقے کے ارکان کے لیے بھی ہیں اور نئے یا ابھرتے ہوئے سیاسی حلقوں کے لیے بھی، اس میں ''خبر کیا ہے کا فیصلہ کرتے ہوئے'' مضمون پر اس کا کیا اثر ہوا اس کا جائزہ کسی نے نہیں لیا، تاہم میرا خیال ہے کہ عموی طور پر اس بات کے احساس نے ہی امریکا کے رپورٹروں کو اس محدود اور مختصر انداز میں سوچنے پر مجبور کردیا جسے ''ہم'' بمقابلہ ''وہ'' کے عنوان سے پہچانا جاتا ہے، تاہم گروہی احساس کی اس تصویر نے رپورٹروں کی صلاحیتوں کی کمزوری اور بیان کی صحت سے غفلت کو کم کرنے کے بجائے مزید بڑھا دیا ہے۔

باب دوم

غیر مصدقہ اور پوشیدہ مفروضے

(حصہ سوم)

غیر صحت مند رپورٹنگ بہت بری چیز ہے مگر میری نظر میں اس سے بھی بری بات یہ ہے کہ وہ حالات جن میں کوئی تغیر و تبدل نہ ہو، جوں کے توں رہنے والے ہوں، اُن کے متعلق مفروضوں کی بنیاد پر رپورٹنگ کی جائے، جنوری، فروری 1979ء میں کولمبیا جرنلزم ریویو (Columbia Journalism Review) نے جو شمارہ جاری کیا اس میں ایک مضمون یہ بھی تھا کہ شاہ کی حکومت کے متعلق امریکی میڈیا نے کس طرح رپورٹنگ کی، اس غیر معمولی اور فہم و فراست سے پُر مضمون میں مصنف نے بڑے بڑے مؤثر انداز میں یہ ثابت کیا تھا کہ ''پریس نے بڑی حد تک شاہ کی اِس فرضی دلیل کو قبول کر لیا تھا کہ اُس کے عوام نے اپنے نظریاتی ذخیرے میں جو بہترین اضافہ کیا ہے وہ مذہبی انتہا پسندی اور کمیونزم ہے'' سائنس میگزین (Science Magazine) نے بھی اپنی 14 ردسمبر 1979ء کی اشاعت میں فہم و فراست کی ناکامی پر تبصرہ کیا ہے لیکن اس کی ذمہ داری زیادہ تر دفاع اور جاسوسی کے اداروں پر ڈال دی ہے، اس موضوع پر ہرمن نکل (Herman Nickel) نے بڑا پُر مغز مضمون لکھا اور اس میں اس بات کو اچھی طرح کھول کر بیان کیا ہے، یہ مضمون 12 رمارچ 1979ء کو فارچون (Fortune) میں شائع ہوا تھا، نکل نے بڑی دانشمندی کے ساتھ جو نتیجہ اخذ کیا تھا اُس پر کسی نے کوئی توجہ نہیں دی، اُس کا کہنا تھا کہ ایران میں امریکا کی ناکامی کا تعلق ہتھکنڈوں کی خامی سے نہیں ہے بلکہ اِس کی جڑیں ماضی میں بہت گہرائی تک چلی گئی ہیں۔

منصف مزاجی اور صبر و تحمل کے ساتھ اِن جڑوں کی تلاش ضروری ہے اور یہ ایک ایسی تحقیق کا روپ دھار سکتی ہے جو مستقبل میں اِن کے کسی سنجیدہ استعمال کو ممکن بنا دے، یہ بات بار بار کہنے کی نہیں ہے کہ جب اس مشق کو اختیار کیا جائے گا تو اس سے امریکا خود احتسابی کے عمل سے دوچار ہو جائے گا، اس لیے کوشش یہ ہونی چاہیے کہ اس مشق کا رخ جذباتی اور فیصلہ کن انداز، اس تفرقے کی طرف نہ مڑ جائے کہ ''چین کو کس نے کھویا تھا؟'' یہ سوال 1940ء اور 1950 کی دہائیوں کی سیاست کے لیے مسموم ثابت ہو چکا ہے، اسی طرح

ایران سے متعلق امریکا کی پالیسیوں کی حالیہ تاریخ بھی ایک ایسی داستان نہیں ہے، جو اُن دانشمندوں کو معلوم ہو سکے، جو ایک مدت سے نظر انداز کر دیئے گئے ہیں، اور اب جن کا یہ استحقاق بن گیا ہے کہ وہ اپنی آواز بلند کریں اور انگلی اٹھائیں، لیکن ناکامی کا پھیلاؤ اتنا زیادہ ہے کہ اس کی ذمہ داری سے کسی کو باہر نہیں رکھا جا سکتا، اور یہ ضروری ہے کہ اس ناکامی پر سب شرمندہ ہوں اور اس بات کا اعتراف کریں کہ ایران پر حکمرانی کے لیے شاہ کی ذاتی قوت کو بڑھا چڑھا کے پیش کرنا اندازے کی بڑی سنگین غلطی تھی، یہ غلطی صرف ری پبلیکن سے نہیں بلکہ ڈیموکریٹس سے بھی سرزد ہوئی، اور اس غلطی کی انتہا یہ تھی کہ وائٹ ہاؤس کی کونسلوں سے ہو کر کانگریس کے ہال تک شکوک و شبہات سے پُر اور مخالفت کی آوازوں کو سننے والا کوئی نہیں تھا۔

اس وقت ایک ایسی بحث شروع کرنے کی ضرورت ہے جس میں ایک دوسرے پر اخلاقی کمزوریوں کا الزام لگانے کے بجائے اُن سیاسی امور پر بات کی جائے جو تعمیری ہوں اور یہ بحث اس آگاہی کے ساتھ شروع ہونی چاہیے کہ دوسری اقوام ''ہماری'' ملکیت نہیں ہیں، اس لیے اُن کے ''کھو جانے'' کا غم لا حاصل ہے، ویت نام کا المیہ اسی صف میں آتا ہے اور اس سے امریکا کو یہ سبق سیکھنا چاہیے تھا کہ جو قدیم ملک اپنی تاریخ، اپنی ثقافت، اپنے مذہب سے گہری وابستگی رکھتے ہیں، اُن کے لیے راستوں کا تعین کرنا امریکا کے اختیار میں نہیں ہے اور اگر جنوب مشرقی ایشیا میں بدھ مت کا سیاسی کردار سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے تو پالیسی بنانے والے امریکیوں کا، ایران میں اسلام کے سیاسی کردار سے چکرا جانا بھی اچنبھے کی کوئی بات نہیں ہونی چاہیے۔

اس واقعہ کے ایک سال بعد بھی دوسروں کو اپنی ملکیت سمجھنے اور جوابی الزام عائد کرنے کا رویہ بدستور حاوی تھا، اس کے ساتھ ایک ستم ظریفی یہ بھی تھی کہ امریکی میڈیا بحیثیت مجموعی اِس بات کو سمجھنے سے قاصر تھا کہ جن ممالک کے متعلق امریکا کو یہ یقین ہے کہ وہ اس کے دائرہ اختیار میں آتے ہیں، اُن ممالک میں کیسے تبدیلیاں ہو سکتی ہیں، جب 1996ء میں ترکی کے عام انتخابات کے نتیجے میں ایک اعتدال پسند اسلامی جماعت برسرِ اقتدار آئی، تو ٹائمز کے دانشور تھامس ایل فرائیڈ مین (Thomas L. Friedman) نے 21 راگست 1996ء کو ''ترکی کو کس نے کھو دیا؟'' (Who Lost Turkey) پر اس طرح مضمون لکھا جیسے ترکی اور ایران ''ہماری'' ملکیت تھے جنھیں ہم نے گنوا دیا۔ ملکیت کے اس تصور کا ایک اظہار تو یہ تھا کہ ایران کے معاملے میں صحافیوں کی اکثریت رضا شاہ پہلوی کا ذکر کرتے ہوئے اُسے ''سابق شاہ'' نہیں بلکہ ''شاہ'' کہتی تھی، اس کی دوسری تصویر یوں ہے کہ 1980ء کے عشرے کے وسط تک یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ دائیں بازو کے انقلابیوں نے اقتدار پر قبضہ مستحکم کر لیا ہے؟ لیکن اُس وقت بھی ایران کے متعلق زیادہ کہانیاں مظالم اور سزائے

موت کی آ رہی تھیں اور اس ملک کے پل پل بدلتے حالات اور کھلی سیاسی کشمکش کے متعلق بہت کم لکھا جا رہا تھا، اس مرحلے پر کسی کو تو سوچنا چاہیے تھا کہ ایک عرصے تک سنگین ظلم و جبر کا شکار رہنے کے بعد، تشدد اور قید سے نجات کے جو لمحات میسر آئے ہیں، اُن میں ایسی پارٹیوں کا وجود میں آنا جو اثر و رسوخ اور اقتدار کے لیے جدوجہد کر رہی ہیں، ملک کی قومی سلامتی و بقا کے لیے کیا معنی رکھتا ہے، اِس موضوع پر اگر کوئی قلم اٹھاتا تو یہ بڑی قابلِ قدر کوشش ہوتی، ہمارے لیے یہ سمجھنا بھی بڑا ضروری ہے کہ کسی قوم کے لیے یہ باتیں کیا معنی رکھتی ہیں کہ اُس کا لیڈر ضدی اور کئی صورتوں میں غیر دلکش ہے، اُس کی سرکاری پوزیشن بھی قطعی واضح نہیں ہے، وہ مرکزی حکومت میں کوئی عہدہ حاصل کرنے میں بھی کوئی دلچسپی نہیں رکھتا، اِس کے باوجود لوگ اُس کا احترام کرتے ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ درجنوں دھڑوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مصروف رکھنے کے ساتھ ساتھ انھیں اپنے کنٹرول میں رکھنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ پھر وہ المستضعفین یعنی کمزور اور ظلم و ستم کا شکار رہنے والے لوگوں کے حقوق کے متعلق بڑی سختی اور یقین کے ساتھ بات کرتا ہے، یہ شخص کیسا ہے؟ یرغمالیوں کے بحران کے ابتدائی دنوں میں چند ایسی کہانیاں سامنے آئی تھیں جن کا زور اس بات پر تھا کہ ایران کی حکومت نئی ریاست کے منظم ہونے تک معطل رہے گی، اِسے زیادہ سے زیادہ ایک عارضی حکومت کہا جا سکتا ہے، یا یہ بات سامنے لائی گئی تھی کہ 1979ء میں زیادہ تر ایران کے اندر آئین اور حکومتی ڈھانچے کے متعلق بحث ہوتی رہی ہے، یا یہ کہا گیا تھا کہ مذہبی، سیکولر، دائیں اور بائیں بازو کی بہت سی جماعتیں بڑے شد و مد کے ساتھ مصروف کار ہیں، یا یہ بات منظر عام پر لائی گئی تھی کہ ایران میں درجنوں اخبار بڑی باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں، کچھ نے اِس طرف بھی توجہ دلائی کہ ایران میں حقیقی سیاسی مسائل موجود ہیں اور انھیں کسی طرح بھی فرقہ وارانہ، لسانی اور مذہبی خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا، یہ ذکر بھی بہت کم ہوا کہ ایران میں جس قدر آیت اللہ ہیں اور جن میں دوسروں کے علاوہ (امام) خمینی، شریعت مداری بھی شامل ہیں، اِن کے درمیان اسلامی اصولوں کی مذہبی اور سیاسی تفسیر پر اختلاف موجود ہے، یا اِس پر بھی کوئی بات سامنے نہیں آئی کہ ایران کے مستقبل کا اُن خطوط پر استوار ہونا لازمی نہیں ہے، جن کا ذکر امریکی اخباروں کے درمیانے درجے کے رپورٹر پسندیدہ اور ناپسندیدہ کے طور پر کرتے ہیں۔

یہ بات سمجھنا بہت مشکل ہے کہ جو طبقہ میڈیا کے ادارتی مضامین اور فیچر کے لیے رپورٹنگ کرتا تھا اُس نے اس تحریک کو اتنی نفرت اور اپنے شکوک و شبے کا شکار کیوں بنایا جو تحریک پہلوی خاندان کا تختہ الٹ کر ایک مختلف اور زیادہ مقبول عام گروپ کو آگے لائی تھی، یہ بات سمجھنے کے لیے ہال گلیور (Hall Gulliver) کے

مضمون ''ایران میں نئے وحشی کھلے پھرتے ہیں'' (The New Barbarians are Loose in Iran) پر نظر ڈالنی چاہیے، یہ مضمون اٹلانٹا کانسٹی ٹیوشن کے لیے لکھا گیا تھا، اور 13 نومبر 1979ء کو شائع ہوا، اس میں اُس نے صرف اُن طلبہ کو ہی نہیں جنھوں نے امریکیوں کو یرغمالی بنا رکھا تھا بلکہ ایران کے ہر فرد و بشر کو وحشی قرار دیا، اِسی طرح اگر 14 ر اکتوبر 1979ء کے نیویارک ٹائمز کے سنڈے میگزین میں یوسف ابراہیم کا مضمون پڑھا جائے تو آپ اِس بات پر یقین کر لیں گے کہ ایران کا انقلاب ناکام ہو چکا ہے اور اس وقت انقلاب کے خلاف نفرت، خوف اور ناراضگی کا ایک سلگتا ہوا لاوا ابل رہا ہے، اُس نے اپنی اس رائے کو ثابت کرنے کے لیے حکومت کے دو وزیروں کے بیانات کے کچھ حصے لیے ہیں اور اس مضمون کا بڑا حصہ ایک بینکار، ایک وکیل اور اشتہاری کمپنی کے ایک افسر کے درمیان مباحثے سے پُر کر دیا ہے۔

میری باتوں سے یہ نتیجہ اخذ نہ کیجیے گا کہ رپورٹر کی اپنی کوئی ذاتی رائے نہیں ہونی چاہیے اور اُسے اپنی یہ رائے اپنے چاہنے والوں کے سامنے نہیں رکھنی چاہیے، اپنی جگہ یہ دونوں باتیں ضروری ہیں لیکن یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ جب اپنی رائے کو ہر طرح سے ایک مکمل حقیقت سمجھ لیا جائے تو صحافت اچانک ایک ایسی پیشین گوئی بن جاتی ہے جو اپنی تعبیر چاہتی ہے، خود کو درست ثابت کرنا چاہتی ہے، اگر آپ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ایرانی انقلاب اس لیے برا ہے کیونکہ اس نے ظلم و جبر کی مخالفت کرنے کے لیے مذہبی اور سیاسی مزاحمت کے ایسے محاوروں کا استعمال کیا جو مغرب کی نگاہ میں ڈرامائی حد تک نامانوس تھے تو آپ جس چیز کو نہ صرف تلاش کریں گے بلکہ پا بھی لیں گے وہ عقل و شعور سے عاری اور ذہنی انتشار کا نمونہ ہوگی، مثلاً گو ٹریبون میں رے موسلے (Ray Moseley) کا مضمون ''انقلابی ایران کو عدم برداشت اور تصدیق کے جذبے نے اپنی گرفت میں لے رکھا ہے'' (Conformity, Intolerance Grip Revolutionary Iran) 25 ر نومبر کو شائع ہوا، جس میں وہ لکھتا ہے کہ:

> وہ لوگ جو موت کو ایک اعزاز سمجھتے ہیں وہ انتہا پسندوں کی صف میں آتے ہیں، ایران کے شیعہ مسلمانوں میں انتقام کے طور پر خون کرنے کی ہوس اور شہادت کا شوق خاص طور پر بڑا نمایاں دکھائی دیتا ہے، اُن کے اِسی مزاج کا یہ نتیجہ تھا کہ انقلاب کے دوران خود کار اسلحہ سے لیس فوجیوں کے سامنے ہزاروں غیر مسلح شہری یوں آن کھڑے ہوئے جیسے فوج اور اس کے ہتھیار ان کے لیے کوئی معنی نہ رکھتے ہوں۔

اس بیان کا ہر فقرہ ایسے مفروضوں پر مشتمل ہے جن کے متعلق کئی شدید قسم کے اعتراضات اٹھائے

جاسکتے ہیں، لیکن اِن مفروضوں کواس لیے سچ مان لیا گیا کیونکہ اِن کا تعلق اسلامی انقلاب سے تھا، اِس طرح کے مفروضے 1990ء کے عشرے میں ایران سے متعلق رپورٹوں میں ایک تسلسل کے ساتھ آتے رہے ہیں اوران کے ساتھ لبنان کی حزب اللہ تحریک کا بھی ذکر ہوتا رہا ہے، اس تحریک کے متعلق ہمیشہ یہی کہا گیا کہ اسے ''ایران کی حمایت'' حاصل ہے، بہت سے امریکی اس لیے امریکی انقلابی پیٹرک ہنری[1] (Patrick Henry) کو انتہا پسند قرار نہیں دیتے کیونکہ اُس نے کہا تھا کہ ''مجھے یا تو آزادی دو یا موت دے دو'' اِسی طرح ان فرانسیسی شہریوں کو قتل کرنے کی خواہش جنھوں نے نازیوں کا ساتھ دیا تھا، عمومی طور پر فرانسیسیوں کے کرداراور مزاج کی ترجمان نہیں ہو جاتی حالانکہ اسی خواہش کی تکمیل میں دنوں کے اندر ہزاروں فرانسیسیوں کو قتل کر دیا گیا تھا، مگراس خواہش اور اِس کی تکمیل دونوں کا اُس انداز میں تذکرہ نہیں کیا جاتا جس طرح ایران کا تذکرہ ہو رہا ہے، پھر سوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ جو لوگ فوج کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہونے کی اخلاقی جرأت کرتے ہیں انھیں کیوں اچھا سمجھا جاتا ہے؟

موسلے نے ایران پر جو حملہ کیا تھا، اُس کی حمایت میں اُسی دن بڑا جاندار اداریہ شائع کر دیا گیا، جس میں اس سے کم کوئی الزام عائد نہیں کیا گیا تھا کہ (امام) ''خمینی نے پوری دنیا کے خلاف مقدس جنگ شروع کر دی ہے'' مقدس جنگ، جسے جہاد کہتے ہیں، کے بنیادی خیال پر لاس اینجلس ٹائمز نے 12 ر دسمبر کو ایک غیر معمولی مضمون شائع کیا، یہ مضمون ایڈمنڈ بوشورتھ (Edmund Bosaworth) نے لکھا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے جہاد کے اِس مرکزی خیال نے مغربی میڈیا میں اسلام کی آمد کی انتہائی اہم پہچان کا مقام حاصل کر لیا، مغربی میڈیا نے یہ طرزِ عمل اختیار کرتے ہوئے اِس بات کو نظر انداز کر دیا کہ جہاد کے متعلق فضل الرحمٰن کا موقف یہ ہے کہ ''بعد کے زمانے میں مسلمانوں کے فقہی مکاتب فکر نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ.......... انتہا پسند خارجیوں نے جہاد کو ایمان کے ایک رکن کا درجہ دیا تھا'' بوشورتھ نے اپنے مضمون میں بلا امتیاز بے شمار تاریخی ''شواہد'' پیش کیے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جس خطے میں ترکی، ایران، سوڈان، ایتھوپیا، سپین اور ہندوستان واقع ہیں اُس کی بارہ سو سال کی سیاسی سرگرمیوں کو سمجھنے کے لیے اتنا جان لینا کافی ہے کہ ان سب کا تعلق مسلمانوں کی جہاد کی اپیل سے رہا ہے۔

1۔ پیٹرک ہنری (1736-1799) امریکی انقلاب کی ایک اہم شخصیت ہے، بڑا اچھا مقرر تھا، اس کی تقریر نے ہی ریاست ورجینیا (Virginia) کو انقلاب کا ساتھ دینے پر آمادہ کیا تھا، یہ رضا کاروں کی فوج لے کر خود برطانیہ کے خلاف میدانِ جنگ میں اترا تھا۔ (مترجم)

صحافت کا ایک انداز، جارحانہ مبالغہ آرائی بھی ہے جسے خاص طور پر ایران اور گاہے گاہے اسلام کا تذکرہ کرتے ہوئے اختیار کیا جاتا، اوراس کا دوسرا انداز معانی میں ردوبدل کرنے کا ہے، یہ انداز اکثر لاعلمی سے پھوٹتا ہے مگر اِسے ہمیشہ اُس نظریاتی دشمنی سے اخذ کیا جاتا ہے جو بمشکل چھپی رہ سکتی ہے، اِس کی عام رائج الوقت شکل یہ ہے کہ رپورٹر اصل حقائق کو اپنی طرف سے ایسی ''وضاحت سے بدل دیتا ہے، جسے قبول کیا جاسکے، سفارتخانے پر قبضے کے ابتدائی تین مہینوں میں اخبارات اور ٹیلی وژن پروگراموں نے جس کو سرسری انداز میں لیا وہ ایران کی سابق حکومت تھی، کافی لمبے عرصے تک میڈیا نے ایران کے معزول شاہ اور اُس کی غیر مشروط حمایت کی ا،مریکی پالیسی سے متعلق ایرانیوں کی شکایات کو سنجیدگی سے نہ لینے کا طرزِ عمل اختیار کیے رکھا، اِسی طرح امریکی میڈیا نے ایرانی اقتدارِ اعلیٰ کی اس خلاف ورزی کو بھی نظر انداز کر دیا جو اگست 1953ء میں ہوئی، اِس پر کرمٹ روز ویلٹ (Kermit Roosevelt) نے ''جوابی انقلاب'' (Counter Coup) کے نام سے حال ہی میں ایک کتاب لکھی تھی جسے بڑی عجلت میں واپس لے لیا گیا تھا، روز ویلٹ اس کتاب میں لکھتا ہے کہ جب سی آئی اے نے برطانیہ اور ایران کی مشترکہ تیل کمپنیوں کے ساتھ مل کر محمد مصدق کی حکومت کا تختہ اُلٹا، تو اِس واقعہ کو اِس مفروضے کی بنیاد پر کسی خاص تحقیق کے لائق نہیں سمجھا گیا کہ امریکا کو ایک بڑی طاقت کی حیثیت سے یہ استحقاق حاصل ہے کہ وہ حکومتوں کو تبدیل کر دے اور اُس ظلم و جبر کو معاف کر دے جو اُن جاہل اور غیر سفید فام لوگوں پر ہوا ہے، جارج ای گراس (George E. Gross) ماہر نفسیات کی حیثیت سے پریکٹس کرتا ہے، اُس کا ایک مضمون نیو یارک ٹائمز کے ادارتی صفحے کے سامنے والے صفحے پر 13 ر جنوری 1980ء کو شائع ہوا ہے، اس میں وہ لکھتا ہے کہ سابق شاہ کو نیو یارک آنے کی اجازت دے کر درحقیقت اُسے امریکا نے اپنی طرف سے معاف کر دیا تھا، یہ ایک ایسا عمل تھا جو ''اخلاقی اصولوں سے مطابقت نہیں رکھتا تھا'' اور جس طمطراق سے جیرالڈ فورڈ (Gerald Ford) نے رچرڈ نکسن (Richard Nixon) کو معافی دی تھی اُس سے ملتا جلتا تھا، چنانچہ اس اقدام کو ''اخلاقی حدود کے اندر فیصلہ کرنے کی ایک ایسی مجروح صلاحیت قرار دیا جاسکتا ہے جس پر قدر شناسی کو دھچکا لگا اور دوسروں کے اندر اخلاقی اشتعال پیدا ہوا''۔

اس طرح کے مشاہدے بہت کم اور کبھی کبھار سامنے آتے ہیں اور ہوتا یہ ہے کہ زیادہ تر فیچر اور اداریے لکھنے والے اپنے آپ کو محدود کر لیتے ہیں اور کڑوی، کسیلی باتیں بھی نرم انداز میں بیان کرتے ہیں، اِس بات پر تو سب متفق تھے کہ امریکی سفارت خانے پر قبضہ کر کے ایرانیوں نے ایک جنگی کارروائی کی ہے، لیکن کسی نے اِس طرف کوئی توجہ نہیں دی کہ 1953ء میں جب امریکا نے مصدق کی حکومت کا تختہ الٹا تھا تو وہ بھی

تو ایک جنگی کارروائی ہی تھی، ارنسٹ کونائین (Ernest Conine) نے 10 دسمبر 1979ء کو لاس اینجلس ٹائمز کے اداریے میں سوچ کے اس مخصوص انداز کی یوں ترجمانی کی ہے:

> خبروں سے مشرق وسطیٰ کے سکالروں کی اس رائے کا پتا چلتا ہے کہ حالیہ برسوں میں مغربی طرز کی جدیدیت کے ساتھ جو اثرات آئے ہیں اور جنھوں نے ایرانیوں کی معمول کی زندگی میں ایک ہلچل مچادی ہے یہ اسی کے خلاف بغاوت کا عمل ہے جسے ہم دیکھ رہے ہیں۔
>
> شاہ سے صرف اِس لیے نفرت نہیں کی جاتی تھی کہ اُس کی پولیس نے عوام کو تشدد کا نشانہ بنایا ہے بلکہ اِس لیے بھی کی جاتی تھی کہ اُس نے مسلمانوں کے مقدس مذہبی رہنماؤں کی نہ صرف امداد بند کردی تھی بلکہ ایک ایسے صنعتی انقلاب کو آگے بڑھا رہا تھا جس نے دیہی علاقوں سے بھی ایرانیوں کی روایتی زندگی کو اکھاڑ پھینکا تھا۔
>
> ''شیطان امریکا'' کو صرف ایران میں ہی نہیں بلکہ دوسرے علاقوں میں بھی اِس لیے بدمعاشوں کا سردار قرار دیا جاتا ہے، کیونکہ اِس علاقے میں پچیس برسوں سے امریکا اپنی قوت کا اظہار کر رہا ہے اور وہ بیرونی طاقتوں کی ایک ایسی علامت بن گیا ہے جس نے اس علاقے میں ناپسندیدہ تبدیلیوں کو جنم دیا ہے۔

اِس استدلالی بیان میں ایرانیوں کے خلاف بہت سے ایسے بن کہے مفروضے آ گئے ہیں جنھیں بڑی احتیاط کے ساتھ پڑھنے کی ضرورت ہے، سب سے پہلے کونائین یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ نیک نیتی کے ساتھ ''مغربی طرز کی جدیدیت'' کے ذریعے ''پرانے اثرات کو مٹانے'' کی کوشش اِس لیے کی گئی تھی تا کہ ایران اور اسلام کو ماضی سے نکال کر موجودہ زمانے میں لایا جاسکے، دوسرے الفاظ میں وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ ایران اور اسلام پسماندہ اور مغرب ترقی یافتہ ہے، اِس لیے اِس میں کوئی شک نہیں کہ پسماندہ لوگوں کو مغرب کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے میں مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا، جیسا کہ میں باب اول میں اِس بات کی نشاندہی کر چکا ہوں کہ یہ جدیدیت کے نظریے سے لیے گئے وہ متنازعہ فیصلے ہیں جنھیں اقدار کے حوالے سے سامنے لایا جاتا ہے، اِس کے علاوہ کونائین یہ فرض کر لیتا ہے کہ ایرانیوں کو اپنے اوپر ہونے والے تشدد کی اتنی پروا نہیں تھی جتنی کہ انھیں ''مذہبی رہنماؤں'' کی توہین نے مضطرب کر رکھا تھا، اس نے یہاں اسی جذبے سے کام لیا ہے جس کا پرانے زمانے میں لوگ اپنے اس رہنما کے لیے اظہار کرتے تھے جو سحر سے ان کی بیماریوں کا علاج کرتا تھا،

اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ایرانیوں کے احساسات ''ہمارے'' احساسات سے مختلف ہو سکتے ہیں، کونائین اپنے آخری نکتے کو بیان کرتے ہوئے اُسے دوسرے نکات کے ساتھ ملا دیتا ہے، اِس طرح اِن کے درمیان ایک ربط قائم کر کے انھیں تقویت دیتا ہے، اور رجعت پسند ایرانیوں پر یہ الزام عائد کرتا ہے کہ ایران کو نیک نیتی کے ساتھ آگے بڑھانے کی امریکی اور پہلوی کوششوں کو وہ سراہنے میں ناکام رہے ہیں، وہ کہتا ہے کہ اس طرح نہ صرف ''ہم'' معافی کے حقدار ہو گئے ہیں، بلکہ ایرانیوں پر یہ الزام بھی درست ثابت ہوتا ہے کہ وہ ہماری چھاپ کی جدیدیت کی قدر و قیمت سے قاصر رہے ہیں، چنانچہ اِس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ سابق شاہ بہرحال ایک شریف اور بلند مرتبہ شخص تھے۔

اس حقیقت کو بہت کم بیان کیا گیا ہے کہ اِس علاقے سے امریکی کارپوریشنوں نے بڑا بھاری منافع کمایا ہے اور گزشتہ چند برسوں کے دوران تیل کی کمپنیوں کے منافع میں جو دو سو فیصد اضافہ ہوا ہے، اُس کا تعلق پہلوی خاندان کی دولت سے جوڑنا چنداں مشکل نہیں ہے، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے نہ تو چھپایا جاسکتا تھا اور نہ اس تک پہنچنا مشکل تھا، مگر یہی وہ پہلو ہے جو ایرانی عوام کے تاثرات کو ظاہر کرتا ہے اور وہ بھی اُن لاکھوں عربوں کی طرح جنھیں تیل سے براہ راست کوئی نفع نہیں ہوتا، دولت سے جڑے ہوئے امریکیوں کو ایران پر ایک طرح کا بوجھ سمجھتے ہیں، اگر کبھی کہیں اِس طرح کی بات سامنے آجاتی تھی کہ شاہ کبھی کبھی کس قدر جبر و تشدد سے کام لیتا تھا، تو امریکی میڈیا فوراً شاہ کے دفاع پر اتر آتا تھا، اسی سلسلے میں 16 دسمبر کو واشنگٹن پوسٹ لکھتا ہے کہ ''اِس سلسلے میں یہ دلیل پیش کر دینا ہی کافی ہے کہ ''ایرانی تاریخ میں اِس طرح کے تشدد کی روایات بہت پہلے سے چلی آرہی ہیں'' واشنگٹن پوسٹ کی اِس دلیل سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ ایرانی چونکہ شروع سے ہی اذیتوں کا شکار ہوتے رہے ہیں، اس لیے اُن کا یہ طے شدہ مقدر ہے اس میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی اگر اُن کی اپنی فطرت کو کھول کر سامنے لانے سے گریزاں بھی ہوئی تھی تو یہ بات ضرور سامنے آئے گی کہ انھوں نے اپنی تاریخ سے غداری کی ہے۔

اِس سلسلے میں 5 دسمبر 1979ء کو یہ ناقابل تردید منطقی موقف سامنے آیا کہ چونکہ نئے آئین کا شمار ''دور جدید کے انتہائی بازاری سیاسی دستاویزات میں ہوتا تھا'' اور چونکہ یہ امریکی آئین کے ساتھ گہری مماثلت نہیں رکھتا تھا، اس لیے (امام) خمینی کا اقتدار حاصل کر لینا کم از کم سابق شاہ کے اقتدار جیسا ہی برا تھا، یہ موقف ڈان اے شانسے (Don A. Schanche) نے لاس اینجلس ٹائمز میں پیش کیا اور جب یہ بات آئی کہ کم از کم نظریے کی حد تک آئین میں ''صدر اور پارلیمنٹ کے انتخاب کی گنجایش رکھی جائے گی اور ایک منظم

عدالتی نظام قائم ہو سکے گا'' تو شانسے نے اسے یہ کہہ کے مسترد کر دیا کہ یہ تو ''جمہوریت کو ایک جال میں جکڑ دینے'' کے مترادف ہوگا، وہ اپنے اِس تجزیے میں وہ باتیں زیر بحث نہیں لایا جن کا ایرک رولیو (Eric Rouleau) نے بڑی تفصیل کے ساتھ اپنے اس مضمون میں جائزہ لیا ہے جو 3-2/دسمبر 1979 کو لی مونڈے میں شائع ہوا، اس میں اُس نے آئین کے بارے میں جاری زوردار بحث اور (امام) خمینی کی اصل آئینی حیثیت کے متعلق اختلافات اور اس سے ملتی جلتی دوسری باتوں کا ذکر کیا ہے، دوسرے الفاظ میں شانسے کی آنکھوں کے سامنے حقیقی معنوں میں جو کچھ ہو رہا تھا وہ اُسے بیان کرنے کی بجائے اِس بات میں دلچسپی رکھتا تھا کہ اُس نے اپنے اداریے میں ایرانی آئین کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اُسے ایک سچ کے طور پر تسلیم کر لیا جائے، یہ اتفاق بھی تھا اور شدید کشمکش کا نتیجہ بھی کہ ایران میں جو نیا نظام قائم کیا گیا تھا، 1980ء کے وسط تک وہ ناکام معلوم ہونے لگا اور اس سے انقلاب کے ایرانی اور غیر ایرانی حامیوں کو بڑی مایوسی ہوئی، تاہم اس دوران امریکا[1] میں بھی انتہائی دائیں بازو کے ایک امیدوار کا ابھر کر سامنے آ جانا کچھ کم ناخوشگوار اتفاق نہیں تھا۔

اینڈریو ینگ (Andrew young) کے سوا امریکی کی کسی معروف عوامی شخصیت کے پاس 1979ء میں اِس بارے میں کچھ کہنے کو نہیں تھا کہ جب ایرانیوں نے امریکا کے خلاف کارروائی کی تو اُن کی اپنی نظر میں ایران کی سابقہ حکومت کا کیا مقام تھا، اِس بات پر اُن تین پادریوں نے بھی غور کیا جنھوں نے سفارتخانے میں یرغمالیوں کے ساتھ کرسمس کی مذہبی رسوم ادا کی تھیں اور اُن دوسری مذہبی شخصیات کے گروپ نے بھی جو دسمبر کے اواخر میں تہران میں موجود تھے، اس بات کو انھوں نے بھی سوچا، یہ دونوں گروپ 28/دسمبر اور 4/جنوری کو میک نیل، لہرر رپورٹ کے پروگرام میں شریک ہوئے، ایرانیوں کے جذبات کے سلسلے میں سب خاموش تھے، یہاں تک کہ اس معاملے میں پریس نے بھی دوسروں کا ساتھ دیا اور اسی خاموشی کو لے کر ہی پریس نے شاہ کے امریکا میں داخل ہونے کے کم از کم بیس دن بعد اسے انسانی ہمدردی کا مستحق قرار دیا، حالات نے شاہ ایران کو اُس کے سابقہ سیاسی تعلق سے محروم کر دیا تھا، اِس لیے اُسے اِس بات کی خبر بھی نہیں تھی کہ ایران میں امریکی سفارتخانے کے ساتھ کیا ہو رہا ہے، یہ تو چند صحافی تھے، جنھوں نے واشنگٹن پوسٹ۔ کے چیف ڈان اوبرڈورفر (Don Oberdorfer) سے مل کر ایک ایسا پرفریب راستہ تیار کیا جس پر چل کر ڈیوڈ راک فلر (David Rockefeller)، ہنری کسنجر (Henry Kissinger) اور جان میک لائے (John McCloy) نے امریکی حکومت

1۔ 1980ء کے امریکی انتخابات میں ڈیموکریٹس کے جمی کارٹر کا مقابلہ ری پبلیکن پارٹی کے رونالڈ ریگن سے تھا، یہ انتخاب ریگن نے جیتا اور جارج بش سینئر ان کے ساتھ نائب صدر کی حیثیت سے کامیاب ہوئے۔ (مترجم)

پر ایسا دباؤ ڈالا کہ وہ سابق شاہ کو امریکا لائے، چنانچہ شاہ امریکا پہنچ گیا، لیکن نہ صرف اس کی آمد سے متعلق حقائق کو بلکہ چیز مین ہیٹن بینک (Chase Manhattan Bank) کے ساتھ سابق شاہ کے دیرینہ تعلقات کو سرسری انداز میں بھی سفارتخانے پر قبضے کے ساتھ نہیں ملایا گیا، حالانکہ اگر ایسا کیا جاتا تو ایرانیوں کی دشمنی کی وجہ بڑی کھل کر سامنے آ جاتی، اِس کے برعکس یرغمالیوں کے بحران کے متعلق بڑی بڑی وضاحتیں پیش کی گئیں، لاس اینجلس ٹائمز نے 25 اور 27/نومبر 7 اور 11/دسمبر جبکہ واشنگٹن پوسٹ نے 15/نومبر کو اس موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے اِس طرح کی باتیں کیں کہ یہ سب (امام) خمینی کی حیلہ سازیاں ہیں، عوام کی توجہ ملکی مسائل سے ہٹانا اس کی مجبوری ہے اور ایران کی معاشی مشکلات اور ایسی ہی دوسری وجوہات نے یرغمالیوں کا بحران پیدا کیا ہے۔

مجھے بالآخر یہ یقین آ گیا ہے کہ اگر میں یہ کہوں تو میری یہ بات سنک مزاجی میں نہیں آئے گی کہ اس انتخابی سال میں صدر کارٹر کے ہاتھ میں ایران کا جو کارڈ آ گیا تھا، اُسے انھوں نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ استعمال کیا، جہاں تک ایران کے ساتھ امریکی حکومت کے سابقہ تعلقات کا معاملہ تھا اُسے انھیں یہ کہہ کر سمیٹ دیا کہ یہ ''ماضی کی تاریخ'' کا حصہ ہیں، ان کا چونکہ آج سے کوئی تعلق نہیں، اس لیے وہ انھیں زیر بحث نہیں لا سکتے، انھوں نے اس بحث سے خود تو گریز کیا مگر سیاسی دارالحکومت میں میڈیا کی مجموعی دشمنی کا رخ ایرانیوں اور اسلام کی طرف موڑ دیا، اِس طرح غیر مغربی ممالک پر ایک بحث چھڑ گئی اور اِس میں سے صدر کارٹر کے متعلق یہ تاثر ابھرا کہ وہ غیر ملکی حملے کے خلاف امریکا کو مضبوط رکھے ہوئے ہیں اور ایران کے اندر (امام) خمینی کو بھی یہی مقام اور حیثیت حاصل ہوگئی، اُس موقع پر جب کارٹر نے طاقت استعمال کرنے سے انکار کر دیا تو اُسے اگرچہ ولیم سفائر (WilliamSafIre) اور جوزف کرافٹ (Joseph Kraft) کی نفرت اور حقارت کا سامنا کرنا پڑا، لیکن مجموعی طور پر امریکی عوام نے اس سے یہ تاثر لیا کہ اسلامی ''دہشت گردوں'' کے مقابلے میں صدر کارٹر باتہذیب رویے کے مغربی معیار کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہے ہیں، اِس بحران کا ایک اور اثر اُس وقت سامنے آیا جب صدر سادات جیسے حکمرانوں نے (امام) خمینی کو جنونی اور اسلام کے لیے باعث ندامت کہا اور اِس بات کو بار بار دہرایا تو صدر سادات کو اسلام کا ایک مثالی نمونہ قرار دے دیا گیا، سعودی شاہی خاندان کو بھی یہی مقام اور درجہ ملا، تاہم اس عرصہ میں مضطرب کرنے والی بے شمار اطلاعات ایسی تھیں جن کے بارے میں کوئی خبر شائع نہ ہوئی اور یرغمالیوں کا قصہ طوالت پکڑتا چلا گیا۔

سب سے پہلے سادات اور سعودیوں کو لیجیے، 1978ء کے کیمپ ڈیوڈ معاہدے کے بعد اس بات پر

اتفاق پایا جاتا تھا کہ سادات اس خطے میں امریکا کا قریبی دوست ہے، اُس نے اپنی اس رضامندی کا بھی واضح اعلان کیا تھا کہ اسرائیلی وزیراعظم وہ مناخم بیگن (Menachem Begin) کے ساتھ مل کر اس علاقے میں پولیس مین کا کردار ادا کرنا چاہتا ہے، اسرائیلی وزیراعظم اپنے علاقے میں امریکا کو اڈے فراہم کرنے اور دوسری مراعات دینے کو بھی تیار ہے، ان پیشکشوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مصر سے امریکی میڈیا کو جو خبریں بھیجی جاتی تھیں، ان میں اس بات کا خیال رکھا جاتا تھا کہ مصر، عرب اور اس علاقے کے متعلق سادات کے نظریات کو درست ثابت کیا جائے۔ مصر اور عرب دنیا کے متعلق رپورٹیں اس مقصد کو سامنے رکھ کر تیار کی جاتی تھیں کہ ان سے مختلف معاملات میں سادات کے نکتہ نظر کی توثیق ہو جائے، حالانکہ اُس کا جانشین حسنی مبارک اُس وقت بھی اور آج بھی امریکی کیمپ میں ہے لیکن اسے نہ تو سادات جیسا ذمہ دار سمجھا جاتا تھا اور نہ ہی یہ تاثر لیا جاتا تھا کہ حسنی مبارک بھی سادات کی طرح مغلوب نہ ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے، اگر حسنی مبارک کا سادات سے موازنہ کیا جائے تو سادات کے قتل سے پہلے اُس کے متعلق بہت کم مواد شائع ہوا، حالانکہ سب لوگ اِس بات پر یقین رکھتے تھے کہ وہ نہ صرف خبروں کا سب سے بڑا ماخذ ہے بلکہ سیاست کا اعلیٰ نمونہ بھی ہے، بالکل اسی طرح کے واقعات پہلوی حکومت کے دور میں بھی دیکھنے کو ملتے تھے، سوائے برکلے (Berkley) کے سکالر، حامد الگر (Hamid Algar) کے کسی نے بھی شاہ کے مذہبی اور سیاسی مخالفین پر توجہ نہ دی تھی، الگر کا یہ واحد مضمون اپنی پیشین گوئیوں میں ہر لحاظ سے یکتا ہے، امریکا نے سادات کے ذریعے اور اُس کی سیاسی سوجھ بوجھ کی روشنی میں سیاسی، فوجی، حکمت و تدبیر اور اقتصادی میدانوں میں بھاری سرمایہ کاری کی، میڈیا اس سرمایہ کاری سے کسی حد تک اس لیے لاعلم رہا کہ اس کی ترجیح اعلیٰ ''شخصیات تھیں چنانچہ اس نے مصر اور مشرق وسطیٰ کے درمیان ابھرنے والے نظریاتی اتفاق رائے کو بھی نظر انداز کر دیا اور اس کے استحکام کے لیے تحقیقاتی رپورٹنگ کا جو سلسلہ شروع ہونے لگا تھا وہ بھی کہیں پس منظر میں گم ہو گیا۔

اِس کے علاوہ بھی کچھ وجوہ تھیں، ان میں سے ایک کا تعلق مشرق وسطیٰ کے اندرونی حساس پہلو سے تھا، مثال کے طور پر یہ کوئی حادثہ نہیں تھا کہ واٹر گیٹ کے بعد سی آئی اے اور اطلاعات کی آزادی کے ایکٹ کے متعلق جس قدر انکشافات ہوئے ان میں امریکا ایران کے سوا مشرق وسطیٰ میں کسی اور ملک میں اتنی شدت کے ساتھ ملوث نہیں پایا گیا، جہاں تک ایران کا تعلق ہے یہ بات بڑی واضح ہے کہ نہ صرف اس لیے کہ بہت سے امریکی یہاں سے نکاراگوا کے باغیوں کی غیر قانونی حمایت کر رہے تھے بلکہ اس لیے بھی کہ شاہ کی حکمرانی کے دوران اور بعد میں بھی امریکا کی بدولت اسرائیل کو اس علاقے میں سرگرم ہونے کا موقع مل گیا تھا، ایرانی

خفیہ ادارے ساواک کو اسرائیلی خفیہ ادارے موساد کی براہ راست مدد سے قائم کیا گیا تھا اور جیسا کہ کئی دوسرے معاملات میں ہوتا رہا ہے، سی آئی اے اور ایف بی آئی نے اسرائیل کے خفیہ ادارے کے ساتھ بخوشی تعاون کیا تھا، یوری لبرانی (Uri Lubrani) اور وہ دوسرے اسرائیلی جو انقلاب سے پہلے ایران اور اسرائیل تعاون کو برقرار رکھے ہوئے تھے، انھوں نے 1979 اور 1980 کے اوائل میں اسرائیلی اخبارات میں ایسے مضامین شائع کیے، جن سے بڑے بڑے انکشافات ہوئے، اِس سلسلے میں عبرانی اخبارات داور (Davar) کی 20/مارچ 1980ء اور ہارٹز (Ha'aretz) کی 10/جنوری 1979ء کی اشاعت دیکھی جا سکتی ہے، ان میں سے کوئی بات بھی امریکی پریس میں شائع نہیں ہوئی، غالباً اس کی وجہ یہ رہی ہوگی کہ ایسی باتوں کے سامنے آنے سے اسرائیل کے جمہوریت اور آزادی پسند تشخص کو دھچکا لگ سکتا تھا، ایران اور نکاراگوا کے باغیوں کے معاملے میں اسرائیل کے ملوث ہونے کو بہت چھپا کر رکھا گیا، اسی عرصہ میں جب امریکا کی ساری انتظامیہ سابق شاہ کو واپس ایران کے حوالے کرنے کی بھرپور مخالفت کر رہی تھی، ایک غریب فلسطینی نوجوان جس کا نام زیاد ابوعین تھا امریکا سے نکالے جانے کے اذیت ناک عمل سے گزر رہا تھا، اُس کی حبس بے جا کی درخواست پر ضمانت بھی نامنظور ہو گئی تھی، اور اس سارے عمل میں امریکی دفتر خارجہ اس لیے بھرپور تعاون کر رہا تھا کیونکہ اسرائیلی حکومت نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ دہشت گرد ہے اور دو سال پہلے جو بم دھما کا ہوا تھا اُس کی ذمہ داری اُس پر عائد ہوتی ہے، اسرائیلی حکومت کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ اُس نے ایک تیسرے فرد کے سامنے اسی بات کا اعتراف کیا تھا، اس نے اسرائیلی جیل میں بند ایک فلسطینی کے سامنے عبرانی میں اِس کا اقرار کیا تھا، عجیب بات ہے کہ زیاد ابوعین کو عبرانی زبان آتی ہی نہیں تھی، ملک بدر کیے جانے کے ان واقعات پر میڈیا نے بہت کم توجہ دی، تاہم نیو سٹیٹس مین (New Statesman) کی کلاڈیا رائٹ (Claudia Wright) کا ایک اہم مضمون 7 اور 21/جنوری 1980 کو انکوائری (Inquiry) میں شائع ہوا، اِس میں ''ملک بدری کے قوانین کے ساتھ چھیڑ چھاڑ'' (Toying with Extradition) کو موضوع بنایا گیا تھا۔

اِس کے ساتھ ساتھ سعودی عرب اور کویت جیسے علاقوں کے استحکام کے متعلق جو گہری تشویش پائی جاتی تھی اُس نے بھی ایسی خبروں کو جنم نہیں دیا جن سے اِس تشویش کا اظہار ہو سکے، تاہم اِس سلسلے میں غیر معمولی احتیاط ضرور دیکھنے میں آئی، بڑے ناپ تول کر قدم اٹھائے گئے، اور سعودی عرب کے کمزور پہلوؤں پر اس طرح کی تھوڑی بہت تنقید ہوئی جس کا میں نے اِس کتاب کے پہلے حصے میں ذکر کیا ہے، بڑے بڑے نیٹ ورکس اور اخبارات میں سے صرف سی بی ایس کے ایڈ براڈلے (Ed Bradley) نے 24/نومبر 1979ء کو

یہ بات سب کے سامنے رکھ دی کہ مکہ کی مسجد پر قبضے کے متعلق تمام اطلاعات حکومت نے فراہم کی ہیں اور اِس ذریعے سے موصول ہونے والی خبروں کے سوا کسی دوسرے ذریعے کی خبر کی اشاعت کی اجازت نہیں دی گئی، تاہم کرسچن سائنس مانیٹر (Christian Science Monitor) کی ہلینا کوبان (Helena Cobban) نے 30 رنومبر کو بیروت سے یہ خبر دی کہ مسجد الحرام پر قبضے کا بڑا واضح سیاسی مقصد تھا، جن مسلم انتہا پسندوں نے حملہ کیا تھا، وہ ایک ایسے سیاسی نیٹ ورک سے تعلق رکھتے تھے جس کے عزائم اسلامی ہونے کے ساتھ ساتھ سیکولر بھی تھے اور اُن کا مقصد سعودی شاہی خاندان کا تختہ الٹ کر ان کے اقتدار اور ان کی دولت پر بلا شرکت غیرے قبضہ کرنا تھا، خیال کیا جاتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ نیٹ ورک زیادہ پھیل گیا ہے، یہ اندازہ 1995ء کے اواخر اور 1996ء کے موسم گرما میں ریاض اور خوبان میں ہونے والے بم دھماکے سے لگایا گیا تھا مگر جہاں تک کوبان کا تعلق ہے اسے تمام اطلاعات سعودی عرب کے ایک ایسے شہری نے فراہم کی تھیں جو بیروت میں رہائش پذیر تھا، اس مضمون کی اشاعت کے چند ہفتوں بعد یہ شخصیت لاپتا ہوگئی، خیال کیا جاتا ہے کہ اُسے غائب کرنے میں سعودی عرب کے جاسوسی کے ادارے کا ہاتھ تھا۔

افغانستان پر حملے کے بعد یہ امکان پیدا ہوگیا تھا کہ اب خبروں کا زاویہ بدلے گا اور ایسی خبریں آئیں گی جن میں اچھے اور برے مسلمانوں میں امتیاز کیا جائے گا، حسنی مبارک، بے نظیر بھٹو اور یاسر عرفات کی حماس دشمن سیکورٹی فورسز کو اچھے مسلمانوں میں شمار کیا جائے گا اور ان کی کامیابی کی خبریں کھلے دل سے قبول کی جائیں گی اور اچھے اسلام کا تعلق ''جدیدیت'' سے جوڑا جائے گا، اگر ممکن ہوا تو آزادی اور جمہوریت کو بھی اِس کا پیمانہ مقرر کیا جائے گا اور ''آزاد'' منڈیوں کی اقتصادیات بھی اس میں سمٹ آئے گی، تاہم سعودی عرب، کویت، مصر اور اردن جیسے ممالک میں انسانی حقوق کی جو صورت ہے اُس میں تبدیلی لانے کو اچھے اسلام کے دائرے میں شامل نہیں کیا جائے گا، یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ افغانستان پر سوویت قبضے کے خلاف جو مزاحمت کی گئی اُسے اسرائیلی قبضے کے خلاف فلسطینیوں کی جدوجہد سے بہت کم تشبیہ دی جاتی ہے، لیکن جب اردن کے شاہ حسین 22 رجنوری 1980ء کو ''پریس سے ملاقات'' (Meet The Press) پروگرام میں آئے تو انھوں نے یہ نکتہ اٹھایا تھا کہ فلسطینیوں کی اور افغانوں کی جدوجہد میں کوئی فرق نہیں ہے، دونوں اپنے علاقے سے قابض فوجوں کو نکالنے کی جنگ لڑ رہے ہیں، یہ بات قطعی حیران کن نہیں کہ اسرائیل کے امریکی حامیوں نے ہی اس بات کو اٹھایا تھا کہ سعودی عرب میں امریکا کی بھاری سرمایہ کاری خطرے میں ہے اور انھوں نے اس پر

اصرار کیا تھا کہ امریکا کی سرپرستی اسرائیل سے ہٹ کر عربوں کی طرف منتقل نہیں ہونی چاہیے، اِس سے متعلق ایک مضمون 22 ردسمبر 1979ء کو نیوری پبلک میں شائع ہوا، یہ مضمون پیٹر لیوبن (Peter Lubins) کا تھا اور اِس کا عنوان تھا کہ ''ہم سعودی عرب کے متعلق کیا نہیں جانتے'' (What we Don't Know About Saudi Arabia)، اُس کا کہنا تھا کہ تیل کی مالک خلیجی ریاستوں کے متعلق جو کچھ لکھا جاتا ہے یا یونیورسٹیوں میں پڑھایا جاتا ہے وہ یا تو اِس علاقے کے برسر اقتدار خاندانوں کے متعلق پروپیگنڈہ ہوتا ہے یا لاعلمی سے عبارت ہوتا ہے، اُس کی یہ بات اگرچہ کسی حد تک درست ہے لیکن اِس میں مبالغہ آرائی زیادہ ہے پھر اُس نے اپنی اِس تنقید میں اُن تحریروں کو شامل نہیں کیا جو اسرائیل کے بارے میں لکھی جاتی ہیں، اور اس نے اس بات کو بھی قابل توجہ نہیں سمجھا کہ مختلف امریکی یونیورسٹیوں میں مشرق وسطیٰ کے جو مطالعاتی پروگرام رائج ہیں اُن میں بڑی نفاست کے ساتھ اسرائیل کی حمایت میں تعصب برتا جاتا ہے، اِس مضمون میں اگرچہ اُس کا اِس بات پر زور دینا درست ہے کہ تیل سے مالا مال حلیفوں کے بارے میں جو اطلاعات فراہم کی جاتی ہیں، ان کے متعلق صحافیوں پر لازم ہے کہ وہ اُن کی صحت کے متعلق زیادہ چھان بین کریں، مضمون کی اس اٹھان کا تقاضا یہ تھا کہ لیوبن یہ بات کہتا کہ اسرائیل کے بارے میں لکھتے ہوئے نہ تو انصاف کے تقاضے پورے کیے جاتے ہیں اور نہ ذہنی صلاحیتوں کو ہی استعمال کیا جاتا ہے، مگر لیوبن نے اس شرمناک طرز عمل کو نہیں چھیڑا، اور اسرائیل کے متعلق کوئی بات نہیں کی۔

باب دوم

دوسرا ملک

(حصہ چہارم)

یرغمالیوں کے بحران کے ابتدائی ماہ بڑے کربناک اور بے چینی کو ہوا دینے والے تھے، اس دوران میڈیا نے اسلام اور ایران کے ساتھ جو سلوک کیا، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے اب تک میں نے جو کچھ کہا ہے اسے چند نکات میں سمیٹا جا سکتا ہے، ان نکات کو واضح کرنے اور ایک جگہ جمع کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ایران کی کہانی کو جس طرح امریکا نے بیان کیا ہے، اس کا موازنہ یورپ میں شائع ہونے والے مضامین سے کیا جائے، اس بحران کے شروع ہونے کے پہلے ہفتے سے لے کر دسمبر کے آخر تک ایرک رولیو (Eric Rouleau) کے مضامین ایک تسلسل کے ساتھ لی مونڈے میں شائع ہوتے رہے ہیں، بعد میں جب تمام امریکی رپورٹروں کو جنوری میں ایران چھوڑ دینے کا کہا گیا تو چند دن تک رولیو کی رپورٹیں دی ٹائمز میں بھی شائع ہوئیں، اس سلسلے میں چند باتوں کو شروع میں ہی سمجھ لینا ضروری ہے کہ رولیو امریکی نہیں ہے، ایرانیوں نے کسی فرانسیسی کو یرغمال نہیں بنا رکھا تھا، ایران کبھی فرانس کے حلقۂ اثر میں نہیں رہا اور رولیو جو خبریں بنا رہا تھا، ان سے قطع نظر فرانسیسی میڈیا، خارجہ پالیسی کی رپورٹنگ میں امریکی میڈیا سے بہتر نہیں ہے، یہاں یہ کہنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے اور میڈیا نے اپنی کوریج میں جو بے شمار مضامین بھر دیئے تھے ان میں سے ہر ایک میں تو نہیں البتہ کچھ میں انتہائی قیمتی معلومات موجود تھیں، عام طور پر جو مضامین اجتماعی نقطۂ نظر کی مخالفت میں شائع ہوتے تھے، ان سے بڑی کارآمد باتیں معلوم ہو جاتی تھیں، لاس اینجلس ٹائمز اور بوسٹن گلوب کے ادارتی صفحے کے سامنے والے صفحے پر بڑے پُرمغز مضامین شائع ہوتے ہیں جن میں ان متبادلات کا ذکر کیا گیا ہے جو ایرانی حقائق کو سنجیدگی سے لینے کی راہ سجھا سکتے ہیں، اس سلسلے میں رچرڈ فاک (Richard Falk) نے 9/دسمبر کو اٹلانٹک کانسٹی ٹیوشن میں اور راجر فشر (Roger Fisher) نے 4/جنوری کو نیوز ویک میں طبع آزمائی کی ہے، لاس اینجلس ٹائمز میں ڈوئیل میک مینس (Doyle Mc Manus) اور نیویارک ٹائمز میں کفنر نے امریکا میں شاہ کے داخلے کے پس منظر پر بڑی شاندار رپورٹنگ کی ہے، وقفے وقفے سے اس کا آنے والا سیاسی تجزیہ بھی خوب ہوتا ہے اور اس نے جس

قدر خبریں فراہم کی ہیں انھیں بیان بھی بڑی خوبی کے ساتھ کیا گیا ہے، یرغمالیوں کے بحران کے ابتدائی چند ہفتوں کے دوران میڈیا کی خبروں میں زیادہ تر حب الوطنی کے جس گھسے پٹے تذکرے کا سہارا لیا جا رہا تھا، اس کا تاثر دیرپا نہیں تھا، چنانچہ کچھ قارئین کھوکھلے نعروں سے آگے بڑھ کر اصل معلومات تک پہنچنا چاہتے تھے، ان کے لیے اس طرح کے مضامین اطمینان بخش ہوتے تھے، جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے، یہاں اس بات کا تذکرہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ امریکی ملبوسات پر اکثر عبارتیں لکھی ہوئی ملتی ہیں، اور ان میں حب الوطنی کے جذبات کو نمایاں کیا جاتا ہے، حال ہی میں حب الوطنی کا ایک نیا سلسلہ بٹنوں پر تحریروں کی شکل میں سامنے آیا ہے، ان بٹنوں پر کہیں تو ''ایران چوستا ہے'' (Iran Sucks) لکھا ہوا ہے اور کہیں ''ایٹمی ایران'' (Nuke Iran) درج ہے، یہ بھی نفرت کے اظہار کا ایک طریقہ ہے اس پر انکوائری میگزین میں دو بڑے زور دار مضامین 24/دسمبر، 21-7 جنوری کو شائع ہوئے ہیں، اس کے علاوہ فریڈ جے کک (Fred J. Cook) کا ایک مضمون 22/دسمبر کو نیشن میں شائع ہوا، جس میں یہ اطلاع بڑی بروقت دی گئی ہے کہ مختلف سودوں پر ایران سے رشوت لینے کے معاملے کی جو تحقیقات کانگریس نے 1965ء سے شروع کر رکھی تھی انھیں پراسرار طور پر ترک کر دیا گیا ہے اور اب جبکہ تحقیقات کے لیے وقت انتہائی موزوں ہے، اسے دوبارہ شروع کرنے کی کوششوں کو بڑے پراسرار انداز میں روکا جا رہا ہے، کک کا مضمون انکشافات سے پُر تھا، اس نے اس بات سے بھی پردہ اٹھایا کہ رابرٹ میک فارلین (Robert Mc Farlane) اور اولیور نارتھ (Oliver North) نے 1986ء میں ان یرغمالیوں کو چھڑانے کے لیے ایران سے مذاکرات کیے تھے جنھیں لبنان میں ایران کے اتحادیوں نے پکڑ رکھا تھا، ان کی رہائی کے بدلے میں غیر قانونی طور پر امریکی اسلحہ دیا گیا تھا۔

لیکن عام طور پر ٹیلی وژن، اخبارات، خبروں کے ہفت روزہ رسالوں کا، ایران کے بارے میں خبریں دینے کا چلن وہی پرانا تھا، ان میں نہ تو کہیں بصیرت نظر آتی تھی اور نہ اس طرح کی متاثر کن سوجھ بوجھ کہیں دکھائی دیتی تھی، جس کا اسی عرصے میں رولیو نے لی مونڈے میں شائع ہونے والے اپنے مضامین میں کیا تھا، بات سخت ہے، مگر مجھے کہنی پڑ رہی ہے کہ رولیو نے ایران کے متعلق جو لکھا اس سے ایران، اس ملک سے قطعی مختلف نظر آیا جس طرح کا اسے امریکی میڈیا ظاہر کر رہا تھا، رولیو نے کسی مرحلے پر بھی اس حقیقت کو اپنے ذہن سے محو نہیں کیا کہ ایران میں انقلابی عمل ابھی ختم نہیں ہوا وہ اس صورت حال کو اس طرح لیتا ہے کہ ابھی تک وسیع پیمانے پر انقلابی تبدیلیوں کا سلسلہ جاری ہے اور کسی باضابطہ حکومت کے نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایران سیاسی اداروں کے ایک بالکل نئے ڈھانچے کی تعمیر کے دور سے گزر رہا ہے، اس وقت ان کی

کارکردگی کا طریق کار اور ان کی حقیقی شکل وصورت طے ہو رہی ہے، اس لیے امریکی سفارت خانے کے بحران کو، اس پیچیدہ عمل سے جو الجھنوں کا باعث بنا ہوا ہے کسی طرح بھی الگ کر کے نہیں دیکھنا چاہیے، بلکہ اسے سمجھنے کے لیے اسے، اس پیچیدہ عمل کے تناظر میں دیکھنا ضروری ہے، رولیو کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ حالات یا شخصیات کو واضح کرنے کے لیے کبھی اسلام کو استعمال نہیں کرتا، یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اس نے رپورٹنگ کے لیے جو ضابطہ مرتب کر لیا ہے، اس میں سیاست، معاشروں اور ان تاریخوں کا تجزیہ شامل ہے، جو اپنی جگہ خود بڑے پیچیدہ ہیں، اس طرح کی رپورٹنگ کرتے ہوئے وہ عام نظریاتی تصور کی طرف مائل نہیں ہوتا اور نہ جان بوجھ کر پراسرار لفاظی کا سہارا لیتا ہے، بعد میں کئی مواقع ایسے بھی پیدا ہوئے جب حالات نے وہ رخ اختیار نہیں کیا، جس کی توقع کی جا رہی تھی یا وہ جس طرح سامنے آئے اس تناظر میں انھیں ٹھیک سے سمجھنا ممکن نہ ہوا، اس کے باوجود رولیو نے اپنے ضابطے سے انحراف نہیں کیا، اس کے برعکس امریکا کے کسی رپورٹر کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ وہ اس طویل بحث ومباحثے کی رپورٹنگ کرے، جو آئینی ریفرنڈم پر ایران میں جاری تھا، اگرچہ امریکی رپورٹروں کی طرف سے مختلف جماعتوں کے چند تجزیے ضرور دیکھنے کو ملے، مگر ان میں بھی اس اہم نظریاتی کشمکش کا کوئی ذکر نہیں تھا جو بہشتی، بازرگان، بنی صدر اور قطب زادہ کے درمیان جاری تھی، پھر اس بات کو بھی منظر عام پر نہیں لایا گیا کہ اس کشمکش میں کون کون سے ہتھکنڈے استعمال کیے جا رہے ہیں، یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ کم از کم 1980ء کے وسط تک امریکی میڈیا نے ایران کی سیاسی شخصیات، ان کے نظریات اور ان اداروں کے متعلق کوئی تفصیلی خبر شائع نہیں کی تھی، جو اقتدار اور توجہ حاصل کرنے کے لیے کوشاں تھے، ایران کے انقلاب اور یرغمالیوں کے بحران کے قریب قریب، ایک عشرے بعد تک کسی بھی امریکی صحافی نے، اس بات کی طرف مبہم سا اشارہ بھی نہیں کیا کہ اس بات سے قطع نظر کہ یرغمالیوں کو رہائی ملے گی یا نہیں اور کوئی امریکا کا حامی ہے یا مخالف، ایران کی سیاسی زندگی میں بنیادی طور پر اتنی دلچسپ باتیں موجود ہیں، جو اسے مطالعے کا اہل ٹھہراتی ہیں، امریکی رپورٹوں کا اُس وقت تو یہ حال تھا کہ جب 5/دسمبر 1979ء کو بنی صدر نے سفارت خانے جا کر طلبہ سے ملاقات کی، تو نہ صرف اسے بلکہ اس جیسے دوسرے نازک اور اہم واقعات کو بھی نظر انداز کر دیا گیا، حجت الاسلام خوینی جو ایران کی صدارت کے امیدوار بھی تھے انھوں نے بھی سفارت خانے کے معاملے میں بڑا اہم کردار ادا کیا، مگر اس کا بھی امریکیوں نے کہیں ذکر نہیں کیا، رولیو نے ان تمام واقعات پر نظر رکھی اور ان کی خبریں برابر اپنے اخبار کو بھیجتا رہا۔

یہ بات اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ رولیو کے ذہن میں یہ بات بڑی واضح تھی کہ جو شخصیات

بحران سے متعلق ہیں یا اس ضمن میں جن نظریات کا سیلاب آیا ہوا ہے، ان میں سے کسی کا بھی کردار، کسی لمحے بھی سنجیدہ اور مؤثر ہو سکتا ہے، وہ جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہیں کرتا تھا، کسی کے بارے میں پہلے سے ہی کوئی متعصبانہ سوچ نہیں پال لیتا تھا، سرکاری طور پر جو نتائج اخذ کیے جاتے تھے وہ انھیں آنکھیں بند کر کے قبول نہیں کر لیتا تھا، اور تحقیق کیے بغیر کسی کہانی کو آگے نہیں بڑھاتا تھا، ایوان نمائندگان کے رکن ہین سن (Hansen) نے جب ایران کا دورہ کیا تو رولیو ہمیں بتاتا ہے کہ ذمہ داری اگرچہ کٹھن تھی مگر ہین سن نے اسے بڑی خوبی سے نبھایا اور ان کا دورہ توقع سے زیادہ کامیاب رہا، اس کا ثبوت رولیو نے 24/نومبر 1979ء کو ان الفاظ میں پیش کیا کہ ایرانیوں کے ساتھ مذاکرات میں ہین سن کی کامیابی کو وائٹ ہاؤس نے (امریکی میڈیا نے بھی) جان بوجھ کر اس لیے پس پشت ڈال دیا کیونکہ اس سے امریکا اور ایران کے درمیان بینکاری کے طریق کار پر کانگریس کی طرف سے تحقیقات شروع کرنے کا امکان پیدا ہو گیا تھا، اغلباً یرغمالیوں کی رہائی کے لیے اس کا مطالبہ ایران نے کیا تھا، مگر اس تحقیقات کو بھی وائٹ ہاؤس نے روک دیا، 1979ء کے اواخر میں بنی صدر اور قطب زادہ کے درمیان جو کشمکش ہوئی، رولیو نے اسے بھی بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، بنی صدر شہنشاہیت کا مخالف اور بڑا پکا سوشلسٹ تھا، جبکہ قطب زادہ سیاسی اور اقتصادی معاملات میں قدامت پرست تھا، انھوں نے نومبر، دسمبر میں یرغمالیوں کے بحران سے متعلق، ایک دوسرے سے مختلف موقف اختیار کیا تھا، رولیو نے اس کا باضابطہ روزنامچہ مرتب کیا ہے، جس کے مطابق بنی صدر اس بحران کی شدت کو کم کرنے کے حق میں تھا جبکہ قطب زادہ کا موقف اسے ہوا دینے کا تھا۔

اس بحرانی دور میں اگرچہ کسی بھی امریکی صحافی نے اس کا تذکرہ نہیں کیا، مگر یہ اندازہ قائم کرنا چنداں مشکل نہیں ہے کہ امریکا قطب زادہ کے ساتھ معاملہ کرنے کے حق میں تھا اور بنی صدر کا اس حد تک مخالف ہو چکا تھا کہ اسے وزیر خارجہ کے منصب سے بھی ہٹانے کے لیے کوشاں تھا، امریکی مخالفت کا اندازہ ان باتوں سے ہوتا ہے کہ امریکا بنی صدر کی باتوں کو کبھی سنجیدگی کے ساتھ لیتا ہی نہیں تھا، اس کی تجاویز کو حقارت سے رد کر دیتا تھا اور اس سلسلے میں وہ اس حد تک گیا کہ اس نے کھل کر بنی صدر کو ''خبطی'' کہہ دیا، اس طرز عمل سے جہاں ایران سے متعلق امریکا کی آیندہ پالیسی کا پتا چلتا ہے، وہاں یہ اندازہ بھی ہو جاتا ہے کہ امریکا سوشلسٹوں کے بجائے قدامت پرستوں کے ساتھ معاملہ کرنے کو ترجیح دے گا، اس دور کا ایک اہم واقعہ بنی صدر کا بڑی آسانی کے ساتھ صدارتی انتخابات جیت جانا ہے، امریکی میڈیا بازرگان کے زوال کے متعلق جو یہ دلیل لاتا ہے کہ وہ آزاد خیال اور جمہوریت پسند تھا یا اس نے الجزائر میں برزنسکی سے مصافحہ کر لیا تھا، اس لیے

اس کے اقتدار کا سورج غروب ہوگیا، یہ سب بے پر کی ہوائیاں ہیں، اصل قصہ یہ ہے کہ ایرانی حکومت نے جو ''اسلامی'' پالیسیاں وضع کر رکھی تھیں انھیں عملی جامہ پہنانے میں قطب زادہ نالائق ثابت ہوا تھا اور بنی صدر کے انتخاب نے رہی سہی کسر پوری کر دی تھی، اس سلسلے میں رولیو کے اس مضمون کا شمار اس کے انتہائی اہم مضامین میں ہوتا ہے، جس کی تلخیص مانچسٹر گارجین نے 2/دسمبر 1979ء کو شائع کی تھی، اس مضمون میں رولیو نے اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ سفارت خانے پر تو نومبر میں قبضہ ہوا تھا مگر اس سے بہت پہلے امریکا، ایران کے خلاف ایک طویل اقتصادی جنگ شروع کر چکا تھا جس میں چیز مین ہیٹن بینک خباثت سے پر مرکزی کردار ادا کر رہا تھا۔

رولیو بڑا لائق انسان ہے، اس کے کارنامے مفصل تو نہیں، البتہ ان کا کچھ حصہ بیان کیا جا سکتا ہے، مشرق وسطی سے متعلق اس کے تجربے کی ایک طویل تاریخ موجود ہے، پھر وہ بھی اپنے ہم عصر امریکیوں کی طرح اپنے ملکی حلقوں کی دلچسپی کو ذہن میں رکھ کر رپورٹنگ کرتا ہے، وہ جس اخبار لی مونڈے کے ساتھ وابستہ ہے وہ کوئی عام سا فرانسیسی اخبار نہیں ہے، بلکہ اسے اس روزنامچے کی حیثیت حاصل ہے، جس میں ہر چیز کا ریکارڈ موجود ہوتا ہے، اس اخبار کی اپنے متعلق یہ رائے ہے کہ وہ فرانسیسی مفادات کو سامنے رکھتے ہوئے دنیا بھر کی نمائندگی کرتا ہے، یہ ایک ایسا تصور ہے جو رولیو کے ایران کو مثال کے طور پر نیویارک ٹائمز کے ایران سے مختلف بنا دیتا ہے، اگر اس زمانے کے حالات پر نظر دوڑائی جائے، تو ہمیں فرانس شعوری طور پر ایک متبادل تصور پیش کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے، جو نہ تو بڑی طاقتوں کے تصور جیسا ہے اور نہ دوسری یورپی طاقتوں سے مطابقت رکھتا ہے۔

یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ لی مونڈے فرانس کی ایک توسیعی شکل ہے، چنانچہ اس میں جو شائع ہوتا ہے، وہ فرانس کی ہی ترجمانی کرتا ہے اور فرانس کی صورت یہ ہے کہ اسے مشرق کا ایک طویل تجربہ ہے، اس نے اس تجربے کی روشنی میں ہی مشرق کے متعلق ایک مخصوص رویہ اختیار کر رکھا ہے، اس کے اس رویے کا تعلق اگرچہ نوآبادیاتی دور کے بعد کی صورت حال سے ہے مگر اپنی سابقہ نوآبادیات اور زیر حفاظت علاقوں کے ساتھ اس کا رویہ نوآبادیاتی ہی ہے، فرانس کے نوآبادیاتی رویے کی وحشیانہ انداز کی طاقت کا استعمال نہیں آتا، بلکہ وہ اس سلسلے میں فوجوں کو تعینات کرنے، حکمت عملی وضع کرنے اور باعمل طریقہ اختیار کرنے کی طرف زیادہ مائل رہتا ہے، وہ ایسی حکومتوں پر جو تنہا رہ گئی ہیں یا تنہا کر دی گئی ہیں، سرمایہ کاری کر کے اس سرمایے کی حفاظت میں لگے رہنے کا انداز اختیار نہیں کرتا بلکہ اپنی توجہ اس بات پر مرکوز رکھتا ہے کہ ان ممالک میں کس طرح اپنے

مفادات تلاش کیے جائیں، وہ اس معاملے میں بڑا باریک بین ہے کہ کہاں مہربان ہونا ہے اور کسے تنقید کا نشانہ بنانا ہے، چنانچہ کہیں وہ عارضی تعلق جوڑتا ہے اور کہیں وہ بڑی چھان بین کے بعد کسی کا انتخاب کر لیتا ہے، اس کے اس طرز عمل کو کسی حد تک موقع پرستی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، بہرکیف لی مونڈے ایک اجتماعی ملکیت ہے، یہ اس متوسط طبقے کا اخبار ہے جسے بورژوا کہتے ہیں، جہاں تک فرانس سے ہٹ کر دوسری دنیا کا تعلق ہے یہ اخبار ایک ایسے سیاسی رویے کا اظہار کرتا ہے، جسے مشنری بھی کہہ سکتے ہیں، اسے مذہبی رہنماؤں میں پدرانہ شفقت کا نام بھی دیا جا سکتا ہے، ''روحانی سوشلزم'' بھی قرار دیا جا سکتا ہے، اٹھارھویں صدی کی روشن خیال اور ترقی پذیر کیتھولک سے بھی موسوم کیا جا سکتا ہے، لی مونڈے کے اس سیاسی رویے پر دو تفصیلی مضامین شائع ہو چکے ہیں، ایک لیوئس وزنٹزر (Louis Wiznitzer) نے 13/مئی 1980ء کو کرسچن سائنس مانیٹر کے لیے اور دوسرا جین کرامر (Jane Kramer) نے 30/جون 1980 کو نیویارک (ٹائمز) کے لیے لکھا، یہ ساری باتیں اپنی جگہ درست ہیں مگر اہمیت اس بات کو ہے کہ لی مونڈے دنیا بھر کی خبریں فراہم کرنے کے لیے بلاشبہ بڑی لگن کا مظاہرہ کرتا ہے، اس کے برعکس نیویارک ٹائمز کی رہنمائی بنیادی طور پر بحران اور خبروں کی اہمیت، کرتی ہے، لی مونڈے کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ بیرونی دنیا میں جو وقوع پذیر ہو رہا ہے، اسے ریکارڈ کر لیا جائے، پھر لی مونڈے، رائے اور حقیقت کو رسمی طور پر بھی اتنی شدت کے ساتھ ایک دوسرے سے الگ کرنے کی کوشش نہیں کرتا، جتنا کہ ٹائمز میں کی جاتی ہے، جہاں تک ان خبروں اور مسائل کا تعلق ہے، تو یہ غیر معمولی حد تک پیچیدہ ہوتے ہیں ان کی رپورٹنگ میں نہ صرف بڑی لچک پیدا کر لی جاتی ہے بلکہ انھیں بڑی تفصیل اور بڑے قرینے کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے، لی مونڈے کی رپورٹنگ سے ہی دنیاداری ٹپکتی ہے جبکہ ٹائمز کی رپورٹنگ میں سنجیدگی اور انتخاب نمایاں ہوتا ہے، آیئے اب رولیو کی دو اور تین دسمبر 1979ء کی رپورٹ پر غور کریں۔

اس رپورٹ کے شروع میں ہی رولیو نے اس بات کا ذکر کر دیا ہے کہ پچھلے تین ماہ کے دوران آئین ساز اسمبلی کے متعلق بحث کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے، اس سلسلے میں سینکڑوں کھلے اجلاس ہوئے اور ان میں سے کئی ٹیلی وژن پر دکھائے بھی گئے، پریس اور رسالوں نے اس مسئلہ کا تجزیہ پیش کیا اور بہت سا وقت مجوزہ مشورے میں ''جمہوریت دشمن'' عناصر کی مذمت کرنے پر صرف کیا گیا، یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ امریکی میڈیا میں اس معاملے پر بہت کم توجہ دی گئی تھی، اور جب رولیو نے اسے اٹھایا تو اس نے بات کو درمیان میں ہی نہیں چھوڑ دیا بلکہ اس سے آگے اس نے (امام) خمینی اور ملک کے بڑے حصے کی نمائندگی کرنے والے سیاسی طبقے کے درمیان اختلاف کو بھی بیان کیا اور بات کو یہاں تک لے آیا کہ (امام) خمینی نے معاملات کو

کھٹائی میں ڈالنے کی بجائے براہ راست ملک بھر کے عوام سے اپیلیں کرنا شروع کر دیں، اس طرح اس کے موقف کو دوسروں پر سبقت حاصل ہوگئی، ان ساری باتوں کو بیان کرنے کے لیے رولیو کے لیے ضروری تھا کہ وہ نہ صرف آئینی مباحثے کے مسائل، اس کے انداز اور اس کی حمایت کا بھرپور تجزیہ کرے، بلکہ ان قوتوں کا بھی جائزہ لے جو اس مباحثے میں ملوث ہیں، ایسا کرتے ہوئے، اس کے لیے یہ بھی لازم تھا کہ وہ اقتدار اور آئین کے درمیان اختلاف کو خلط ملط نہ ہونے دے، رولیو کے اس مطالعے کے آخر میں (امام) خمینی کا ''اسلامی'' حامی وہ گروہ ثابت ہوا جس کا تعلق مختلف ماخذوں سے تھا۔ جسے (امام) خمینی کے ''مستقل انقلاب'' کے بے مثال فلسفے نے نہ صرف منظم کیا تھا، بلکہ ملک بھر میں پھیلا بھی دیا تھا، (امام) خمینی فطرتاً ''پکے شریعت پرست'' تھے اور ان کی اسی حیثیت نے تمام توقعات کے برعکس انھیں حالات پر قابو پانے کے لائق بنا دیا، دائیں اور بائیں بازو کی جماعتوں کی فہرست دینے اور ان جماعتوں میں سے ہر ایک میں چند لوگوں کے مقام کو بیان کرنے کے بعد رولیو مجوزہ آئین میں بہت سے نقائص کی نشاندہی کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ مسودہ آئین میں یہ تو بیان کر دیا گیا ہے کہ خواتین محض جنسی تسکین اور منافع بخش مال کا درجہ نہیں رکھتیں، لیکن ان کے حقوق واضح نہیں کیے گئے، اسی طرح بینکاروں اور سرمایہ داروں کے اشتراک سے قائم ہونے والے مالیاتی اداروں کی یہ کہہ کر مذمت تو کی گئی ہے کہ یہ مارکسٹوں کی ایجاد ہیں، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مزدوروں کی کونسلیں اقتصادی زندگی میں اہم کردار ادا کریں گی، آئین کے مسودے میں کہا گیا ہے کہ تمام شہریوں کو برابر کے حقوق حاصل ہوں گے مگر شیعہ ازم کو ریاست کا مذہب قرار دے کر اس برابری کی نفی کر دی گئی ہے، ان تمام باتوں کے بعد رولیو اس طرف آتا ہے کہ:

> ''امام خمینی کے لیے ضروری ہوگیا ہے کہ وہ اس آئین کی فوراً منظوری دے دیں جس پر اتنی زیادہ بحث وتمحیص ہو چکی ہے، بہت سے لوگوں نے انھیں مشورہ دیا ہے کہ جب تک امریکا کے ساتھ زور آزمائی کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو جاتا، تب تک کے لیے ریفرنڈم کو ملتوی کر دیا جائے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ ملک جس انقلابی دور سے گزر رہا ہے اس میں طویل عرصے کے لیے ایک عارضی حکومت کے قیام کی گنجائش پیدا کی جا سکتی ہے، لیکن امام نے ان تمام اعتراضات اور مشوروں کو مسترد کر دیا ہے''۔

جو لوگ انھیں اچھی طرح نہیں جانتے ان کی توقعات کے برعکس قم کا یہ بزرگ پکا شریعت پرست ہے، پچھلے چند ہفتوں کے دوران انھیں جو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی ہے، اس سے انھیں براہ راست اطمینان

حاصل ہوا ہے، جہاں تک مستقبل کا تعلق ہے یہ مقبولیت آئین کے مسودے سے کم اور ان سیاسی قوتوں کے توازن سے زیادہ مستحکم ہوگی جو اُس ''دوسرے انقلابی مرحلے'' سے ابھریں گی جو شروع ہو چکا ہے۔

اگر ڈان شانسے (Don Schanche) کے اس سطحی تجزیے کو سامنے رکھیں جو لاس اینجلس ٹائمز میں شائع ہوا تھا اور جس کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے، تو اس کی طرح رولیو حالات کے متعلق اپنی کھلم کھلا رائے دینے کی کوئی کوشش کرتا دکھائی نہیں دیتا، بلکہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ظاہری حالت اور طاقت، نفس مضمون اور قاری، شخصیات اور جماعتوں کے درمیان فرق کو بیان کرنے کی خاطر انھیں اس تلاطم میں تلاش کرتا ہے جو اپنے قدم جما رہا ہے، اس کی کوشش یہ ہے کہ وہ نہ صرف اس سارے عمل کو بامعنی بنا کر پیش کرے بلکہ اس عمل کے اندر ہونے والی کشمکش کے ان پہلوؤں کو سامنے لائے جو زیادہ مضبوط ہیں، اس صورت حال میں رولیو کے لیے اپنی رائے ظاہر کرنا جب بہت ضروری ہو جاتا ہے، تو وہ اسے بڑے محتاط انداز میں پیش کرتا ہے لیکن وہ کسی صورت بھی حب الوطنی کے جذبات کا سہارا لے کر موازنہ کرنے پر نہیں اتر آتا، اور نہ کسی واقعہ کی اہمیت کو نظر انداز کرتا ہے۔

رولیو جب لی مونڈے سے ریٹائر ہوا تو فرانسوتران نے اسے تیونس میں فرانس کا سفیر بنانے کے ساتھ ساتھ، عرب لیگ اور پی ایل او کے لیے بھی یہی ذمہ داری سونپ دیں پھر 1989ء اور 1991ء میں اسے ترکی میں سفیر بنا دیا، جس کے بعد وہ اپنی نجی زندگی کی طرف لوٹ گیا اور مشرق وسطیٰ کے متعلق ایک فری لانسر کی حیثیت سے رپورٹنگ کرتا رہا، یرغمالیوں کے بحران کے دوران اس نے نفیس اور اثر انگیز تجزیے تحریر کیے تھے، شاید یہ ان کا ہی تسلسل تھا کہ 1995ء کے شروع میں اس نے ایران کا دورہ کیا، اس دورے کا نتیجہ یہ نکلا کہ رولیو نے (امام) خمینی کی وفات کے بعد، ایرانی معاشرے میں ہونے والی پیچیدہ تبدیلیوں پر، ایک مستند جائزہ مرتب کر لیا، یہ جائزہ رپورٹ لی مونڈے ڈپلومیٹک (Le Monde diplomatique) کے مئی 1995ء کے شمارے میں شائع ہوئی، دوسری بہت سی باتیں جن کا امریکی پریس کے مرکزی دھارے میں کہیں کوئی تذکرہ بھی نہیں ہوتا تھا، انھیں اس نے بڑی خوبی کے ساتھ پیش کرتے ہوئے، اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ ہم میں مذہبی کتب کی ترسیل، تفسیر وتوضیح اور دستیابی میں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ نے اہم کردار ادا کیا ہے، رولیو جسے دوسری اسلامی جمہوریہ کہتا ہے اس کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہتا ہے کہ اس کے اندر مباحثے جاری تھے اور جو ٹکراؤ ہو رہا تھا ان سے بڑی حیرت انگیز تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں، ان تبدیلیوں کا ہی نتیجہ ہے کہ حقوق نسواں کے ساتھ ایسی تنظیمیں وجود میں آ گئی ہیں، جن کی آواز بڑی مؤثر ہے اور جن کے پاس مناسب سٹاف بھی موجود ہے، یہ تنظیمیں خواتین

کے حقوق کے لیے بڑا زور مارتی رہتی ہیں، اس طرح مبلغوں، فلم سازوں، سکالروں اور آزاد خیال علما کی بڑی تعداد ولایت الفقیہہ کی مضبوط انتظامیہ کو چیلنج کر رہی ہے، رولیو اس ایران کو بحیثیت مجموعی سیماب صفت، اسلامی ریاست قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ ایک دو ہمسایہ عرب ممالک کو چھوڑ کر باقی سب کے مقابلے میں یہ زیادہ جمہوری ہے اور بڑے عزم کے ساتھ ان چیزوں کو مسترد کر رہا ہے یا کم از کم ان کارناموں اور گھسی پٹی باتوں سے اختلاف کر رہا ہے جنھیں آج بھی امریکی میڈیا میں اس لیے پیش کیا جاتا ہے تا کہ ایران کو شیطان قرار دیا جا سکے۔

اس تمام گفتگو کا نچوڑ یہ ہے کہ رولیو نے لی مونڈے کے لیے ایران سے متعلق جس قدر رپورٹنگ کی وہ نہ صرف سیاسی تھی بلکہ لفظ سیاسی کے معنوں پر پوری اترتی تھی، جبکہ کئی ماہ تک امریکی میڈیا کسی طور بھی سیاسی نہیں تھا یا اس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سیاسی تو تھا، مگر اس کی سیاست بڑی گندی تھی، اس کی مثال یوں ہے کہ امریکیوں اور دوسرے مغربی رپورٹروں کو جو چیز بھی غیر مانوس یا اجنبی معلوم ہوتی تھی، وہ اس پر ''اسلامی'' کا لیبل چسپاں کر کے اسے جارجیت اور تضحیک کا نشانہ بنانے لگ جاتے، ایران کا معاملہ یہ تھا کہ وہ ایک ایسا ہم عصر معاشرہ تھا جو ایک غیر معمولی مگر اہم تبدیلی سے گزر رہا تھا، مگر اس کا مغربی پریس پر برائے نام اثر پڑا، اور اس میں بھی کچھ کلام نہیں کہ کم از کم انقلاب کے پہلے سال کے دوران، ایرانی تاریخ کو بھرپور وقار کے ساتھ، امریکی پریس میں آنے کی اجازت شاذ و نادر ہی ملی ہوگی، اس عرصے میں ہوا یہ کہ ایران پر فقرے چست کیے گئے، الٹے سیدھے قلمی خاکے جنھیں کیری کیچر کہتے ہیں، بنائے گئے اور ایسی باتیں کہی گئیں جن سے لاعلمی، غیر ضروری نسل پرستی اور غلط بیانی صاف جھلکتی تھی، اس طرح حکومت کے موقف کی یہ حمایت بھی بڑی واضح تھی کہ یرغمالی رہا ہوتے ہیں یا نہیں اس سے قطع نظر صرف یہی بات معنی رکھتی ہے کہ ہم ''بلیک میل کے سامنے ہرگز نہیں جھکیں گے'' اس سلسلے میں ایک خرابی یہ بھی ہوئی کہ بغیر سوچے سمجھے نتائج اخذ کیے جاتے رہے، یوں بھی ہوا کہ ایک مقابلہ جو جاری تھا اس کے متعلق کسی مغربی رپورٹر نے جلد بازی مین فیصلہ سنا دیا، یہ سب باتیں ایسی تھیں کہ ایران کی انقلابی زندگی میں جو تسلسل نمایاں طور پر موجود تھا اور جو تسلسل ٹوٹ رہا تھا، وہ سامنے آنے سے رہ گیا، اس کے ساتھ ہی یہ تکلیف دہ مفروضہ بھی سامنے آ گیا کہ اگر امریکا نے سابق شاہ کو معاف کر دیا ہے اور اسے ہمدردی کے لائق قرار دے دیا ہے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ایران یا ایرانی تاریخ کیا کہتی ہے، اسی عرصے میں ولیج وائس (Village Voice) نے 25/فروری 1980ء کو آئی۔ ایف۔ سٹون (I.F.Stone) کا ایک

مضمون شائع کیا جس میں اس نے بہ بانگ دہل کہا کہ امریکا کو اس بات پر ایران سے معافی مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ ''اس نے 1953ء میں شاہ کی بادشاہت[1] کو بحال کرایا تھا...... یہ ایرانیوں کے لیے کوئی پرانی تاریخ نہیں ہے اور نہ یہ ہمارے لیے ہی کوئی پرانی تاریخ ہے''۔

پریس نے 1979ء کے دوران اسلام اور ایران کو اس قدر ناقص اور ایسے اذیت ناک انداز میں پیش کیا کہ یہ شک کرنا بجا معلوم ہوتا ہے کہ اس سے یرغمالیوں کے بحران کے حل کے بہت سے مواقع ضائع ہو گئے ہوں گے، شاید یہی وجہ تھی کہ ایرانی حکومت نے 1980ء کے اوائل میں یہ تجویز کیا کہ ایران میں اگر غیر ملکی رپورٹروں کی تعداد کم کر دی جائے تو اس سے نہ صرف کشیدگی میں کمی آئے گی، بلکہ پُرامن حل کا امکان بھی پیدا ہو جائے گا، امریکی میڈیا کی ناکامی کی سب سے اہم وجہ یہ رہی ہے کہ اِس انتہائی شدید بحران کے دوران جہاں تک ان عالمی مسائل کا تعلق ہے جو فوری توجہ کے طالب تھے، آزادانہ تجزیہ کرنا اور صحیح معنوں میں ان پر معلوماتی مضامین قلمبند کرنا ممکن نہیں ہوا، یہ ایک ایسی خامی ہے جس کا مستقبل پر بھی اثر پڑے گا، پھر اس بات کی آگاہی بہت کم دکھائی دیتی ہے کہ 1980ء اور 1990ء میں ہم جس نئے دور میں داخل ہو گئے ہیں اُس دور کو ہم غیر ذمہ دارانہ انداز میں دو فریقوں کے درمیان مقابلے کے انداز میں نہیں پیش کر سکے............ ''ہم'' بمقابلہ ''وہ'' کا فلسفہ نافذ نہیں کر سکے، پہلے امریکا بمقابلہ سوویت یونین تھا، اس کے بعد مغرب بمقابلہ اسلام آیا اور اس تمام عرصے میں میڈیا ہمیشہ ''اچھے'' فریق کے ساتھ رہا.....اور اگر اسی طرح چلتے ہوئے ہم اس یقین تک پہنچ گئے کہ یہ مقابلہ ناگزیر ہے تو دو بڑی طاقتیں ایک دوسرے کے ساتھ ٹکراؤ میں پوری دنیا کو تباہ کر دیں گی۔

ہم پر یہ بھی لازم ہے کہ ہم اس بات کا جائزہ لیں کہ 1980ء میں یرغمالیوں کا بحران ختم ہونے اور اس کے اثرات زائل ہونے کے بعد سے میڈیا میں کیا تبدیلیاں آئی ہیں، اس سلسلے میں توجہ طلب بات یہ ہے کہ ایران میں امریکا نے جو کردار ادا کیا ہے، اُس کی بھرپور چھان بین کی گئی ہے، مثال کے طور پر سی بی ایس نے ساٹھ منٹوں کے دو پروگراموں کا بڑا حصہ اس بات کو ظاہر کرنے کے لیے مخصوص کر دیا کہ شاہ کی حکومت

1۔ اس کا تعلق ڈاکٹر محمد مصدق سے ہے، مصدق 1951ء سے 1953ء تک ایران کے وزیر اعظم رہے، وہ ایران کے پہلے منتخب جمہوری رہنما اور غیر ملکی مداخلت کے سخت مخالف تھے، انھوں نے ایران کی تیل کی اس صنعت کو قومی ملکیت میں لیا تھا جس پر برطانیہ کا قبضہ تھا، برطانیہ کو معاوضے کی ادائیگی وجہ نزاع بنی تو انھوں نے پارلیمنٹ توڑ کر ملک کا نظم و نسق سنبھال لیا، انھیں ہٹانے کے لیے برطانیہ اور امریکا کی شہ پر ایرانی فوج نے کارروائی کی، مصدق گرفتار ہو کر تین سال کے لیے جیل میں بند ہو گئے اور رضا شاہ پہلوی کی بادشاہت بحال ہو گئی۔ (مترجم)

کے دوران لوگوں کو کیسی کیسی اذیتوں سے گزارا جاتا رہا اور ہنری کسنجر، شاہ ایران کی طرف سے کیسی کیسی سازشیں کرتا رہا، نیویارک ٹائمز اور واشنگٹن پوسٹ نے بالترتیب سات اور چھ مارچ کو بڑی فرض شناسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ بات عیاں کی کہ سی بی ایس کے پروگراموں کو رکوانے کے لیے حکومت نے کیا کیا جتن کیے ہیں، اُس وقت تک پریس کا رخ بدلنے کی توقع پیدا ہو چکی تھی، اور یہ توقع یوں پوری ہوئی کہ تمام بڑے بڑے اخبارات نے اپریل کے اواخر میں یرغمالیوں کی رہائی کے لیے ہونے والی کوششوں کے متعلق کہانیاں شائع کیں، ان کہانیوں میں شکوک وشبہات اور عدم اطمینان کا اظہار کیا گیا تھا، اسی عرصے میں جہاں اس بات پر اتفاق رائے پہلے سے زیادہ رضامندی کے ساتھ ہوا کہ ایران کے متعلق مختلف آرا رکھنے کی گنجایش موجود ہے، وہاں حکومت کے موقف کے گرد پتھر کی دیوار کھڑی کرنے پر تنقید بھی پہلے سے زیادہ ہوگئی اور امریکی عوام میں یہ احساس ابھر آیا کہ انھیں ایران کے متعلق مکمل بات نہیں بتائی جارہی، امریکی عوام نے اِس احساس کا اظہار ایڈیٹر کے نام خطوط کی شکل میں کیا، تاہم اسلام کے متعلق جارحانہ طرزِ عمل میں کوئی فرق نہیں پڑا، اس سلسلے میں غلط فہمیاں بدستور قائم رہیں اور نیوری پبلک جیسے قدامت پرست جریدوں نے توقع کے عین مطابق اسلام کے خلاف اس طرزِ عمل کی قیادت کا منصب سنبھالا، اس جریدے میں 7/جون 1980 کو ایلی کیدوری کا مضمون شائع ہوا جس کی سرخی تھی ''مغرب نے ملتوی کر دیا'' (The West Defers) اس مضمون میں وہ کہتا ہے کہ جب تک ''مغربی'' قوتوں کا، ایک ''صاف نظر آنے والے انداز میں احترام'' نہیں کیا جائے گا، اُس وقت تک موجودہ بدنظمی جاری رہے گی اور وقتاً فوقتاً یہ متفقہ رائے کہ مغرب کا احترام کرو، اپنا آپ تسلیم کروانے کے لیے دل شکن طریقے اختیار کرتی رہے گی، جب رمزے کلارک (Ramsey Clark) تہران میں ''امریکا کے جرائم'' (Crimes of America) پر ہونے والی کانفرنس میں شرکت کے بعد واپس وطن آیا تو 8/جون 1980 کو اے بی سی نے اپنے پروگرام ''مسائل اور ان کے جواب'' (Issues and Answers) میں اس سے انٹرویو کیا، اُس سے انٹرویو کرنے والوں نے ایک بھی ایسا سوال نہیں پوچھا، جو ایران میں ہونے والی اس کانفرنس کا باریکی سے جائزہ لینے کے زمرے میں آتا، انھوں نے جو پوچھا وہ قطعی دوستانہ نہیں تھا، اور اُس سے یہ بات کسی جھجک کے بغیر ظاہر ہورہی تھی کہ انتظامیہ کا یہ موقف درست ہے کہ کلارک نے ایران جا کر غداری کا ارتکاب کیا ہے؟

اِس جاہلانہ ماحول میں کبھی کبھی اچھے مضامین بھی دیکھنے کو مل جاتے تھے، ان میں ایرانی انقلاب پر جان کفنر کا وہ مضمون بھی تھا جسے چار اقساط میں نیویارک ٹائمز نے 29، 30، 31 مئی اور یکم جون 1980ء کو شائع کیا، اسی موضوع پر 26 جون 1980ء کو شاول بکھاش (Shaul Bakhash) کا مضمون نیو یارک ریویو

آف دی بکس میں شائع ہوا، اِن مضامین میں اِس بات کی بڑی سنجیدہ کوشش کی گئی ہے کہ اُس چیز کو سمجھا جائے جو انقلاب کا تسلسل بھی ہے اور جس کی توانائیاں ابھی اِس طرح قابو میں آنے والی نہیں ہیں کہ انھیں تصوراتی یا مشاہداتی انداز میں بیان کیا جاسکے، تاہم مجھے یقین ہے کہ اگر یرغمالیوں کو بغیر کسی تکرار کے رہا کر دیا گیا ہوتا، تو ایسے مضامین کبھی وجود میں نہ آتے...... اس میں کوئی شک نہیں کہ سفارت خانے پر قبضہ...... غیر اخلاقی، غیر قانونی اور اشتعال انگیز تھا، اور وقتی طور پر یہ سیاسی اعتبار سے ایران کے لیے فائدہ مند تھا مگر آنے والے زمانے میں اِس نے ایران کے لیے نقصان دہ ثابت ہونا تھا...... اس نے عملاً امریکا پر آگاہی کا ایک بحران مسلط کر دیا، دیکھا جائے تو ایران کبھی کا پیش منظر سے اٹھ کر پس منظر میں پوشیدہ ہوگیا تھا، وہ ایشیا میں ایک ایسی کالونی بن چکا تھا، جس سے تابعداری کے سوا کسی اور بات کی توقع ہی نہیں کی جاسکتی تھی، لیکن وہ وقفے وقفے سے یوں ابھرتا چلا گیا کہ امریکا کے لیے اپنا جائزہ لینا لازم ہوگیا، ایران کی کہانی میں ایک استقلال ہے، اس کے اندر سے پھوٹنے والے اضطراب اور توقع کے برعکس اِس کے استحکام کے دورانیے نے رفتہ رفتہ میڈیا کی ایک لگی بندھی اور تنگ نظر سوچ کو بدل کر اُسے تنقیدی اور مفید بنا دیا ہے، مختصر یہ کہ سفارت خانے پر قبضے کے واقعے نے ایران کے متعلق ایک طے شدہ غصے کو، ایک ایسے راستے پر ڈال دیا ہے، جس پر چلتے ہوئے اس عمل نے اپنی ایک تاریخ بھی مرتب کر لی ہے، اِس تاریخ نے میڈیا اور عمومی طور پر امریکیوں کو اُن کے اپنے متعلق اتنا کچھ بتا دیا ہے، جتنا انھیں پہلے معلوم نہیں تھا، مگر یہاں تو سوال یہ ہے کہ کیا جن جنگجوؤں نے سفارت خانے پر قبضہ کیا تھا، اُن کا مقصد امریکیوں کو آئینہ دکھانا تھا، یا اِس واقعے سے ایران میں حالات معمول پر آنے کے بجائے تاخیر کا شکار ہوتے چلے گئے تھے، یہ ایسے سوالات ہیں جن کا جواب ابھی ملنا ممکن نہیں ہے، البتہ یہ بات یقینی ہے کہ پہلے سے زیادہ امریکی یہ بات جان چکے ہیں کہ طاقت کے حصول کے لیے جدوجہد کے معنی کیا ہوتے ہیں، کیا یہ سچ نہیں ہے کہ اُنھوں نے بنی صدر اور بہشتی کے درمیان اختلاف میں (امام) خمینی کے پراسرار انداز کو اِن کے پیچھے متحرک پایا ہے؟ اور یقیناً پہلے سے زیادہ امریکی اِس بات کو سمجھنے لگے ہیں کہ ہم نے اِس انقلاب پر اور عراق ایران جنگ پر اپنے حکم کو لاگو کرنے کی لاحاصل کوشش کی تھی، ہم جس مقام تک آپہنچے ہیں، یہاں بھی کئی سوالات کے جوابات ادھورے ہیں، اِن میں یہ سوال بھی ہے کہ وہ کون سے حالات تھے، جنھوں نے بہشتی کو برتری دلوائی، دائیں اور بائیں بازو کے درمیان کشمکش کی صورتیں کیا تھیں اور ایران کے اقتصادی حالات کیسے تھے...... اِس طرح کی اور بے شمار باتیں تھیں، جن کے متوقع نتائج ہمارے اردگرد منڈلاتے تو ضرور رہے، مگر جن کا بھید کھلا نہیں۔

اب تک جن باتوں کی چھان بین نہیں کی گئی اور جن کا تذکرہ ضروری بنتا ہے اُن میں وہ سوال شامل ہیں، جو بحران کی تہ میں موجود ہیں، اِن میں یہ سوال بھی آتے ہیں کہ ایران کیوں اتنا اہم ہے، اسلام کیوں اتنا اہم ہے اور اِن دونوں کے متعلق کس طرح کے علم اور کیسی کوریج کی ضرورت ہے؟ تین سوالوں کا یہ مجموعہ کوئی تجریدی نوعیت کا نہیں ہے، اسے معاصر سیاست کے نہ صرف لازمی جزو کے طور پر لینا ہوگا، بلکہ اِسے اُس دانشمندانہ چھان بین اور تشریح وتفسیر کی ان سرگرمیوں کا بھی اہم حصہ قرار دینا ہوگا، جن میں دوسرے معاشروں کا علم سمویا ہوا ہے، لیکن اگر اس زمرے میں ہم طاقت اور علم کے تعلق کو فریب سے پاک نظر سے نہیں دیکھیں گے، تو ہم معاملات کے مرکزی نقطے سے بھٹک کر کہیں اور جا نکلیں گے، اِس مقام سے ہمیں اپنی تحقیق وجستجو کو اِن ہی خطوط پر آگے بڑھانا ہوگا۔

باب سوم

علم اور طاقت

باب سوم

اسلامی تشریح میں سیاست کا عمل دخل

(حصہ اوّل)

موجودہ حالات میں جبکہ ''اسلام'' اور ''مغرب'' نہ تو ایک دوسرے کے ساتھ اور نہ اپنے لیے ہی پرامن رہے ہیں یہ سوال بڑا بے معنی معلوم ہوتا ہے کہ کیا ایک ثقافت کے ارکان کے لیے واقعی یہ ممکن ہے کہ وہ دوسری ثقافتوں کے بارے میں علم حاصل کر سکیں، جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، تو علم کے بارے میں اس کا یہ مقولہ (حدیث) بڑا مشہور ہے کہ علم حاصل کرو چاہے تمہیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے، اسی طرح مغربی تہذیب میں بھی اس سے ملتی جلتی جو بات ہم تک پہنچی ہے اس کی ابتدا کا کم از کم پتا یونانی تہذیب تک لگتا ہے اور ان کا مقولہ یہ ہے کہ انسان اور قدرت سے تعلق رکھنے والے علم کا حصول لازم ہے، لیکن اس سلسلے میں جہاں تک مغربی مفکرین کی تحقیق کے نتائج کا تعلق ہے تو عام طور پر ان نتائج کو ناقص سمجھا جاتا ہے، یہاں تک کہ بیکن (Bacon) کی جس کتاب ''علم کی ترقی'' (Advancement of Learning) کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس نے علم حاصل کرنے کی بڑی پر جوش انداز میں حوصلہ افزائی کی ہے اور موجودہ رجحان کی بنیاد رکھی ہے، وہ بھی دراصل ان شکوک وشبہات میں الجھی ہوئی نظر آتی ہے کہ کیا علم کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو واقعی ہٹایا جاسکتا ہے اور علم سے غافل رہنے کے لیے عقیدت کے جو بت تراش لیے گئے ہیں کیا انھیں توڑا جاسکتا ہے، اس سلسلے میں بیکن کا شاگرد وئیکو (Vico) یہ بات زیادہ کھل کر کہتا ہے کہ انسانوں کا علم اسی قدر ہے، جس قدر وہ اس تک پہنچ گئے ہیں، چنانچہ ہمیں جو بیرونی حقیقتیں محسوس ہوتی ہیں ان کی حیثیت ''انسانی ذہن میں ہونے والی تبدیلیوں'' کے سوا کچھ بھی نہیں اور وہ بامقصد علم جس کے حصول کے امکانات دور دور، اجنبی اور دھندلے دھندلے دکھائی دے رہے تھے، وہ نطشے (Nietzsche) کے بعد مزید دور ہو گئے ہیں۔

شکوک وشبہات اور مایوسی کی اس لہر کے برخلاف مغرب میں اسلام کے طالب علم عام طور پر نہ صرف بڑے پراعتماد تھے بلکہ وہ پریقین ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے اظہار میں بھی دوسروں سے آگے آگے تھے، یہی کیفیت اسلامی دنیا میں مغربی علم سیکھنے والوں کی تھی، مگر مغربی علم سیکھنے والے چونکہ میرا موضوع نہیں ہیں، اس

لیے میں انھیں زیر بحث نہیں لاؤں گا اور بات کو اسلام کے طالب علموں تک محدود رکھوں گا، آج کے جدید دور کے ابتدائی مرحلے میں یورپ کے اندر جو مستشرقین اٹھے، اگر ان پر نظر ڈالی جائے تو پتا چلتا ہے کہ انھیں اس میں قطعی کوئی شک نہیں تھا کہ اس مشرق کا مطالعہ جس میں اسلامی دنیا بھی شامل ہے، اس شاہی راستے کی مانند ہے جو کائناتی علم کی طرف جاتا ہے، بیرون دی ایکسٹین (Baron d' Eckstein) بھی ایک ایسا ہی مستشرق ہے، اس نے 1820ء میں لکھا تھا کہ:

> ''جس طرح کوویئر (Cuvier) اور ہم بولات (Humboldt) نے زمین کے اندرونی حصے کی قدرتی ساخت کے اسرار پر سے پردہ اٹھایا ہے، اسی طرح ابیل ری موسات (Abel Remusat)، سینٹ مارٹن (Saint Martin)، سلوسٹر ڈی سیکی (Silvestre de sacy)، بوپ (Bopp)، گرائم (Grimm) اور اے ڈبلیو چ لی گل (A.W.Schlegel) سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ انسانی سوچ کے اندرونی نظام اور اس کی قدیم ساخت کی تمام بنیادوں کو زبانوں کے الفاظ میں سے ڈھونڈ نکالیں گے''۔

ایکسٹین کے چند برس بعد ارنسٹ رینان (Ernest Renan) نے ''(حضرت) محمد (ﷺ) اور اسلام کے ماخذ'' (Mahomet et les Origines de L' islamisme) پر اپنے مباحثوں کو کتابی شکل دی، تو اس نے ابتدائیے میں ہی یہ بات کہہ دی کہ اس کی اس کاوش ''نے تنقیدی سائنس'' (La science critique) کا دروازہ کھول دیا ہے، رینان کا کہنا ہے کہ بنیادی اور اصل حیثیت تو اس قدیم ترین قدرتی شے کی ہے، جس سے یہ سلسلہ شروع ہوا ہے اور یہ شے مختلف ادوار سے گزرتے ہوئے اپنے نشانات چھوڑتی چلی گئی ہے، چنانچہ ماہرین ارضیات، تاریخ دان اور ماہرین لسانیات، اگر ان انسانوں کا صبر اور نفاست سے جائزہ لیں تو وہ اصل تک پہنچ سکتے ہیں، اس سلسلے میں اسلام بڑا قیمتی مظہر ہے، اس کا ظہور نہ صرف مقابلتاً قریبی زمانے میں ہوا ہے، بلکہ اس نے اپنا تعلق ایک ایسی لڑی[1] کے ساتھ جوڑ رکھا ہے، جو ماضی میں دور تک چلی گئی ہے، وہ اپنی بات کو اس موڑ پر لاکر ختم کرتا ہے کہ اس تناظر میں اسلام کا مطالعہ کسی ایسی چیز کا مطالعہ ہے، جس سے حقیقی اور سائنسی دونوں علوم حاصل ہو سکتے ہیں۔

شاید اسی خوشگوار رویے کی بدولت، اسلامی علوم شرقیہ کی تاریخ شکوک وشبہات کی لہروں سے بڑی حد تک پاک رہی ہے اور زمانہ حال تک یہ ان سوالوں کے دائرے میں نہیں آتی، جنھیں خود احتسابی کہتے ہیں،

1۔ مراد عیسائیت، یہودیت اور ابتدائے آدم سے ہے۔ (مترجم)

ادھر مغرب میں اسلام کے طالب علموں کی اکثریت کو یقین ہے کہ وقت اور زمانے کی پابندیوں کے باوجود، نہ صرف اسلام کے متعلق صحیح معنوں میں بامقصد معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں، بلکہ اسلامی زندگی کے کچھ پہلوؤں کے متعلق علم حاصل کرنا بھی ممکن ہے، دوسری طرف دور جدید کے چند سکالر ہی ایسے ہوں گے، جو اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے رینان کی طرح منہ پھٹ ہو جائیں گے اور اس کی طرح یہ کہہ سکیں گے کہ اسلام کو سمجھنا اس لیے آسان ہے کہ یہ نہ صرف بنیاد پرستی کی نمائندگی کرتا ہے بلکہ اس کا ترقیاتی عمل ایک مقام تک پہنچ کر رک چکا ہے، تاہم عصر حاضر میں، میں نے کسی ایسے اسلامی سکالر کو نہیں دیکھا، جس کے لیے اس کام کا بیڑا اٹھانا ہی شکوک وشبہات کا ذریعہ بن گیا ہو، میں سوچتا ہوں کہ اسلامی مطالعے کے لیے دانشوروں کی تنظیم قائم کرنے کی روایت نے جو دو سو سال سے نسل در نسل چلی آرہی ہے، نہ صرف انفرادی سکالروں کو تحفظ فراہم کیا ہے، بلکہ دوسرے انسانی علوم کے سکالروں کو، طریق کار کے جن خطرات نے گھیر رکھا تھا اور جو تبدیلیاں انھیں چیلنج کر رہی تھی، وہ کیفیت اسلامی مطالعے کی کبھی نہیں ہوئی، اس لیے اسلامی سکالروں کے کام کی تصدیق ہوتی چلی گئی۔

میں کیا کہنا چاہتا ہوں اس کی صحیح ترجمانی حال ہی میں شائع ہونے والے مضمون ''مشرق وسطی کے مطالعے کی صورت حال'' (The State of Middle Eastern Studies) سے ہوتی ہے، یہ مضمون امریکن سکالر[1] (American Scholar) نے اپنے 1979ء کے موسم گرما کے شمارے میں شائع کیا تھا، اسے برطانیہ کے معروف اسلامی سکالر نے لکھا ہے اور وہ خود اس وقت امریکا میں رہائش اختیار کر چکا ہے اور وہیں کام بھی کر رہا ہے، اگر اس مضمون کو مجموعی طور پر دیکھا جائے، تو یوں معلوم ہوتا ہے، جیسے یہ ایک ایسے ذہن کی پیداوار ہے، جو روزمرہ کی چیزوں کا کسی دلچسپی کے بغیر اور سستی کے ساتھ جائزہ لینے کا عادی ہے، تاہم کسی ایسے شخص کو جو ایسے معاملات کی مہارت نہیں رکھتا، ادبی معاملات میں اس مصنف کی بڑھی ہوئی لاتعلقی کے علاوہ، یہ بات بھی بڑی حیران کن لگے گی کہ اس نے علوم شرقیہ کا ایک فرضی ثقافتی شجرہ درج کر دیا ہے۔ یہاں اس مضمون کے اقتباس کا حوالہ ضروری بنتا ہے۔

> یورپ کی نشاۃ ثانیہ نے مغربی دنیا میں اسلام اور مشرق وسطی کے مطالعے کے ایک نئے دور کی ابتدا کی ہے اور اس مرحلے کا شاید سب سے اہم عنصر ایک طرح کا وہ ادبی تجسس تھا جو انسانی تاریخ میں ابھی تک بڑا انوکھا معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس وقت تک ان

1۔ ایڈورڈ سعید نے اس سکالر کا نام نہیں دیا۔ (مترجم)

اجنبی تہذیبوں کے مطالعے کی، جو معاندانہ تھیں، نہ تو کوئی لائق موازنہ خواہش محسوس کی گئی تھی، نہ اس سلسلے میں کوئی کوشش ہی ہوئی تھی، البتہ کئی معاشروں نے اپنے ایسے پیشروؤں کے مطالعے کی کوشش کی تھی، جن کے متعلق وہ محسوس کرتے تھے کہ وہ ان کے نہ صرف ممنون ہیں بلکہ انھیں جو حاصل کرنا ہے، وہ ان ہی لوگوں سے حاصل کر سکتے ہیں پھر ایسے معاشرے بھی جن پر کسی اجنبی اور طاقتور ثقافت کا تسلط تھا، ہم نے دیکھا کہ ان معاشروں کو طاقت کے ذریعے یا دوسرے طریقوں سے اس بات پر مجبور کر دیا گیا کہ وہ ان لوگوں کی زبان اور اطوار سیکھیں، جنھوں نے انھیں مغلوب کر رکھا ہے، معاشروں نے اپنے آقاؤں کا مطالعہ، اس لفظ آقا کے ہر دو معنوں میں کیا ہے،......لیکن نشاۃ ثانیہ کے بعد کے دور میں جس طرح کی کوشش، یورپ نے دور افتادہ اور اجنبی معاشروں کے مطالعے کے لیے کی ہے، وہ اپنے آپ میں نئی اور قطعی مختلف ہے اور اس میں یہ بات بڑی نمایاں ہے کہ آج کے مشرق وسطیٰ کے عوام ایک دوسرے میں بہت کم دلچسپی رکھتے ہیں اور ایشیا اور افریقہ کی دوسری غیر اسلامی ثقافتوں میں تو دلچسپی اس سے بھی کم ہے؛ مشرق وسطیٰ کی یونیورسٹیوں میں سے اگر کہیں بھارت اور چین کی زبان اور تہذیب کو سمجھنے کی کوئی سنجیدہ کوشش کی گئی ہے، تو وہ ترکی اور اسرائیل ہیں، اس خطے کے یہ دو ایسے ملک ہیں جنھوں نے شعوری طور پر مغربی طرز زندگی کو اختیار کیا ہوا ہے۔

ابھی تک غیر یورپی تہذیبوں کو اس قسم کے ادبی تجسس کو سمجھنے میں بہت دشواری پیش آ رہی ہے، جب مصر اور دوسرے آثار قدیمہ کے ماہرین نے پہلی بار مشرق وسطیٰ میں کھدائی کا عمل شروع کیا، تو بہت سے مقامی لوگوں کے لیے اس بات پر یقین کرنا ممکن نہ تھا کہ غیر ملکی اتنا زیادہ وقت صرف کرنے، جدوجہد کرنے، پیسہ خرچ کرنے، بے شمار تکلیفیں اٹھانے اور خطرات مول لینے کو، صرف اس لیے تیار ہیں تاکہ ان کے ان آباواجداد کی یادگار اشیا کھود نکالیں، پرانی اور ناقابل فہم زبان کو سمجھیں اور پڑھیں، جنھیں ان مقامی باشندوں نے کبھی کا فراموش کر دیا ہے، چونکہ انھیں یہ بات سمجھ نہیں آتی، اس لیے انھوں نے اس کی دوسری تاویلات ڈھونڈ نکالیں، سادہ لوح دیہاتیوں کے لیے

آثار قدیمہ کے ماہرین، مدفون خزانوں کے متلاشی تھے، جبکہ زیادہ سمجھدار شہریوں کی نظر میں، وہ اپنی حکومتوں کے یا تو جاسوس تھے یا کسی اور قسم کے ایجنٹ تھے، اس میں قطعی شک نہیں کہ بعض ماہرین آثار قدیمہ خزانوں کے متلاشی بھی ہوئے اور اپنی سرکار کے ایجنٹ بھی بنے اپنے علم کو اس طرح کے نئے معنی پہنانے کی یہ غلطی کوئی معمولی غلطی نہیں تھی اور اس سے یہ ظاہر ہوا کہ ان کے ذمے جو کام لگایا گیا تھا وہ اس کی اہمیت کو پہچاننے سے قاصر تھے مگر اس کوتاہی کے باوجود انھوں نے انسانوں کی تاریخ میں ایک ایسے نئے باب کا اضافہ ضرور کیا جس نے مشرق وسطیٰ کی اقوام کے لیے ایسی نئی جہتیں فراہم کر دیں، جن سے انھیں اپنے متعلق آگاہی حاصل ہوئی، چیزوں کو سمجھنے اور ان کی اہمیت کا صحیح اندازہ لگانے کی یہ مشکل آج کے دور تک جاری رہی ہے، کئی اہل علم بھی اس کے زیر اثر آئے ہیں اور آج مقامی باشندوں کے ساتھ ساتھ کئی اہل علم بھی یہ سمجھتے ہیں کہ مستشرقین یا تو خزانوں کے متلاشی ہوتے ہیں یا اپنے بادشاہ کے ایجنٹ،

اس نئے علمی تجسس کی تسکین ان بحری سفروں نے بھی کی، جنھیں یورپی باشندوں نے اختیار کیا، سمندر پار کر کے نئی اور اجنبی سرزمینوں تک پہنچے، دانشوروں نے تصورات اور نظریات کے جو سانچے تیار کر رکھے تھے، ان نئی دریافتوں سے وہ ٹوٹ گئے اور مطالعے کو آگے بڑھانے کے لیے تحریک بھی ہوئی اور مواقع بھی میسر آ گئے۔

اس تحریر میں تائید سے عاری دعوے کچھ اس طرح بڑھا چڑھا کر پیش کیے گئے ہیں کہ مستشرقین کی ایک معقول تعداد نے جو کچھ خود لکھا ہے یا یورپی تاریخ دانوں نے نشاۃ ثانیہ سے آج تک تحریر کیا آگسٹن (Augustine) اور اس کے بعد آنے والے تشریحات کی تاریخ کے طالب علموں نے جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ سب رد ہو جاتے ہیں، اگر ہم ''نئے اور قطعی مختلف'' والی بات کو ایک طرف رکھ دیں اور یہ فرض کر لیں کہ خالص ادبی تجسس کی کیفیت یہ ہے کہ کسی بھی دستاویز کا مطالعہ کرنے اور اس کی تشریح کے لائق ہو جانے کے بعد بھی کوئی شخص اس پر کامل دسترس حاصل نہیں کر سکا، کیونکہ یہاں اتنا کچھ ہے، اتنا ڈھیر لگا ہوا ہے کہ اسے اعتماد اور ایمان کی بنیاد پر ہی قبول کیا جا سکتا ہے، ڈونلڈ لیچ (Donald Lach) یا جے ایچ پیری (J.H. Parry) جیسے ثقافت اور نوآبادیات کے تاریخ دانوں کو پڑھنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ عموماً تجارت، فتوحات یا کسی حادثے کے نتیجے میں جب اجنبی ثقافتوں کا سامنا ہوتا ہے تو اس سے ان ثقافتوں کے متعلق یورپی باشندوں میں دلچسپی

پیدا ہوتی، اور اس دلچسپی کو ضرورت جنم دیتی ہے، اور ضرورت کا تعلق بھوک، خوف اور تجسس وغیرہ سے ہوتا ہے، اور جہاں اور جب انسان کسی جگہ زندگی بسر کرتا ہے، تو یہ ضرورتیں اسے گھیر لیتی ہیں۔

اس کے علاوہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ کسی دوسری ثقافت کی تشریح اس وقت تک کیونکر کی جا سکتی ہے جب تک کہ حالات، اس ثقافت کو تشریح کے لیے دستیاب نہیں کر دیتے؟ اور اجنبی ثقافت میں جہاں تک یورپی باشندوں کی دلچسپی کا تعلق ہے تو یہ حالات ہمیشہ یا تو تجارتی رہے ہیں یا مقصد نوآبادیات قائم کرنا، یا فوجی توسیع، فتوحات یا سلطنت کا قیام رہے ہیں، یہاں تک کہ جب علوم شرقیہ کے سکالر انیسویں صدی میں جرمنی کی یونیورسٹیوں میں سنسکرت کے مطالعے، احادیث کو منضبط کرنے، خلافت کی وضاحت کرنے میں مصروف تھے، تو انھوں نے خالص تجسس کے افسانے پر نہیں بلکہ یونیورسٹیوں پر، لائبریریوں پر، دوسرے سکالروں اور ان سماجی معاوضوں پر بھروسا کیا جنھوں نے انھیں اس پیشے کو اختیار کرنے کا حوصلہ دیا، صرف ڈاکٹر پنگ لوس (Dr. Pangloss) یا لگاڈو میں پراجیکٹروں کی سوفٹ اکیڈمی (swift's Academy of Projectors) کا کوئی رکن ہی گولیور کے سفرنامے (Gulliver's Travels) جیسی قوت متحرکہ کے ذریعے، عظیم یورپی مملکت اور اس کے اس علم کو اصولی طور پر حاصل کر سکتا ہے جو اس کے ساتھ وابستہ ہیں، اور اس طرح ان کے ''نئے ادبی تجسس کی تسکین بھی ہو جائے گی'' مگر یہ بات اپنی جگہ جوں کی توں رہے گی کہ اندھیروں میں ڈوبے ہوئے جن غیر یورپی باشندوں نے ان سکالروں کے ''ادبی تجسس'' کو شک وشبے کی نظر سے دیکھا تھا اور کبھی ان پر اعتبار نہیں کیا تھا، ان کا شک اپنی جگہ قائم رہے گا، اس لیے کہ کسی غیر مغربی ملک میں مغربی سکالر چاہے علامتی طور پر یا بالواسطہ طور پر آیا اس کی آمد سے یہی مطلب اخذ کیا جائے گا کہ وہ اس ملک پر مغربی قوت کو حاوی کرنا چاہتا ہے، یہ بات ''اس'' مستشرق کی لاعلمی اور اس کے باطل زعم کو نمایاں کرتی اور بتاتی ہے کہ اسے علم الانسان کے میدان میں ہونے والی اس بحث کا قطعی علم نہیں ہے جو شہنشاہیت اور انسانی نسلوں کے علم کے درمیان سازشوں پر ہو رہی ہے، لیوی سٹراس (Levi Strauss) جیسی ممتاز چینی شخصیت نے اگر تاسف کا نہیں تو اس شک کا ضرور اظہار کیا ہے کہ شہنشاہیت، علم النسل کے دائرۂ عمل کو تعمیر کرتی ہے۔

خالص تجسس کے خلاف اگر احتجاج کو مسترد بھی کر دیا جائے تو اس کے باوجود ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ مشرق وسطیٰ کے متعلق جس قدر دلائل پیش کیے جا رہے ہیں وہ دراصل دفاع ہے اس بات کا کہ دور افتادہ اور اجنبی معاشروں کے متعلق ثقافتی اور تاریخی حوالوں سے جو بیان کیا جاتا ہے وہ نقائص سے پاک اور سچ ہوتا ہے، آگے چل کر اس مضمون میں اس نکتے کی مزید وضاحت کرتے ہوئے یہ حوالہ بھی آیا کہ اس شعبے کو سیاست

کے زیر اثر لانے کے خطرات اپنی جگہ اتنے قوی ہوتے ہیں کہ ان سے صرف چند سکالر اور کچھ شعبے ہی بچنے میں کامیاب رہے ہیں، یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہاں سیاست کو تنگ نظری کے ساتھ اس طرح جوڑا گیا ہے جیسے ایک صحیح سکالر دنیاوی ضرورتوں سے بلند ہوتا ہے، ہمیشہ خیالات، دائمی اقدار اور اعلیٰ اصولوں میں ڈوبا رہتا ہے اور ان تمام دلائل کی خوبی یہ ہے کہ انھیں درست ثابت کرنے کے لیے مثالیں بھی نہیں دی گئیں، اس تمام مضمون کے متعلق سب سے دلچسپ نکتہ یہ ہے کہ اس میں سائنس اور سائنسی طریق کار کے محض ذکر کو ہی کافی سمجھ لیا گیا ہے، جب ہم اس نکتے کی طرف آتے ہیں کہ مشرق وسطیٰ کے غیر سیاسی مطالعے کی اصل حقیقت کیا ہے یا کیا ہو سکتی ہے تو مصنف اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کہتا، دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کے نزدیک صرف دانشوری کا رویہ، انداز، لفاظی اور نظریہ معنی رکھتا ہے، نفس مضمون کوئی معنی نہیں رکھتا، اور سب سے بری بات یہ ہے کہ غیر جانبدارانہ اور غیر سیاسی دانشمندی کے مفروضے کو درست ثابت کرنے کی خاطر، جان بوجھ کر دنیاداری اور علم ودانش کے تعلق کو چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

یہ بات ہمیں اس شعبے کے متعلق تو کم بتاتی ہے جس پر مصنف نے قلم اٹھایا ہے مگر مصنف کے متعلق زیادہ بتاتی ہے، یہ ایک ایسی بدقسمتی ہے جس نے آج کے دور کے ان تمام یورپی یا مغربی باشندوں کو جکڑ رکھا ہے جو غیر مغربی معاشروں کے متعلق اپنے خیالات تحریر کرتے ہیں، اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرے شعبوں کے سکالروں کو اس مشکل کا علم ہو چکا تھا اور صرف غیر مغربی معاشروں کا مطالعہ کرنے والے سکالر اس سے بے خبر تھے، ایسا قطعی نہیں تھا، 1973ء میں مشرق وسطیٰ کے مطالعاتی ادارے (Middle East Studies Association) نے فورڈ فاؤنڈیشن کے تعاون سے ماہرین کی ایک ٹیم تیار کی اور انھیں اس سارے شعبے کا سروے کرنے کی ذمہ داری سونپی، اس ٹیم نے اس کی ضرورتوں، اس کی کامیابی کے امکانات اور اس کے مسائل کا جائزہ لینے کے بعد ایک ضخیم کتاب تیار کر لی جس کا نام ''مشرق وسطیٰ کا مطالعہ: انسانیت اور معاشرتی علوم کی تحقیق اور دانشوری (The Study of the Middle East: Research and Scholarship in the Humanities and the Social Sciences) رکھا گیا، اس کتاب کو لیونارڈ بائنڈر (Leonard Binder) نے مرتب کیا ہے اور اسے 1976ء میں شائع کیا گیا، چونکہ یہ کتاب ایک سے زیادہ لوگوں نے لکھی ہے اس لیے اس میں روانی نہیں ہے، پھر اس میں شروع سے آخر تک ایک بحرانی اور عجلت کی سی کیفیت صاف معلوم ہوتی ہے جو بری طرح کھٹکتی ہے، یہ ایک ایسی چیز ہے جو امریکن سکالر نامی رسالے میں شائع ہونے والے مضمون میں نظر نہیں آتی، اس اعتبار سے سکالروں کے اس گروپ کے لیے جو اپنے برطانوی ہم منصبوں سے کسی طرح بھی کم ممتاز نہیں ہے، مشرق وسطیٰ

کا اتنا ضخیم مطالعہ مکمل اور مرتب کرنا کسی صورت میدان کارزار سے کم نہ تھا، اس لیے اس کی طرف نہ تو زیادہ توجہ دی گئی ہے، نہ معقول سرمایہ فراہم کیا گیا ہے اور نہ اتنے سکالروں کی خدمات حاصل کرنا ہی ممکن ہوا ہے، جتنے سکالروں کی اس مطالعے کے لیے ضرورت تھی، مشرق وسطیٰ کے اس مطالعے کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ مشرق وسطیٰ کے مطالعاتی ادارے کی تحقیقی اور تربیتی کمیٹی کے جس رکن نے سب سے پہلے اس مطالعے کی تجویز پیش کی تھی، وہ بذات خود ایسی کاوشوں کا مخالف تھا اور چند سال پہلے امریکی حکومت کے لیے مشرق وسطیٰ کے مطالعے کے سلسلے میں اس نے اپنی رائے مرتب کی تھی، جس میں اس نے اسلام اور عربوں کے خصوصی مطالعے کی ضرورت کو بڑی حقارت سے ٹھکرا دیا تھا اور اس کی وجہ یہ بیان کی تھی کہ اسلام اور عربوں کا مطالعہ ثقافت اور سیاست دونوں حوالوں سے امریکا کے لیے ثانوی حیثیت رکھتا ہے، اب آیئے ان سکالروں کی طرف جنھیں مشرق وسطیٰ کا مطالعہ میدان کارزار لگتا ہے، اس سلسلے میں ان کے مسائل کو لیونارڈ و بائنڈر نے بڑے سیدھے اور سادے انداز میں کتاب کے تعارف کے اندر بیان کر دیا ہے۔

بائنڈر پہلے ہی جملے میں یہ بات واضح کر دیتا ہے کہ ''امریکا میں علاقائی مطالعوں کو عام کرنے کا مقصد ہمیشہ سیاسی رہا ہے''۔ یہاں سے اپنی گفتگو کا آغاز کرنے کے بعد وہ مشرق وسطیٰ میں دور جدید کے ماہرین کو پیش آنے والے انتظامی اور فلسفیانہ مسائل کی طرف آتا ہے، اور ایسا کرتے ہوئے وہ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرتا کہ مشرق وسطیٰ کے مطالعے میں وہ معاشرہ بھی شامل ہے، جس میں یہ مطالعہ ہو رہا ہے، چنانچہ اپنے سروے کے آخر میں کسی لگی لپٹی کے بغیر وہ کہتا ہے کہ اس موضوع سے متعلق بنیادی سوالات بھی اقدار سے آزاد نہیں ہوتے، مثال کے طور پر کسی شخص کو اگر سماجی ڈھانچوں یا مذہب کا مطالعہ کرنا ہے یا یہ جاننا ہے کہ سکالر کے لیے سیاسی ڈھانچا فی کس آمدنی سے زیادہ اہم ہیں یا کم اہمیت رکھتا ہے، تو اسے ان کی ایک قیمت مقرر کرنا ہوگی، بائنڈر اتنا کہنے کے بعد اس طرف آتا ہے کہ اگرچہ مشرق وسطیٰ کے مطالعے کی قیمت کا تعین، زیادہ تر صورتوں میں حکومت کی اطلاعات کی بہ نسبت کہیں زیادہ مشکل کام ہوتا ہے مگر اس سے مفر ممکن نہیں ہوتا، بائنڈر آخر میں اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ وہ اس بات کا اختصار نامہ بنا کر پیش کرے کہ مغربی طلبہ اجنبی ثقافت کے مطالعے سے جو سچ ڈھونڈ نکالتے ہیں، اس پر سیاست کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

وہ اس بات کو بلا جھجھک تسلیم کرتا ہے کہ سکالر کو ''اقدار کی ان سمتوں'' کا علم ہوتا ہے، جو علمی کاوش کے دوران ظاہر ہوتی ہیں، ان کے ظاہر ہونے کے بعد ''نظم وضبط کی معیاری سمتیں'' ذاتی نوعیت کے ''عارضی فیصلوں'' کے ان اثرات کو کم کر دیتی ہیں جو بار بار توجہ کو اصل موضوع سے ہٹا دیتے ہیں، بائنڈر یہاں یہ

وضاحت نہیں کرتا کہ ''نظم وضبط'' یہ عمل کیونکر انجام دیتا ہے اور نہ وہ اس بات کو کھولتا ہے کہ ''نظم وضبط'' میں آخر کیا بات ہے کہ وہ انسانی فیصلوں کو آفاقی تجزیوں میں بدل دیتے ہیں، یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان سوالات کو نمٹانے کے لیے ہی اس نے اپنے دلائل کے آخر میں ایک بیان منسلک کر دیا، جو مبہم بھی ہے اور غیر ضروری بھی اور اس نے جو بات پہلے بیان کر دی ہے، اس سے اس کا تسلسل بھی قائم نہیں ہوتا، اس بیان میں وہ کہتا ہے کہ علاقے کی مناسبت سے جو اخلاقی مسائل پیدا ہوتے ہیں، ان کی چھان بین کے طریقے ہمیں ''نظم وضبط'' بتاتا ہے، یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کون سے اخلاقی مسائل؟ کیسا طریق کار؟ کس علاقے کی کون سی نسبت؟ مگر اس کے مضمون میں اس کی کوئی وضاحت نہیں ملتی، پھر اپنے مضمون سے وہ جو نتائج اخذ کرتا ہے، وہ تذبذب کا شکار کر دیتے ہیں، ''نظم وضبط'' پر اعتماد نہیں رہتا، اور نہ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ ''نظم وضبط'' آخر کس چیز کے لیے ہے۔

جب اس بات کو تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ مشرق وسطیٰ کے مطالعے پر ایک سیاسی دباؤ موجود ہے، تو اس سے معاملہ حل نہیں ہوتا کیونکہ ایک شوریدہ رجحان یہ بھی ہے کہ اس قسم کے دباؤ کو پس پشت ڈال کر اور مستشرقین کے مباحثوں کی حاکمیت کو پھر سے بحال کر دیا جائے، اس بات کا ایک بار پھر تذکرہ ضروری ہے کہ حاکمیت براہ راست اس طاقت سے آتی ہے، جو مغربی ثقافت کے اندر موجود ہے، اور مشرق یا اسلام کے طلبہ کو اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ وہ اسلام اور مشرق کے متعلق ان بیانات کا سلسلہ جاری رکھیں، جنھیں برس ہا برس سے کسی نے چیلنج نہیں کیا، یہی طاقت یہ فیصلہ کرتی ہے کہ مستشرقین کے سوا مشرق کے متعلق کون بات کرے گا، اور کون اس بات کو جاری رکھے گا؟ نہ تو انیسویں صدی کے مستشرقین کو اور نہ لیونارڈ و بائنڈر جیسے بیسویں صدی کے سکالروں کو ہی یہ شک ہے کہ مشرق نے اور ان اہل مشرق نے جو کبھی خود زیر مطالعہ آئے اور کبھی اطلاعات فراہم کرنے والے بنے، مغربی ثقافت کو ہمیشہ وہ سب معلومات فراہم کی ہیں جو انھیں درکار تھیں، نتیجہ یہ ہوا کہ جس کسی نے بھی انضباط کی زبان بولی، اس کے نظریات کی صف بندی کی، اس کی تکنیک کو استعمال کیا، اس نے سند حاصل کر لی اور اس لائق ہو گیا کہ تعصبات اور فوری نوعیت کے حالات کو پھلانگتا ہوا سائنسی بیان دینے کے مقام تک جا پہنچے، جب اسے اپنی اس قوت کا ادراک ہو جاتا ہے کہ وہ خود کفیل ہو گیا ہے، اب اس نے اپنی تصحیح، اپنے فیصلوں کی توثیق خود کرنا ہے تو یہ احساس اسے مستشرق کی وہ لفاظی عطا کرتا ہے، جو اسے اپنی ذات سے بلند کر دیتی ہے، بائنڈر کے مطابق مشرق کے عوام نہیں بلکہ ان کے ضابطے، معیاری مسائل کو عام اصطلاحوں میں بیان کرتے ہیں، وہ کہتا ہے کہ نہ تو اس علاقے کے عوام کی خواہش، نہ روزمرہ کی زندگی کی اخلاقیات، بلکہ

ضابطے'' ہمیں وہ طریقے سمجھاتے ہیں جن کے ذریعے ان اخلاقی مسائل کی چھان بین کی جاسکتی ہے، جو علاقے کی نسبت سے ابھر کر سامنے آتے ہیں''۔

اسی لیے ایک طرف تو ''ضابطے'' ایک سرگرمی سے بڑھ کر ''انجمن'' کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں اور دوسری طرف وہ جس چیز کا مطالعہ کرتے ہیں، اسے اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ باقاعدہ اور معمول کے مطابق بناتے ہیں، جتنی تیزی کے ساتھ وہ اپنا تجزیہ کرتے اور اس پر غور وفکر کرتے ہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں، وہ جس چیز کا مطالعہ کرتے ہیں ایک اعتبار سے اسے انھوں نے ہی تخلیق کیا ہوتا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح کے عمل کا نتیجہ بار بار کی ایسی مداخلت ہو سکتا ہے جسے ہم دوسری ثقافت کے مکمل علم کا نام دے سکتے ہیں، یہ بات درست ہے کہ اسلام کے مطالعے میں بڑی اہم کامیابیاں ہوئی ہیں، ایسی عبارتیں مرتب کر لی گئی ہیں اور کلاسیکل اسلام کی ایسی مثبت نقشہ کشی کر لی گئی ہے، جس میں انیس بیس کا بھی فرق نہیں ہے، لیکن جہاں تک اسلام کی انسانی وسعتوں کا یا ترجمانی کی کسی سرگرمی کے ناخوشگوار ہونے کا تعلق ہے، تو ان دونوں میں سے کسی کو بھی زیادہ نمایاں نہیں کیا گیا یا مشرق وسطیٰ کے معاصر مطالعے کے ''ضابطوں'' نے اس سلسلے میں کوئی مدد نہیں کی۔

عملاً اسلام کے مطالعے سے متعلق کچھ بھی نہ تو سخت ہم عصر دباؤ سے ''آزاد'' ہے اور نہ ہم اس کے متعلق یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ مطالعہ پہلے سے طے شدہ خطوط پر نہیں ہو رہا ہے، چنانچہ یہ بات ان غیر سیاسی مقاصد سے بہت دور ہے، جن کی مستشرقین سکالر اپنے کام کے سلسلے میں شکایت کرتے ہیں اور ان بیہودہ مادیت پرستوں کے مشینی عزم سے بھی دور ہے، جو اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اقتصادی قوتوں کے ذریعے پہلے سے ہی تمام ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا دائرہ کار طے کر لیا جاتا ہے، یہ ان ماہرین سے بھی دور ہیں، جو علمی ''ضابطوں'' کی تکنیکی صلاحیت پر بہت اعتماد کرتے ہیں، ان دونوں انتہاؤں کے بیچ کہیں مترجموں کے ''مفادات'' اپنا کام دکھاتے ہیں اور وسیع تر ثقافت میں منعکس ہوتے ہیں۔

لیکن یہاں بھی تنوع اور آزادی اتنی میسر ہے جتنی کہ ہم توقع کر رہے تھے، چنانچہ اس سے یہ سوچ ابھری کہ وہ کیا چیز ہے، جو اگر طاقت اور خواہش کو نہیں تو علم اور نادر کتابوں میں سے کسی کو دلچسپی کا موضوع بنا دیتی ہے، یہ دونوں سلسلے مغربی معاشرے میں تو ہر لحاظ سے منظم ہوتے ہیں اور دوسرے معاشروں میں کچھ درجوں کے فرق سے اپنے نظم کو قائم رکھتے ہیں، ان کا یہ نظم انھیں عملی جامہ پہنانے کی صلاحیت کی بعض اقسام کے لائق بنا دیتا ہے اور یہ نظم انھیں اس لائق بھی بناتا ہے کہ وہ تنگ نظری اور فوری عملی اہمیت کی اغراض سے بالاتر ہو کر اپنے پروقار آخری اختیار کو کام میں لائیں، ایک آسان سی مثال اس نکتے کو آسانی کے ساتھ سمجھا سکتی

ہے، میں اس مثال کو پیش کرنے کے بعد اس کی ایک یا دو وضاحتوں پر بحث کروں گا۔

امریکا اور یورپ میں آج عام لوگوں کے لیے ''اسلام'' ایک خاص قسم کی ناخوشگوار ''خبر'' ہے اور اس کے متعلق میڈیا، حکومت، جغرافیائی سیاسی حکمت عملی اور اسلام کے علمی ماہرین سب کی رائے یہی ہے کہ اسلام مغربی تہذیب کے لیے خطرہ ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے اظہار کے لیے مغرب میں صرف اسلام کے توہین آمیز اور نسلی تعصب سے پر کارٹون ہی ملتے ہیں، ان دونوں باتوں میں فرق ہے، اس لیے میں نہ تو خود یہ بات کہوں گا اور نہ کسی ایسے شخص سے جو یہ بات کہے گا، اتفاق کروں گا، میں جو کہہ رہا ہوں، وہ یہ ہے کہ اسلام کا منفی تصور دوسروں کی بہ نسبت مغرب میں زیادہ چھایا ہوا ہے اور مغرب میں جس اسلام کی بات کی جاتی ہے، وہ اسلام کی حقیقی شکل وصورت نہیں ہے بلکہ مغرب اور مسلمانوں نے مل کر اس کی ایک ایسی شکل بنا دی ہے، جو قدرتی نہیں ہے، میں اس بات کو بیان کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں اور یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ کسی مخصوص معاشرے کے وہ کون سے نمایاں طبقات ہیں، جو اسلام کو اس انداز میں لیتے ہیں، یہ وہ طبقات ہیں جنھیں اختیار بھی حاصل ہے اور یہ خواہش بھی رکھتے ہیں کہ اسلام کے ایک مخصوص تصور کو پھیلائیں، چنانچہ اس طرح دوسرے تمام تصورات کی بہ نسبت ان کا دیا ہوا تصور ہی چھا جاتا ہے اور پیش کیا جاتا ہے، جیسا کہ میں نے باب اول میں کہا تھا کہ یہ عمل اس اتفاق رائے سے کیا جاتا ہے، جو اس کی حدود کا تعین کرتا اور اس پر دباؤ بھی ڈالتا ہے۔

اس کی بہترین مثال وہ چار سیمینار ہیں جو 1971ء اور 1978ء میں ہوئے، ان سیمیناروں کے لیے سرمایہ فورڈ فاؤنڈیشن نے فراہم کیا اور یہ پرنسٹن یونیورسٹی میں منعقد ہوئے تھے، یہ یونیورسٹی کئی سماجی اور سیاسی وجوہ کی بنا پر ایسے سیمینار منعقد کرنے کے لیے مشہور ہے، دوسری خصوصیات سے ہٹ کر پرنسٹن کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے مشرق قریب کے مطالعے کا ایک پروگرام بھی شروع کر رکھا ہے، جو بڑا مشہور ہوا ہے اور قابل قدر بھی ہے، اس پروگرام کو کچھ عرصے پہلے تک مشرقی مطالعے کا شعبہ کہا جاتا تھا اور اسے نصف صدی پہلے فلپ ہٹی (Philip Hitti) نے قائم کیا تھا، مشرق قریب سے متعلق دوسرے پروگراموں کی طرح آج اس پروگرام پر بھی معاشرت اور پالیسی سے متعلق سائنسدانوں کا قبضہ ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مشرقی مطالعے کے نصاب اور اس شعبے میں کلاسیکل بھی اسلام، عربی اور فارسی کے ادب پر کم اور مشرق قریب کی اقتصادیات، سیاست، تاریخ اور معاشرتی علوم پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے، فورڈ فاؤنڈیشن امریکا میں معاشرتی سائنس کا سب سے بڑا ادارہ ہے، اس کا تعاون یہ ثابت کرتا ہے یا یوں کہیے کہ اس کے تعاون کا مقصد ہی یہ ثابت کرتا ہے کہ

امریکا میں بااختیار قوت کی ایک اعلیٰ قسم موجود ہے، اس لیے اس تعاون کے تحت جس موضوع پر بھی توجہ دی جاتی ہے، اسے یہ سوچ ہی نمایاں مقام دے دیتی ہے کہ جو پرنسٹن نے تجویز کیا اور جس کے لیے سرمایہ فورڈ نے فراہم کیا، وہ موضوع یقیناً ایسی خصوصی توجہ اور ایسی ترجیح کے لائق ہوگا، اور اس مطالعے کے یقیناً بڑے اہم نتائج برآمد ہوں گے۔ مختصر یہ کہ سیمینار کے تمام موضوع اگرچہ اہل علم نے منتخب کیے تھے اور وہی اس تقریب کو چلا رہے تھے مگر یہ کوئی ادبی سیمینار نہیں تھے بلکہ قومی مفاد کو سامنے رکھ کے ہی منعقد کیے گئے تھے اور قومی مفادات کو مطمئن کرنے کے لیے ہی دانش کا سہارا لیا گیا تھا اور اس سیمینار کے لیے جو موضوع منتخب کیے گئے تھے، انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ علم و دانش میں عدم مساوات کی جو ضابطہ بندی ہے، دراصل سیاسی ترجیحات اسی سے ابھرتی ہیں، اس سلسلے میں یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ فورڈ فاؤنڈیشن اور پرنسٹن کی دلچسپی کسی ایسے نفیس اور معیاری سیمینار کے انعقاد میں نہیں تھی اور نہ ہونی چاہیے تھی، جس میں قرون وسطیٰ کے زمانے کی عربی کی گرامر کے اصول وضوابط کو زیر بحث لایا جانا تھا، تاہم یہ بات خالص ادبی بنیادوں پر کہی جاسکتی ہے کہ اب تک منعقد ہونے والے کسی بھی سیمینار کی بہ نسبت اس طرح کے سیمیناروں کے لیے زیادہ مضبوط کیس تیار کیا جاسکتا ہے۔

یہ جو صورت بیان کر دی گئی ہے، اس سے ہٹ کر اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ سیمینار کس سلسلے میں منعقد ہوئے اور اس میں کن افراد نے شرکت کی؟ ان سیمیناروں میں سے ایک کا موضوع تھا کہ ''اسلامی افریقہ میں غلامی اور اس سے متعلق ادارے'' (Slavery and related Institutions in Islamic Africa)، اس موضوع کے تحت جو گفتگو ہوئی اس میں عرب مسلمانوں کے خلاف افریقیوں کے خوف اور غم و غصے کو بہت بڑھا چڑھا کے پیش کیا گیا اور اس بات کا بھی ذکر آیا کہ ''چند اسرائیلی سکالروں'' نے افریقی ممالک کو خبردار کرنے کی کوشش کی تھی کہ جن عرب اقوام نے ماضی میں ان کے ممالک کی آبادی کو کم کر دیا تھا، وہ ان عربوں پر زیادہ انحصار نہ کریں، اس سیمینار کا اہتمام کرنے والوں نے اسلام میں غلامی جیسے موضوع کا انتخاب کر کے دراصل ایک ایسے موضوع کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے، جس سے افریقی اور عرب مسلمانوں کے درمیان تعلقات کا خراب ہو جانا یقینی تھا اور اس مقصد کو حاصل کرنے کی خاطر ہی یہ احتیاط برتی گئی تھی کہ اس سیمینار میں عرب مسلم دنیا سے کسی کو مدعو نہیں کیا گیا تھا۔

ایک دوسرے سیمینار میں ''ملت کے نظام'' (The Millet System) پر گفتگو کی گئی اور اس کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ مشرق وسطیٰ کی مسلم ریاستوں میں اقلیتوں، خاص طور پر مذہبی اقلیتوں، کی حیثیت کیا ہے، خلافت عثمانیہ

کے دور میں دراصل ملت کسی حد تک خودمختار اقلیتی گروپوں کو کہتے تھے، پھر یہ سلطنت شکست وریخت کا شکار ہوئی، اس کی جگہ فرانسیسی اور برطانوی نوآبادیاتی حکومتوں نے لے لی، پھر ان کا بھی خاتمہ ہوا، اور دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں نئی ریاستوں کا ایک سلسلہ ابھر کر سامنے آ گیا، ان میں سے اکثر قومی ریاستیں تھیں یا انھوں نے قومی بننے کی کوشش کی تھی، ان میں سے ایک اسرائیل کی مذہبی ریاست تھی جو مسلمان ممالک سے گھری ہوئی تھی اور دوسری لبنان کی ریاست تھی، جسے مسلم، غیر مسلم، اقلیتوں کے عسکری اقدامات نے انتشار کا شکار بنا دیا تھا، اور انتشار پھیلانے والی ان اقلیتوں کو اسرائیل اور امریکا دونوں کے حمایت حاصل تھی۔

اس اعتبار سے ملت ایک غیر جانبدارانہ علمی موضوع نہیں تھا، تاہم ''ملت کا نظام'' وضع کیا جانا بذات خود اس بات کی دلیل تھا کہ مختلف قوموں کے پیچیدہ اور لسانی مسائل کے لیے اسلامی دنیا نے اس حل کو اپنی پالیسی بنا لیا تھا، اس موضوع کو زیر بحث لانے کے علمی مقاصد چاہے کچھ بھی ہوں، یہ بات طے ہے کہ ملت کے نظام کا تعلق پرانے زمانے سے ہے، اور اس کے ذریعے عثمانی ہی نہیں بلکہ مغرب کی کئی شاہی قوتیں بھی، مختلف طبقوں میں بٹی ہوئی بہت بڑی آبادی کو، اختلافات میں جکڑ کر ان پر حکومت کرتی تھیں مگر آج کی معاصر اسلامی دنیا کی حالیہ تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ سنی آبادکاروں کی اکثریت اور ان کے ساتھ مل کر کچھ اقلیتیں بھی اس بات کی کوشش کر رہی ہیں کہ لسانی اور مذہبی تقسیم سے بلند ہو کر سیکولر جمہوریت قائم کر لی جائے، شاید یہ لوگ وحدت کے تصور کو لے کر چل رہے ہیں، اس علاقے کی کوئی بھی ریاست ابھی تک اس تصور کو عملی شکل دینے میں کامیاب نہیں ہو سکی، تاہم اسے ایک پالیسی کے طور پر قبول کرنے کے ایسے اعلانات ضرور ہوئے ہیں، جن پر حسب معمول بعد میں کوئی عمل درآمد نہیں کیا گیا، اس کے برعکس اس علاقے میں اسرائیل اور لبنان کے انتہائی دائیں بازو کے موروثی عیسائیوں نے عملاً یہ مہم شروع کر رکھی ہے کہ اُس ریاستی ڈھانچے کی طرف پھر سے رجوع کیا جائے، جس میں اصولی طور پر اقلیتی لسانی گروپ کو خودمختاری حاصل ہو اور وہ بیرون ملک اپنے کسی سرپرست سے یا کسی بڑی طاقت کے ساتھ رابطہ رکھ سکے، فلسطینیوں کے سامنے بھی یہ حل رکھا گیا تھا مگر سیمینار کو منعقد کرنے والوں کے لیے یہ سب باتیں کسی طرح بھی کارآمد ثابت نہیں ہو سکتی تھیں، کیونکہ پرنسٹن میں فلسطینی عرب ''اقلیت'' کے موضوع پر جسے بات کرنے کے لیے لایا گیا تھا وہ ایک اسرائیلی پروفیسر تھا، اس

1۔ ملت سسٹم، دراصل ان قواعد سے عبارت ہے جن کا غیر مسلموں کے لیے اسلام حکم دیتا ہے، خلافت عثمانیہ نے مذہبی اقلیتوں کو بھی اس میں سمیٹ لیا تھا، اس نظام کے تحت اقلیتوں کے علاقوں میں انھیں اپنی حکومت خود قائم کرنے کی اجازت ہوتی تھی اور ان کی عدالتیں بھی اپنی ہوتی تھیں، اپنے علاقے سے ٹیکس بھی یہ خود وصول کرتی تھیں، ان کا سربراہ عموماً ان کا کوئی مذہبی رہنما ہوتا جو براہ راست عثمانی سلطان کو جوابدہ ہوتا۔ (مترجم)

سلسلے میں یہ بات بڑی اہم ہے کہ غلامی کے موضوع پر ہونے والی کانفرنس کی طرح ملت کے، سیمینار میں بھی اکثریتی سنی برادری کے کسی نمایندے کو نہیں بلایا گیا تھا، یہ بات بڑی توجہ طلب ہے کہ انتہائی حساس موضوع پر یہ سیمینار امریکا میں 1978ء میں ہوا، اس میں ان مذہبی اور لسانی اقلیتوں کی بھاری تعداد نے شرکت کی، جو بنیادی طور پر اسلامی حکمرانی کے خلاف اور امریکی پالیسی بنانے والوں کے لیے بڑی سودمند رہی ہیں، سیمینار میں اس مخصوص سوچ کے مالک افراد کی شمولیت یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی تھی کہ یہ سیمینار عقل ودانش کے کسی تجسس کو مطمئن کرنے کے لیے منعقد نہیں کیے گئے تھے، یہ کوئی اتفاق نہیں تھا کہ اس سیمینار کا بندوبست کرنے والا وہی شخص تھا جس کی سوچ کو میں پہلے بیان کر چکا ہوں، اسی نے ان علمی وادبی شخصیات اور یورپ سے باہر کے ان لوگوں کو اکٹھا کیا تھا جنھیں ہر جگہ سیاسی سازش ہی نظر آتی ہے۔

پہلے سیمینار میں آج کے مشرق وسطیٰ کے معاشروں کو سمجھنے اور اُس کا تجزیہ کرنے کے لیے تحلیل نفسی اور رویوں کی تکنیک کے اطلاق کو موضوع بحث بنایا گیا تھا، اور اس موضوع پر جس قدر گفتگو ہوئی اُسے ایک بھاری بھرکم کتاب کی شکل میں شائع کر دیا گیا، اس سیمینار کا مرکزی نکتہ وہی تھا، جس کی توقع کی جاسکتی تھی، اس میں خاص طور پر قومی کردار کے مطالعے پر زور دیا گیا تھا، یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ علی بنوعزیزی ''بڑی مشقت کرنے والے اور صاحب ادراک ہیں''۔ انھوں نے ایرانی کردار کے نام نہاد مطالعے کا ایک تنقیدی جائزہ پیش کیا؟ جسے انھوں نے بجا طور پر شاہی قوتوں کے جوڑتوڑ کو ایران پر قبضے کے ساتھ منسلک کر دیا ہے، بہرکیف سیمینار کا جو نتیجہ برآمد ہوا، وہ غیر متوقع نہیں تھا، بعد میں اس پر جو کتاب شائع ہوئی، اس میں اس بات کو کئی بار دہرایا گیا کہ مسلمان خواب وخیال کی دنیا میں رہتے ہیں، ان کے خاندانوں پر جبرودباؤ کی ایک کیفیت ہوتی ہے؛ ان کے لیڈر ذہنی مریض ہوتے ہیں؛ معاشروں کی سوچ بچگانہ ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ، ان تمام باتوں کو اُن سکالروں کے نکتہ نگاہ سے پیش نہیں کیا گیا تھا، جو ان معاشروں کو پختہ کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں بلکہ انھیں اُس نکتے کے مطابق پیش کیا گیا تھا، جو غیر جانبدار، بامقصد اور اقدار سے آزاد، سائنس دانوں کا ہوسکتا ہے؛ یہ سائنسدان چاہے کتنے ہی غیر جانبدار اور اقدار سے آزاد کیوں نہ ہوں، اس بات کو جاننے میں ان کے ساتھ کوئی رورعایت نہیں کی جاسکتی کہ یہ سائنسدان کارپوریشنوں اور سرکاری قوت میں کیا مقام رکھتے ہیں، ان کی تحقیقات مسلم دنیا کے متعلق سرکاری پالیسی پر کس حد تک اثرانداز ہوتی ہیں اور جب ایک طاقتور معاشرہ، ایک کمزور معاشرے کا مطالعہ کرتا ہے، تو اس مطالعے میں نفسیات سے متعلق طریق کار کے مضمرات کیا ہوتے ہیں۔

اس طرح کی کوئی تحقیق چوتھے سیمینار میں نہیں ملتی، جس کا عنوان تھا ''مشرق قریب میں زمین، آبادی اور معاشرہ: اسلام کے عروج سے لے کر انیسویں صدی تک کی اقتصادی تاریخ کا مطالعہ'' (Land, Population and Society in The Near East : Studies in Economic History from the Rise of Islam to the Nineteenth Century) دوسرے سیمیناروں کی طرح اس سیمینار میں بھی مجموعی تاثر یہ دیا گیا کہ یہ علم وادب کی بیٹھک اور غیر جانبدار ہے، مگر جاننے والوں کو فوری طور پر یہ بات سمجھ آ گئی کہ اس کی تہ میں پالیسی سے متعلق بڑے اہم معاملات چھپے ہوئے ہیں، اس سیمینار میں آج کے زمانے کے مسلم معاشروں میں زمین کی ملکیت، مردم شماری کے نمونوں اور ریاستی اختیار کے درمیان اس تعلق کو تلاش کرنے میں دلچسپی لی گئی تھی جسے استحکام یا عدم استحکام کی علامت سمجھا جاتا ہے، ان باتوں سے ہمیں یہ نتیجہ اخذ نہیں کر لینا چاہیے کہ اس سیمینار میں جس قدر مقالے پیش ہوئے، وہ سب کے سب معروضی طور پر بے وقعت تھے یا اس میں شرکت کرنے والے تمام سکالر بداندیش سازش کا حصہ تھے، منتظمین نے دانشمندی یہ کی تھی کہ انھوں نے لوگوں کو مدعو کرتے ہوئے نظریات کے ''توازن'' کو ذہن میں رکھا تھا اور اس بات کی کوشش کی تھی کہ مجموعی طور پر اس سیمینار کا تاثر سنجیدہ اور ذمہ دارانہ ہونا چاہیے، لیکن دوسری طرف ہمیں اس سارے کام کو اس کے الگ تھلگ حصوں کا ایک مشینی ماحصل سمجھنے کی غلطی بھی نہیں کرنی چاہیے، ان چاروں سیمیناروں میں مجموعی طور پر جو موضوع اور رحجان زیر بحث آئے، اُن میں اسلام سے متعلق آگاہی کی جواز سرنو شکل بنائی گئی، اُس کا مقصد یا تو اسلام کو ایک جارح مظہر ثابت کر کے اسے لوگوں سے دور ہٹانا تھا یا اس کے ایسے پہلوؤں کو اُجاگر کرنا تھا، جنھیں پالیسی کی زبان میں ''قابو'' سے باہر نہ ہونے والے کہا جاتا ہے۔

پرنسٹن میں اسلام پر سیمینار کا سلسلہ، دراصل تیسری دنیا کے اُن دوسرے علاقائی مطالعاتی پروگراموں کی تاریخ سے جاملتا ہے، جو امریکا میں منعقد ہوتے رہے ہیں، مثال کے طور پر چین کے علمی مطالعے میں دوسری جنگ عظیم کے فوری بعد کے زمانے کا جائزہ بھی لیا گیا، اس کے بعد بے شمار پروگرام ہوئے، ان پہلے کے پروگراموں اور آج کے پروگراموں میں فرق یہ ہے کہ امریکا کے نزدیک اسلامی پروگراموں پر ابھی ''نظرثانی'' کرنا باقی ہے، کیونکہ ان پر ابھی تک متروک اور مبہم نظریات کا، جن میں ''اسلام'' بذات خود شامل ہے، اور ادبی محاوروں کا غلبہ ہے، مگر ان سب کا انسانی سائنسوں اور معاشرے میں عام طور پر رونما ہونے والے واقعات سے کوئی رابطہ نہیں ہے، یہ بات آج بھی ممکن ہے کہ جو باتیں یہودی، دوسرے ایشیائی یا سیاہ فام اپنے متعلق سننا بھی گوارا نہیں کرتے، اس طرح کی باتوں کو اسلام کے بارے میں بڑی آسانی کے ساتھ کہہ دیا

جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسلامی تاریخ اور معاشرے کے ایسے مطالعے لکھے جائیں، جن میں نطشے، مارکس اور فرائیڈ (Freud) کے بعد ہونے والی اُن تمام ترقیوں کو نظر انداز کر دیا جائے، جو تشریح و ترجمانی کے نظریات کے متعلق وجود میں آئی ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلام کے مطالعے کے سلسلے میں اب تک جو سرگرمیاں سامنے آئی ہیں ان میں سے بہت کم سرگرمیوں میں سکالروں کی اس دلچسپی کا ذکر آیا ہے جو انھیں عام تاریخ نویسی کے استدلالی مسائل سے ہوتی ہے اور یا دہ عبارتوں کے تجزیے میں رکھتے ہیں، اس کے برعکس اگر ہم موجودہ صورت حال کو سمجھنے کے لیے، پرنسٹن کے سیمناروں کو ہی لیں تو ان کا فائدہ یہ ہے کہ ان میں اسلام پر کوئی نہ کوئی ادبی کتاب ضرور سامنے آ جاتی ہے، اس سیمنار میں بھی مشرقِ وسطیٰ کے مطالعے کی نفسیات پر ایک کتاب تیار ہوئی، مگر ان کتابوں کا انجام یہ ہوتا ہے کہ ان پر ایک دو ریویو (Review) خصوصی نوعیت کے ایسے اخبارات میں شائع ہوتے ہیں، جن کی سرکولیشن بہت محدود ہوتی ہے، اُس کے بعد یہ کتاب غائب ہو جاتی ہے، سچی بات تو یہ ہے کہ اسلام کی تمام ثقافت کو جان بوجھ کر غیر موزوں بنا دینے کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ سکالروں نے زیادہ گہرائی میں اُترنے کی بجائے، اُسی لگے بندھے کام کو جاری رکھا ہے جو وہ پہلے سے کر رہے تھے اور میڈیا نے اسلامی عوام کے نسلی کارٹون شائع کرنے کے کام کو ہی اسلام شناسی سمجھ لیا ہے، تاہم 1980ء کے وسط سے سیاسی اسلام کے جو مطالعے سامنے آئے ہیں، اُن میں سے زیادہ تر میں بنیاد پرستی، دہشت گردی اوو جدیدیت کی مخالفت کو موضوع بنایا گیا ہے اور اسے لے کر ان مطالعوں کا انداز بڑا جارحانہ ہو گیا ہے، اس نوعیت کے مطالعوں کا مارکیٹ میں ڈھیر لگ چکا ہے اور ان میں سے زیادہ تر نے برنارڈ لیوئس جیسے سکالروں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے اور یہ سکالر اسلامی ''خطرے'' کے خلاف رائے عامہ کو اُبھارنے میں لگے ہوئے ہیں، ان لوگوں نے جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ ایسا ہے، جس میں سکالروں کو دوام حاصل ہوتا ہے، جبکہ اسلام کے متعلقین کو اسلامی سزاؤں، بدمزہ تشدد، دہشت گردی اور جرم کی دلنشینیوں کی خبریں، دوا کی اُس بھاری خوراک کی طرح فراہم کی جاتی ہے جو انھیں کئی عشروں سے پلائی جا رہی ہے۔

جن ماہرین کو عوام کے سامنے لایا جاتا ہے وہ ایسے ہوتے ہیں جو کسی ایسی ہنگامی صورت حال کی اطمینان بخش وضاحت کر سکیں جس نے بے خبری میں ''مغرب'' کو آ لیا ہے، اس معلوم صورت حال میں جب وہ تبصرہ کرتے ہیں تو اُن کے پاس اسلام کے لیے نہ تو کوئی رو رعایت ہوتی ہے اور نہ اُس طرح کی شائستگی، جو برطانیہ اور فرانس میں دیکھنے میں آتی ہے، انھیں ایسا ٹیکنیشن سمجھا جاتا ہے جن کے پاس بقول ڈی وٹ میک ڈونلڈ

(Dwight MacDonald) کے اس صورت حال میں ''کیا کرنا ہے کا ایک واضح طریق کار'' موجود ہوتا ہے جسے وہ عوام کے سامنے پیش کر دیتے ہیں اور عوام اُنھیں اس لیے اپنا محسن سمجھتے ہیں، کیونکہ یہ اُن کے لیے اُس پریشانی کا جواب بنتے ہیں جسے کرسٹوفر لیش نے یوں بیان کیا ہے:

> ''صنعتی ترقی کے بعد کے زمانے میں ماہرین، ٹیکنیشنوں اور منتظمین کی مانگ بہت بڑھ گئی ہے، کاروبار اور حکومت دونوں تکنیکی انقلاب کے دباؤ میں ہیں، بڑھتی ہوئی آبادی، غیر معینہ عرصے تک جاری رہنے والی سرد جنگ نے، انھیں چاروں طرف سے گھیر لیا ہے، کیونکہ دن بدن ان کا انحصار منظم اعداد و شمار کی اُن مشینوں پر ہونے لگا ہے جنھیں صرف خصوصی تربیت یافتہ ماہرین ہی سمجھ سکتے ہیں، چنانچہ یونیورسٹیاں بھاری تعداد میں ماہرین پیدا کرنے والی صنعتیں بن گئی ہیں۔''

ماہرین کے لیے مارکیٹ بڑی پُرکشش اور منافع بخش ہو گئی ہے، چنانچہ وہ مشرق وسطیٰ پر جتنا کام کرتے ہیں، وہ خاص طور پر اسی مارکیٹ کو بھیجا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ نہ تو کسی بھی معروف رسالے اور نہ ہی کسی معروف سکالر نے اپنی کتابوں میں اس بنیادی سوال کی طرف توجہ دی ہے کہ مشرقِ وسطیٰ اور اسلام کا مطالعہ کیوں کیا جائے؟ یا یہ مطالعے کس کے لیے کیے جا رہے ہیں؟ استدلالی شعور کے محو ہو جانے کی وجہ اس مارکیٹ کی موجودگی ہے، تاہم اس مارکیٹ میں خبریں ہیں اور اُن کی لائنیں لگی ہیں جنھیں تحفظ کی ضرورت ہے، ان میں حکومتیں، کارپوریشنیں، فاؤنڈیشنیں آتی ہیں، پھر یہ بڑی آسانی سے سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ جب ایک ایسا گاہک موجود ہو، جو کام کی قدر کرے، اُسے قبول کرے، تو اس سے یہ پوچھنے کی ضرورت کہاں رہ جاتی ہے کہ وہ جو کر رہا ہو، کیوں کر رہا ہے؟ اس سے میری مراد یہ ہے کہ اس صورت حال میں سکالر اُس علاقے اور وہاں کے عوام کے حوالے سے سوچنا ترک کر دیتا ہے، جن کا وہ مطالعہ کر رہا ہوتا ہے، اسلام اگر وہ ''اسلام'' ہے جس کا مطالعہ کیا جا رہا ہے تو وہ ہم سخن نہیں، بلکہ ایک ایسی شے بن جاتا ہے، جس پر گفتگو کی جا رہی ہے، مجموعی طور پر اس کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ یہ اداروں کی بدنیتی میں شمار ہونے لگتا ہے، اس شعبے کی علمی و ادبی شناخت اور دیانت پر باہر سے جو انگلیاں اُٹھتی ہیں اُن کی پروا نہیں کی جاتی، سیاسی طرفداری سے انکار کرنے کے لیے ادبی مباحثوں کا رنگ جان بوجھ کر گستاخانہ کر دیا جاتا ہے اور اپنے اس طرزِ عمل کو یہ اصحاب خود اپنی ستائش کے ذریعے غیر معینہ مدت کے لیے محفوظ بنا لیتے ہیں، بنیادی طور پر وہ اس کے لیے مقبول عام صحافت کا وہ سہارا لیتے ہیں جسے میں اس سے پہلے بیان کرتا چلا آیا ہوں اور جو دوسروں سے الگ تھلگ ایسا کاروبار ہے،

جس میں سکالر اُن مفادات کی تکمیل کرتا ہے، جن کی اُس سے توقع کی جاتی ہے، اس طرح وہ سچی اور خالص ترجمانی کے تقاضے پورے نہیں کرتا بلکہ تنظیموں کے ضوابط کی پابندی کی طرف آ جاتا ہے، اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ جب عام ثقافت کو بیان کرتا ہے، تو اُس کا کام پست خیالات کا مجموعہ ہو جاتا ہے اور وہ صرف بحران کو سنبھالنے کا اہل رہ جاتا ہے، بصورت دیگر وہ خود بڑے نچلے درجے پر ہوتا ہے......... کسی ثقافت کو جاننے کے لیے دو ہی شرائط لازم ہوتی ہیں، ایک یہ کہ حقیقی تبادلوں کے ذریعے اجنبی ثقافتوں کے ساتھ رابطہ قائم کیا جائے اور دوسرے یہ کہ ترجمانی کے اصل کام کے متعلق ذاتی شعور اور آگاہی ضرور ہونی چاہیے، بدقسمتی سے ان دونوں میں سے کسی شرط کو پورا نہیں کیا جاتا، چنانچہ ان کو نظر انداز کر کے جب اسلام کی کوریج کی جاتی ہے، تو اس میں تنہائی، علاقائیت اور دوری کے انداز کو تقویت ملتی ہے، اس طرح یہ بات نمایاں ہو جاتی ہے کہ دنیا کی آخری سپر پاور امریکا کا مقصد اسلام کی کوریج سے اس کی صحیح ترجمانی کو پیش کرنا نہیں بلکہ وہ اس کے ذریعے اپنی طاقت کا اظہار کرنا چاہتی ہے، امریکی میڈیا اسلام کے متعلق جو جانتا ہے، اسے اپنے انداز میں اس لیے کہتا ہے کیونکہ وہ یہ سب کچھ کہنے کے لیے آزاد ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسلامی بنیاد پرستی، دہشت گردی اور بوسنیا جیسے ''اچھے'' مسلمان اس منظر پر بلا امتیاز چھا جاتے ہیں، اس سے ہٹ کر امریکی میڈیا میں اسلام کے متعلق دوسری باتیں بہت کم آتی ہیں، کیونکہ کوئی بھی چیز جو اس اتفاق رائے سے باہر ہو، اُس کا ذکر نہیں ہوتا اور وہ اتفاق رائے یہ ہے کہ جس خبر کا امریکا کے مفادات سے کوئی تعلق نہیں ہے اور جو میڈیا کے حساب سے اچھی کہانی کے زمرے میں نہیں آتی، اُسے توجہ کے لائق قرار نہیں دیا جا سکتا، دوسری طرف ادبی طبقے کا حال یہ ہے کہ وہ اُس چیز کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، جو اُن کے خیال میں قومی اور کارپوریٹ اداروں کی ضرورتوں سے مطابقت رکھتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلام کے متعلق تفصیل کے جو دفتر کے دفتر لگے ہوتے ہیں، اُن کی کانٹ چھانٹ کی جاتی ہے اور وہ موضوعات جو حالات اور واقعات کی نسبت سے موزوں اور مناسب ہیں انھیں نہیں لیا جاتا، اسلام کی تشریح اور اسلام کے موزوں و مناسب مطالعے میں انتہا پسندی، تشدد جیسے موضوعات لیے جاتے ہیں لیکن جو موضوعات ان دونوں سے مناسبت نہیں رکھتے ہیں، انھیں خارج کر دیا جاتا ہے، یہاں تک کہ حکومت یا کسی یونیورسٹی کا مشرقِ وسطیٰ پر شعبہ یا فاؤنڈیشنوں میں سے کوئی مشرقِ وسطیٰ کے مستقبل پر مطالعے کا بندوبست کرتی ہے، تو پُرانے تصورات کی وہی بھرمار پھر سے سامنے آ جاتی ہے، اور ان میں ذرہ برابر تبدیلی کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی، پھر جب ذکر مشرقِ وسطیٰ کے مستقبل کے مطالعے کا ہوتا ہے تو یہ حقیقت میں مشرقِ وسطیٰ کے مستقبل کا مطالعہ نہیں ہوتا بلکہ یہ عنوان اصل موضوع کو چھپانے کے لیے

اختیار کیا جاتا ہے اور بین السطور میں یہی سوچ کار فرما ہوتی ہے کہ ''موجودہ تناظر میں اسلام کا کیا کیا جائے؟''

اسلام کے متعلق ایک ہی طرح کی باتوں کو دہراتے چلے جانا بلا وجہ نہیں ہوتا، بہت کچھ داؤ پر لگا ہوتا ہے اور کچھ نہیں تو وہ سرپرستی کا نظام، جس کے تحت یہ سب کچھ ہو رہا ہوتا ہے اور جو بڑی خوبی سے چلتے ہوئے سب کے لیے سود مند ہوتا ہے، وہ خطرے میں پڑ جاتا ہے، اس میدان کے سینئر ماہرین کا تعلق چاہے حکومت سے ہو، کارپوریشنوں کی دنیا سے ہو یا یونیورسٹیوں سے ہو، وہ ایک دوسرے کے ساتھ اور ان کے ساتھ رابطہ قائم رکھتے ہیں جو بڑی فرمانبرداری کے ساتھ عطیات دیتے ہیں، ایک نوجوان سکالر اپنی مالی اعانت کے لیے اسی نیٹ ورک پر انحصار کرتا ہے، پھر اس میں ملازمت کی گنجائش بھی ہوتی ہے اور کسی معروف رسالے میں شائع ہونے کا امکان بھی نکل آتا ہے: تاریخ اور ادب کے شعبوں میں کام کرنے والے سکالروں کی بہ نسبت، زیر بحث میدان میں کام کرنے والے معروف سکالروں پر یا اُن کے کام پر غیر دوستانہ تنقید بڑی مہنگی ثابت ہوتی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کتابوں پر تبصرے بے معنی ہو جاتے ہیں اور ان سے تعریف و توصیف کے سوا کوئی دوسرا مقصد پورا نہیں ہوتا، یہی احتیاط تنقید میں بھی رکھی جاتی ہے، تنقیدی تبصروں کی زبان و بیان کی خوبیوں کو زیادہ اُجاگر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور سکالر جو استدلال لایا، یا اُس نے جو مفروضے قائم کیے، اُن پر کوئی تبصرہ نہیں کیا جاتا، سب سے زیادہ تجسس میں مبتلا کرنے والی فروگزاشت جو معمول کے مطابق زیادہ معلوم ہوتی ہے، وہ اُس تعلق کا تجزیہ ہے جو علمی مقالے اور معاشرے میں موجود مختلف طرح کی اُن قوتوں کے درمیان ہوتے ہیں، جن کے لیے علمی مقالہ تحریر کیا گیا ہے، جیسے ہی خاموشی کی اس سازش کو چیلنج کرتی ہوئی آواز اُٹھتی ہے، تو نظریات اور علاقائی نسبتیں موضوع بحث بن جاتی ہیں اور اس طرح کی باتیں سنائی دیتی ہیں کہ وہ مارکسسٹ ہے، وہ فلسطینی ہے، ایرانی ہے یا مسلمان ہے یا شامی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ وہ کیسے ہوتے ہیں، جہاں تک ذرائع کا تعلق ہے انھیں ہمیشہ جامد و ساقط ہی تصور کیا جاتا ہے، چنانچہ ایک معاصر اسلامی معاشرے یا تحریک یا ایک شخصیت پر بحث کرتے ہوئے، سکالرز زیر بحث چیز کا حوالہ ہمیشہ شہادت کہہ کر دیتے ہیں اور بہت کم اُس کا حوالہ اس طرح دیا جاتا ہے، جس کا وہ اپنی حیثیت اور مقام کے حوالے سے حق دار ہوتا ہے یا وہ اس کا حق رکھتا ہے، اُس طرح حق جیسا کہ ایک معنوں میں جواب دینے کا حق ہوتا ہے، حیرت کی بات یہ ہے کہ اسلام کے تخریبی ماہرین نے کبھی ایسی کوئی منظم کوشش نہیں کی کہ اسلام پر گفتگو کرتے ہوئے وہ کسی اسلامی تحریر کو استدلال کے طور پر پیش کریں، اس طرز عمل کو ہمیں کیا کہنا چاہیے؟ کیا یہی علمیت ہے؟ کیا اسی کو ثبوت و شواہد پیش کرنا کہتے ہیں؟ یا ان کا تعلق، ان دونوں میں سے کسی کے ساتھ نہیں؟

تاہم حالات کی اس بنجر صورت کے باوجود، یا شاید اس کی بدولت ہی، اسلام کے متعلق کچھ قابل قدر علم وجود میں آ گیا ہے اور کچھ تعصبات اور سازشوں سے آزاد ذہنوں نے صحرا کو عبور کر لیا ہے، تاہم مرکزی بہاؤ میں ہمیں وہی گھٹیا درجے کا کام ملتا ہے، تنظیمی اتفاق رائے کے مقابلے میں ادبی کام بڑا بے ربط معلوم ہوتا ہے اور اگرچہ ترجمانی کا مکمل طور پر نہیں لیکن بڑی حد تک دیوالیہ پن ضرور ظاہر ہوتا ہے اور یہ سب اُسی نیٹ ورک سے پھوٹتے ہیں جسے کارپوریشنوں، حکومتوں اور یونیورسٹیوں نے مل کر قائم کیا ہے اور جن کا اس سارے کاروبار پر غلبہ ہے، اس بات پر توجہ دیجیے کہ کس طریقے سے وہی شخصیات میک نیل، لہرر رپورٹ، نائٹ لائن یا چارلی روز میں بار بار دکھائی دیتی ہیں جو بنیادی طور پر اسلام کی دشمن ہیں اور یہی شخصیات امریکا میں اسلامی دنیا کے متعلق ایک سوچ کو ہموار کرتی ہیں، اس سے مخصوص مقاصد واضح ہو جاتے ہیں، ورنہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ اسلام کے متعلق یہ ایک خاص نوعیت کا علمی ڈھانچا پورے زور وشور کے ساتھ چلے، اس میں کوئی انتشار نہ ہو، بلکہ اچھی طرح گندھا ہوا نظر آئے اور مضبوطی کے ساتھ قائم بھی ہو، اُسے ایک کے بعد ایک ناکامی کا سامنا کرنا پڑے لیکن اس سے اُسے قطعی کوئی پریشانی لاحق نہ ہو؟

اس چیز کو جس کے پاس طاقت بھی ہے اور ایسا یقین بھی، جس پر انگلی نہیں اٹھائی جا سکتی، سمجھنے کا سب سے مؤثر طریقہ یہی ہے کہ اس کا موازنہ ایک بار پھر اُس صورت سے کیا جائے، جو برطانیہ اور فرانس نے حاصل کر لی تھی، یہ دونوں ملک اسلامی دنیا میں امریکا کے پیش رو تھے، ان دونوں ممالک میں اسلامی ماہرین کا ایک طبقہ موجود رہا ہے جس نے بلاشبہ حکومت اور تجارتی پالیسی کو بنانے اور چلانے میں ایک طویل مشاورتی کردار ادا کیا ہے، لیکن ان دونوں کے سامنے ایک فوری ضرورت موجود تھی، انھیں نو آبادیات پر اپنی حکمرانی کے لیے ایک نظام چاہیے تھا، یہ صورت دوسری جنگ عظیم تک برقرار رہی، اس سارے عرصے میں اسلامی دنیا کو مسائل کے ایک جداگانہ سلسلے کے طور پر لیا گیا، ان مسائل کے متعلق جس قدر علم حاصل کیا جاتا تھا وہ نہ صرف مجموعی طور پر مثبت ہوتا تھا، بلکہ اسے بالواسطہ نہیں بلکہ براہِ راست حاصل کیا جاتا تھا، اسلامی ذہن کے متعلق نظریات اور تجریدی خاکے فرانس میں مہذب بنانے کی مناسبت سے جبکہ برطانیہ میں رعایا کو خود حکمرانی کا سلیقہ سکھانے کی نسبت سے تیار کیے جاتے تھے، پالیسی کو عملی جامہ پہناتے ہوئے کہیں کہیں ان میں رکاوٹ بھی پڑی لیکن اُس کے بعد پالیسی رکی نہیں بلکہ مضبوطی سے قدم جما کے اپنی متعین سمت کی طرف بڑھتی رہی، اسلام کے متعلق جو مباحثے کیے جاتے ہیں کیا اُن کا بنیادی مقصد اسلامی دنیا میں قومی مفادات کو درست قرار دینا ہوتا ہے، بعض حالتوں میں نجی مالی ضرورتوں کو بھی جائز قرار دینے کا سلسلہ اس سے جڑ جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ آج

برطانیہ اور فرانس میں اسلام کے سکالر، عوامی شخصیات ہیں، اگرچہ نو آبادیاتی سلطنتیں ختم ہو چکی ہیں، لیکن آج بھی ان سکالروں کا بنیادی مقصد اسلامی دنیا میں فرانس یا برطانیہ کے مفادات کو برقرار رکھنا ہے، کئی دوسری وجوہ کی بنا پر بھی ان سکالروں میں بحیثیت مجموعی انسان دوستی کا رجحان زیادہ معلوم ہوتا ہے، وہ سماجی سائنسدان بننے کی طرف مائل نہیں ہوتے اور عام ثقافت کا علم حاصل کرتے ہیں، انھیں صنعتی انقلاب کے بعد اُبھر نے والے ماہرین کے طبقے سے کم اور معاشرے میں موجود وسیع ادبی اور اخلاقی تحریکوں سے زیادہ مدد ملتی ہے، روڈن سن فرانس کا ایک عظیم ماہر لسانیات ہونے کے ساتھ ساتھ ایک جانا پہچانا مارکسسٹ بھی ہے، برطانیہ میں مرحوم ہورانی ہے جو مشہور تاریخ دان تھا اور اُس کی تحریریں عملاً آزاد روی کی نمایندگی کرتی تھیں، ایسے لوگ غائب ہو رہے ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ مستقبل میں برطانیہ اور فرانس میں بھی، ان لوگوں کی جگہ امریکا کے سماجی سائنسدان اور قدیم کتابوں اور اشیا کے خصوصی ماہرین جیسے لوگ آ جائیں گے۔

اس طرح کے سکالر امریکا میں صرف مشرقِ وسطیٰ یا اسلام کے ماہرین کے طور پر پہچانے جاتے ہیں، یہ ماہرین کے ایک طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور جہاں تک اسلامی دنیا کے جدید معاشروں کے ساتھ اُن کے تعلق کا سوال ہے، تو ان کا دائرہ کار بحرانی انتظامیہ کے برابر برابر ادبی نوعیت کا قرار دیا جا سکتا ہے، ان کا مقام زیادہ تر ان کی اس سوچ سے متعین ہوتا ہے کہ اسلامی دنیا امریکی حکمتِ عملی میں بڑی اہمیت رکھتی ہے اور یہ دنیا اگر حقیقی مسائل سے نہیں، تو ہر طرح کے ممکنہ مسائل سے ضرور گھری ہوئی ہے، برطانیہ اور فرانس دونوں نے کئی عشروں تک اسلامی نو آبادیات کا بندوبست سنبھالے رکھا، جس کے دوران نو آبادیاتی نظام کے ماہرین کے ایک طبقے کا وجود میں آ جانا ایک قدرتی امر تھا، لیکن اس طبقے نے کوئی ایسا انتظام نہیں کیا جو امریکا کے اُس انتظام کی برابری کر سکے جسے حکومت اور کارپوریشنوں کے اتحاد سے قائم ہونے والا وہ نیٹ ورک قرار دیا جاتا ہے اور جس کے تحت مشرق وسطیٰ کا مطالعہ ہوتا ہے، پھر اس طبقے سے متعلق عربی، فارسی یا اسلامی اداروں کے پروفیسروں نے برطانیہ اور فرانس کی یونیورسٹیوں میں کام کیا ہے، انھیں مشورے کے لیے بلایا جاتا رہا ہے، انھیں نو آبادیات کے شعبے اور نجی تجارتی اداروں میں شامل ہونے کی دعوت بھی دی جاتی ہے، یہ کبھی کبھار مجالس بھی منعقد کر لیتے ہیں، لیکن وہ کبھی اپنا کوئی ایسا آزاد ڈھانچا قائم کرنے کی طرف مائل نظر نہیں آتے، جسے چلانے اور قائم رکھنے کے لیے نجی تجارتی شعبے یا براہِ راست فاؤنڈیشنوں اور حکومت کا تعاون حاصل کیا جائے۔

اس لیے اسلامی دنیا کے علم اور اس کی کوریج کی تشریح امریکا میں اس جغرافیائی سیاست اور اقتصادی مفادات کے حوالے سے کی جاتی ہے، جس کا دائرہ ایک فرد کی نگاہ میں ناممکن حد تک پھیلا ہوا ہے اور اسے مدد

اور ترغیب، علم پیدا کرنے والے اُس ڈھانچے سے ملتی ہے جو اسی کی طرح وسیع بھی ہے اور اُسے سنبھالنا بھی مشکل ہوتا ہے، متحدہ عرب امارات کو پہلے پرامن ریاستیں (Trucial States) کہا جاتا تھا، ان ریاستوں اور عرب قبائل کا مطالعہ کرنے والے طالب علم کا اس بات سے کیا لینا دینا کہ تیل کمپنیوں کی موجودگی اُس کے اور اُن قبائل کے درمیان دخل اندازی کا سبب ہے، اُس کا اس بات سے بھی کیا تعلق بنتا ہے، جسے نیوز ویک نے اپنے 14 رجولائی 1980ء کے شمارے میں سرورق کی کہانی بنایا ہے کہ ''تیل کے ذخائر کا دفاع: امریکا کی فوجی قوت میں اضافہ'' (Defending the Oilfields: The U.S. Military Buildup) اور جس کے ضمن میں یہ بات آتی ہے کہ خلیج کے علاقے میں فوجیوں کو تیزی سے پہنچانے کا بندوبست کیا جاتا ہے؛ اگر مشرق وسطیٰ کی تمام مشینری امریکی دفتر خارجہ، کارپوریشنوں اور فاؤنڈیشنوں اور مشرقی علوم کے سینئر پروفیسروں کے لشکر کے ''ہاتھوں'' میں ہے، تو اس سے اُسے کیا فرق پڑتا ہے؟ ایسی صورت میں جب ایک طرف ''ہلال کے بحران'' کا ایک فرضی ہنگامہ بپا ہو اور دوسری طرف علمیت، تجارت اور حکومت کی سطح پر ادارے کی شکل میں ایک اتحاد بڑے زور وشور کے ساتھ حرکت کر رہا ہو تو حقیقی معنوں میں دوسری ثقافت کے متعلق کس قسم کا علم حاصل ہوسکتا ہے؟

مجھے اپنی کتاب کے اس حصے کو ختم کرنے سے پہلے اس سوال کا ٹھوس جواب دینا ہے، یہ جواب دو حصوں میں بٹا ہوا ہے، اس سوال کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ اصل حالات اور حقائق، اسلام کی کوریج کے کردار، روایتی انداز میں حاوی ہوتے ہیں، ان کا جائزہ لینے کے لیے میں پہلے امریکا پر توجہ دوں گا پھر یہ توجہ یورپ کے حالات کی طرف مڑتی چلی جائے گی، پچھلے دنوں ایک مفید فرانسیسی سروے سامنے آیا ہے، جو مشرقِ وسطیٰ کا مطالعہ کرنے والے امریکی سینٹروں کے متعلق ہے، اس سروے کے مطابق 1970ء میں مشرقِ وسطیٰ کے امریکی ماہرین کی کل تعداد 1650 تھی اور اس وقت 2650 گریجویٹ اور 4150 انڈر گریجویٹ طلبہ کو اس علاقے کی زبان پڑھائی جارہی تھی، اس ''علاقے کے مطالعے'' میں جس قدر گریجویٹ اور انڈر گریجویٹ حصہ لے رہے تھے، اُن کی نسبت سے زبان پڑھنے والے طلبہ کی تعداد بالترتیب بارہ اور سات اعشاریہ چار فی صد بنتی تھی، اُس وقت مشرقِ وسطیٰ پر علاقائی کورسوں میں 6,400 گریجویٹس اور 22,900 انڈر گریجویٹس نے داخلہ لے رکھا تھا اور یہ کل طلبہ کا بارہ اعشاریہ چھ فی صد بنتا تھا، یہ اعداد وشمار ایک ذوق اور شوق کی نمائندگی کرتے ہیں اور جب ہم اس سے بڑھ کر امریکا میں پی ایچ ڈی کرنے والوں کی مجموعی تعداد کو دیکھتے ہیں تو ان کے مقابلے میں مشرقِ وسطیٰ کے مطالعے پر پی ایچ ڈی کرنے والوں کی تعداد ایک فی صد سے بھی کم بنتی ہے، رچرڈ نولٹ (Richard Nolt) نے بھی امریکی یونیورسٹیوں میں مشرق وسطیٰ کے مطالعے کے سینٹروں کا ایک

پُرمغز جائزہ مرتب کیا ہے، یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ اس کا اہتمام ''مشرق وسطیٰ ایسو'' (Middle East Esso) نے کیا تھا جو ایک تیل کمپنی ہے اور امریکا کی ملٹی نیشنل مینوفیکچرنگ کارپوریشن ایگزن (Exxon) کا ایک شعبہ ہے، اس جائزے کو 1979ء میں ایک کتاب کی شکل میں شائع کیا گیا اور امریکی دفتر تعلیم نے علاقائی مطالعے کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ اس کا فائدہ یہ ہے کہ ''اس طرح ماہرین اور سپیشلسٹ بڑی تیزی کے ساتھ اور بڑی تعداد میں، حکومت اور کارپوریشنوں کے کام آنے اور تعلیمی مقاصد پورے کرنے کے لیے تیار کیے جاسکیں گے''۔ امریکی یونیورسٹیوں نے اس نکتہ نظر کی تائید کی ہے چنانچہ نولٹ یہ بات بجا طور پر لکھتا ہے کہ ''یونیورسٹیوں کے نکتہ نظر سے، مشرق میں کھپت کے ایک پورے نظام کو وضع کرلیا گیا ہے، یہ سینٹر مارکیٹ میں کھپت کے لیے نہ صرف ایسی چیزیں تیار کرتے ہیں، جن کی بڑی مانگ ہے، بلکہ علاقے کے متعلق ایسے تربیت یافتہ سپیشلسٹ بھی تیار کرتے ہیں، جو بڑی مارکیٹوں کے لیے ہر اعتبار سے موزوں اور مناسب ہوتے ہیں، یہ سپیشلسٹ قواعد وضوابط کے پابند اور پیشہ ور ہوتے ہیں اور نئی منڈیاں قائم کرتے چلے جاتے ہیں، ایم اے کے پروگراموں کے متعلق وہ کہتا ہے کہ ''سرکاری'' کارپوریٹ، بینکنگ اور دوسری پیشہ ورانہ منڈیاں اُن ایم اے کرنے والوں کے لیے کھلی ہوتی ہیں، جنھوں نے مشرقِ وسطیٰ کی وسعتوں کی مناسب تربیت لے رکھی ہے، اس کے لیے انھیں اقتصادی اور سیاسی عنصر کا شکر گزار ہونا چاہیے جو سب کی حوصلہ افزائی کے لیے موجود ہیں''۔

جس طرح پرنسٹن کے سیمیناروں کے حوالے سے میں نے کہا تھا کہ یہ علم وادب کی دنیا میں ادبی ضرورتوں کو تراشنے خراشنے میں مدد دیتے ہیں، اسی طرح منڈیوں سے جنم لینے والے حقائق علم وادب کے نصاب کو ایک احساس عطا کرتے ہیں، مشرقِ وسطیٰ کے مطالعے میں سب سے زیادہ زور اسلامی قانون اور عرب اسرائیل تنازع پر دیا جاتا ہے، اس کی مناسبت تو واضح ہے، مگر نولٹ کے مطابق جس طرح امریکی یونیورسٹیوں میں مشرقِ وسطیٰ کے طالب علموں کے بہت بڑے گروپ کو داخلہ تو دے دیا جاتا ہے، مگر اُن پر خاص توجہ نہیں دی جاتی، اُسی طرح علم وادب سے تغافل برتا جاتا ہے؛ اس کے علاوہ نولٹ کا کہنا یہ ہے کہ اُس نے سینٹروں کے جن ڈائریکٹروں کا انٹرویو کیا ہے:

> اُنھوں نے ان واقعات کا ذکر کیا جن میں سے زیادہ تر کیمپس سے باہر پیش آئے تھے اور جن کا تعلق منظم سیاسی دباؤ سے تھا، اس دباؤ کا مقصد عربوں سے متعلق اُن سرگرمیوں کو روکنا اور اُن کی مذمت کرنا تھا، جن پر ان سینٹروں کو تو کوئی اعتراض نہیں تھا، وہ ان سرگرمیوں کی جائز اور پسندیدہ خیال کرتے تھے، ان سرگرمیوں میں عربوں

کے ثقافتی مشاغل، فلمی نمایشیں، مہمان مقررین کا بندوبست، سینٹر کے اخراجات کی مد میں عربوں کی طرف سے مالی امداد تک آتے تھے، ان کے متعلق یہ اندازہ لگانا بہت مشکل تھا کہ اُن میں سے کون سی سرگرمی سیاسی دباؤ کا نشانہ بن جائے گی، اس دباؤ کے متعلق آگاہی نے خود بخود ایک ان دیکھی اور مؤثر رکاوٹ کھڑی کی، جس کی کچھ ڈائریکٹر نہ تو مذمت کر سکے اور نہ اُسے نظر انداز ہی کر سکے، کچھ ڈائریکٹروں نے محسوس کیا کہ اس سے حالات بہتر ہوئے ہیں لیکن دوسروں کو اس کا اتنا یقین نہیں تھا۔

سیاست، دباؤ اور منڈیاں، یہ سب چیزیں اپنا احساس مختلف طریقوں سے دلاتی ہیں، معاصر مشرقِ وسطیٰ کے لیے ماہرین کی ضرورت، ان بے شمار کورسوں، بے شمار طالب علموں اور ان مفید علمی پہلوؤں سے پوری ہوتی ہے، جو نہ صرف نفع بخش بھی ہوتے ہیں اور فوری طور پر نافذ العمل ہونے کے لائق بھی، ان علمی پہلوؤں کو قبول کرنے اور انھیں جاری رکھنے پر بڑا زور دیا جاتا ہے، اس سے ایک اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ استدلالی تحقیقات خود بخود وجود میں نہیں آتیں، ایک طالب علم جس کی خواہش ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کے مطالعے کو اپنا پیشہ بنائے، اُسے سب سے پہلے یہ خوف تنگ کرے گا کہ اُسے برسوں پر پھیلی ہوئی وہ طویل اور بنجر مسافت طے کرنا ہوگی جسے طے کر کے ہی وہ پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر سکے، پھر یہ بات بھی اُسے پریشان کرے گی کہ اس منزل تک پہنچنے کے بعد بھی اگر اسے پڑھانے تک کی ملازمت بھی مل سکے گی یا نہیں؛ اس تذبذب سے نکلنے کے لیے وہ ایم اے کرے گا یا بین الاقوامی مطالعے کے اُس مضمون میں ڈپلومہ کرے گا، جو بڑے آجروں کے لیے پُرکشش ہوں، حکومت، تیل کمپنیاں، سرمایہ کاری کے عالمی ادارے، ٹھیکہ لینے والی کمپنیاں بڑے آجروں میں آتی ہیں۔ پھر اُس کی یہ بھی خواہش ہوگی کہ وہ کسی کیس کا مطالعہ کرے کا انداز اختیار کرنے اور اپنا کام جتنی جلدی ممکن ہو مکمل کر لے، یہ طرزِ عمل اسلام اور مشرقِ وسطیٰ کے مطالعے کو علمی حلقے میں جاری، دوسرے ادبی اور اخلاقی مطالعوں کے بہاؤ سے الگ تھلگ اور تنہا کر دیتا ہے، اس تناظر میں میڈیا زیادہ موزوں سٹیج معلوم ہوتا ہے، مثال کے طور پر ایک عام ادبی مجلّہ شائع کر دینے کے مقابلے میں میڈیا پر مہارت کا مظاہرہ کرنا زیادہ سودمند ہوتا ہے۔ اس بات کو وہ لوگ زیادہ سمجھتے ہیں جو میڈیا کے عادی ہو چکے ہیں، چنانچہ اس صورت حال میں آپ یا تو حلیف بن کے اُبھرتے ہیں جو کسی حد تک محدود کر دینے والی چیز ہے یا آپ ایک ایسے ماہر کے طور پر سامنے آتے ہیں جسے شیعوں کی سوچ اور امریکا کی مخالفت کے رجحانات کے متعلق اپنا فیصلہ سنانے کے لیے بلایا گیا ہے، ایک ماہر کی حیثیت سے کردار ادا کرنے میں کامیابی اُنھیں ملتی ہے، جنھوں نے کاروباری طبقے یا حکومت

کے نمایاں کام انجام دیے ہوتے ہیں۔

علم کا اس طرح پیدا ہونا بڑا مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے لیکن اس سے یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ آ جاتی ہے کہ اسلام کے علم کو حاصل کرتے ہوئے، نہ صرف اُس پر توجہ دینے میں انتہائی تنگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، بلکہ اس کے متعلق مواد بھی تباہ کن حد تک کم دستیاب ہوتا ہے، سب سے بڑھ کر یہ بات کہ اس سے یہ وضاحت بھی ہو جاتی ہے کہ میڈیا میں بار بار جن بیہودہ باتوں کو دہرایا جاتا ہے، انھیں چیلنج کرنا کیوں ممکن نہیں ہے، اسلام کے ادبی ماہرین کی جماعت کو اُن کے اسی تنہا اور فوری نوعیت کے کردار کی ادائیگی سے روک دیا گیا ہے، جس کے ذریعے وہ اپنے آپ کو اسلام پر ایک مستند مرتبے کا حامل ظاہر کرتے تھے، پھر اُنھیں اُس نظام کا بھی حاشیہ بردار بنا دیا گیا ہے، جو اُن کے لیے ایسا دائرہ متعین کرتا ہے، جس کے اندر رہتے ہوئے انھیں اپنا کام انجام دینا ہے پھر یہ اُس کام کی قانونی حیثیت بھی طے کرتا ہے اور یہی وہ نظام ہے جس کے ذریعے میڈیا خوف اور لاعلمی کی بنیاد پر تیار ہونے والی تحریروں اور پروگراموں کی گھسے پٹے انداز میں عکاسی کرتا ہے۔

اگرچہ میں جو بیان کرتا چلا آیا ہوں وہ ادبی اعتبار سے محدود کر دینے والا معلوم ہوتا ہے اور میرے نزدیک محدود کرنے والا ہی ہے، اس کے باوجود یہ مشرقِ وسطیٰ، اسلام اور تیسری دنیا کے دوسرے حصوں کے متعلق بے تحاشا مواد پیدا کرنے سے نہیں روکتا، دوسرے الفاظ میں ہمیں اسی کا سامنا ہے، جسے فوکالٹ (Foucault) کسی دوسرے سلسلے میں ''مباحثے میں درشتگی'' (An incitement to discourse) کا نام دیتا ہے، اس درشتگی کے باوجود ہمیں اجنبی اور دور افتادہ ثقافتوں پر مباحثے کے متعلق اُن ادبی ضابطوں کو دھیان میں رکھنا ہوتا ہے جو ہر کام میں مداخلت کرنے والی سنسر شپ سے قطعی مختلف ہوتے ہیں مگر مثبت اور تائیدی انداز میں مباحثوں کو جاری رکھنے کی حوصلہ افزائی کرتے رہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ دنیا میں رونما ہونے والی تبدیلیوں نے انھیں متاثر نہیں کیا، یہ اپنی جگہ ثابت اور قائم ہیں اور اسی کا یہ ثمر ہے کہ ایک تسلسل کے ساتھ ان کی خدمت کے لیے نئے نئے کارکن چلے آتے ہیں۔

اس وقت اسلام اور غیر مغربی معاشروں کی جو کوریج ہو رہی ہے وہ بعض تصورات، عبارتوں اور سندوں کے لیے عزت و احترام کا مقام بھی پیدا کر رہی ہے، مثال کے طور پر یہ تصور کہ اسلام کا تعلق قرونِ وسطیٰ سے ہے، وہ خطرناک ہونے کے ساتھ ساتھ دشمنی پر بھی مائل اور ہمیں دھمکاتا رہتا ہے۔ ایسا تصور ہے جس نے ثقافت اور نظام حکومت میں ایسا مقام حاصل کر لیا ہے، جسے اچھی طرح کھول کھول کے بیان کیا جاتا ہے، اس کے لیے سند کو یا تو فوری طور پر بیان کر دیا جاتا ہے یا اس کا حوالہ دیا جاتا ہے اور اسلامی واقعات کے متعلق دلائل

دیتے ہوئے اس سے مثالیں لی جاتی ہیں، یہ کام ماہرین یا صحافیوں تک محدود نہیں؟ کوئی بھی اس طریقے کو اختیار کر سکتا ہے، اسلام کوئی ایسی چیز نہیں، جو باہر کہیں موجود ہو، یہ سب کے سامنے اور موجود ہوتا ہے، اس لیے اسلام کو یا اُس مواد کو جو بلا تخصیص اسلام سے منسوب کیا جاتا ہے، اُسے اس معاشرے کے کٹر پن میں بدل دیا جاتا ہے، چنانچہ یہ ثقافت کے قوانین میں شامل ہو جاتا ہے، جس کی بدولت اسے تبدیل کرنا یقیناً بہت مشکل ہوتا ہے۔

اسلام کی روایتی کوریج کے متعلق اتنا ہی کہنا کافی ہے، اس کوریج کو طاقت کے ساتھ اُس کا الحاق اسے حوصلہ دیتا، اسے دیرپا بناتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی موجودگی کو یقینی بناتا ہے، تاہم اسلام کا ایک اور تصور بھی گردش میں ہے، جو اسلام کی اُس قسم سے متعلق ہے جسے علم تناقض (antithetical knowledge) کہتے ہیں۔

علم تناقض سے میری مراد اس قسم کا علم ہے جو اُن لوگوں سے پیدا ہوتا ہے جو اپنے آپ کو شعوری طور پر مروجہ کٹر پن کے خلاف لکھنے والوں میں شمار کرتے ہیں، یہ بات بہت جلد سامنے آ جائے گی کہ یہ لوگ مختلف وجوہ اور مختلف حالات کی وجہ سے اپنے آپ کو کٹر پن کا مخالف سمجھتے ہیں، تاہم ان تمام لوگوں میں یہ احساس بڑا نمایاں ہوتا ہے کہ کیسے اور کس وجہ کی بنا پر وہ اسلام کا مطالعہ کریں، یہ ایسے سوالات ہیں جن کی وضاحت کے لیے تبادلۂ خیال کی ضرورت ہوتی ہے، ان تناقض کی ترجمانی کے عمل کے دوران مستشرقین کی استدلالی خاموشی کی جگہ، علم وادب کے سیاسی مطالعہ پر ہنگامی مباحث لے لیتا ہے اور مستشرقین کے استدلال پر حسب معمول آزاد اقدار کی مقصدیت کے اوپر غیر معمولی اعتماد اپنی تہیں جماتا رہتا ہے۔

اسلام میں علم تناقض کی تین بڑی اقسام ہیں اور معاشرے کے اندر تین قوتیں ایسی ہیں جو انھیں کٹر پن کو چیلنج کرنے کے لیے تیار کر رہی ہیں، ان میں ایک تو نوجوان سکالروں کا گروپ ہے جو اس میدان میں اپنے بڑوں کی بہ نسبت زیادہ نفیس اور سیاسی طور پر زیادہ ایماندار ہے، وہ کسی طرح اس بات سے آگاہ ہیں کہ اسلام کے متعلق کام کسی نہ کسی طرح ریاست کی سیاسی سرگرمیوں سے متعلق ہے، اس لیے وہ یہ ظاہر کرنے میں اپنا وقت برباد نہیں کرتے کہ وہ بامقصد سکالر ہیں، اُن کے لیے یہ حقیقت ہی کافی ہے کہ امریکا اُس عالمی سیاست میں ملوث ہے جس میں اُس کا سابقہ زیادہ تر اسلامی دنیا سے پڑتا ہے، اُن کے لیے یہ صورت ایسی نہیں ہے، جس میں خاموشی اختیار کر لی جائے یا اسے غیر جانبدارانہ سچائی کے طور پر تسلیم کر لیا جائے، بلکہ وہ تو پُرانے مستشرقین کی طرح عام علم حاصل کرنے پر یقین نہیں رکھتے بلکہ سپیشلسٹ بننا چاہتے ہیں، چنانچہ انھوں نے

ایسے جدید استدلالی طریقوں کو کھلے دل کے ساتھ تسلیم کیا ہے، جن میں ساخت سے متعلق علم البشر، تجزیے کے مارکسی طریقے آتے ہیں، انھوں نے نہ صرف ان میں دلچسپی لی ہے بلکہ بعض اوقات ان کا اطلاق بھی درست کیا ہے، وہ مستشرقین کی اُن تحریروں کے متعلق خاص طور پر حساس ہیں، جن کا تعلق نسل پرستی کی مختلف اقسام سے ہے، چونکہ وہ نوجوان ہیں، اس لیے وہ سرپرستی کے اُس نظام سے باہر ہیں، جو اس پیشے کے سینئر ارکان کو، ٹویڈ کے سوٹ میں ملبوس رکھتا اور سکاچ سے اُن کی تواضع کرتا ہے، ان کی صفوں سے ہی مشرق وسطیٰ کے متبادل مطالعے پر سیمینار (Alternative Middle East Studies Seminar) اور مشرقِ وسطیٰ کا تحقیقی اور معلوماتی منصوبہ (The Middle East Research and Information Project) جیسے پروگرام اُبھرے ہیں، ان دونوں کا اہتمام حکومت اور تیل کمپنیوں سے بچا کر کیا گیا تھا، بعد میں یورپ میں بھی ایسی ہی سوچ رکھنے والے گروپوں کو منظم کیا گیا اور ان سب کا ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ قائم کر دیا گیا، میں جن نوجوان سکالروں کا حوالہ دے رہا ہوں، اُن میں سے سب نے، ان گروپوں میں شمولیت اختیار نہیں کی، تاہم اُن کی اکثریت اس بات کی حامی ہے کہ سکالروں کو ایک بار پھر اپنے مقاصد پر نظر ڈالنی اور ان میں تبدیلی لانی چاہیے، ان میں ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ وہ اسلام کی کوریج اُس تناظر میں کرے، جسے اُس کے سینئر سکالروں نے یا تو نظر انداز کر دیا تھا یا اُنھیں اس کا علم ہی نہیں تھا۔

ایک دوسرا گروپ، اُن بوڑھے سکالروں پر مشتمل ہے، جن کا اپنا کام بہت سی وجوہ کی بنا پر، اس بات کا متقاضی ہے کہ ایک منظم طریقے سے اُس کی تلخیص کی جائے، یہ گروپ بھی اُس روایتی علمیت کا مخالف ہے، جس نے علم کے میدانِ پر قبضہ کر رکھا ہے، مثال کے طور پر برکلے کے حامد الگر (Hamid Algar) اور یونیورسٹی آف کیلی فورنیا لاس اینجلس (UCLA) کے نکی کیڈی (Nikki Keddie) ایران پر عبور رکھنے والے چند افراد میں سے تھے، جنھوں نے ایران کے انقلاب سے چند سال پہلے ہی ایران کے شیعہ علما کے سیاسی کردار کو سنجیدگی سے لینا شروع کر دیا تھا، اگرچہ الگر اور کیڈی دونوں نے پہلوی حکومت کے استحکام کے متعلق اپنے شکوک وشبہات کا اظہار کرنا شروع کر دیا تھا مگر یہ دونوں ایک دوسرے سے بڑے مختلف ہیں، اسی طرح براش کالج (Baruch College) کے اروند ابراہمیان (Ervand Abrahamian) نے شاہ ایران کے سیکولر تصور کی مخالفت پر جو مضامین لکھے تھے اُن میں انقلاب کے سیاسی محرکات پر اُن کی گہری نظر دکھائی دیتی ہے، یا حال ہی میں ہاورڈ کے مائیکل جی فشر (Michael G. Fischer) اور برطانیہ کے فریڈ ہالی ڈے (Fred Halliday) سامنے آئے ہیں، یہ دونوں سکالر ہیں اور انھوں نے ادبی اور علمی وجوہ کی بنا پر، ایران کے متعلق اکثریت کی

بالادست قوت نے قرونی معاملات کو طے کرنے کے لیے تیار کیا ہے، یہ سوچنا بہت آگے کی بات ہے کہ کیا کوئی تصور اسلام کا حامی یا مخالف ہو سکتا ہے اور کیا کوئی شخص محب وطن یا غدار ہو سکتا ہے، جیسے جیسے ہماری دنیا بڑی تیزی سے قریب آتی چلی جا رہی ہے محدود وسائل کے کنٹرول، جنگی اہمیت کے علاقوں اور بڑی آبادیوں پر توجہ دینا اتنا ہی ضروری ہوتا چلا جائے گا، ایسے میں طوائف الملوکی اور بدنظمی کے جس خوف کو بڑی احتیاط کے ساتھ دلوں میں بٹھا دیا گیا ہے، وہ اس خوف کے متعلق خیالات میں یکسانیت پیدا کرے گا، اور ''بیرونی'' دنیا کے حوالے سے زیادہ بداعتمادی لائے گا، یہ بات اسلامی اور مغربی دنیا دونوں کے لیے ایک جیسی درست ہے، ایسے وقت میں جو اس وقت شروع ہو چکا ہے، علم کو پیدا کرنا اور اس کے شرانگیز پہلوؤں کو کم کرنا بڑا اہم کردار ادا کرے گا، تاہم جب تک علم کو انسانی اور سیاسی زبان میں ایک ایسی چیز کے طور پر نہیں سمجھا جائے گا، جسے مخصوص نسلوں، قوموں، طبقوں یا مذہبوں کے لیے نہیں بلکہ بقائے باہمی اور انسانیت کے لیے حاصل کرنا ہے، اس وقت تک کسی اچھے مستقبل کی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی۔

باب سوم

علم اور اس کی ترجمانی

(حصہ دوم)

انسانی معاشرے کے متعلق جس قدر علم ہے، وہ قدرتی دنیا کے متعلق نہیں ہے بلکہ تاریخی علم ہے، اس لیے اس کا انحصار اندازوں اور ترجمانی پر ہوتا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ حقائق اور اعداد و شمار کا اپنا کوئی وجود ہی نہیں ہے یا یہ کہ وہ کوئی معنی ہی نہیں رکھتے، ان کا وجود بھی ہے اور وہ معنی بھی رکھتے ہیں، مگر حقائق کو اتنی ہی اہمیت ملتی ہے، جس قدر اس کی اہمیت اس کی ترجمانی متعین کر دیتی ہے، اس بات کو یوں سمجھیے کہ اس سے تو کسی کو انکار نہیں ہے کہ نپولین فرانس کا بادشاہ تھا، مگر اس سے آگے ترجمانی کا اختلاف آ جاتا ہے جو اس بات پر اٹک کر رہ گئی ہے کہ اس کا شمار عظیم حکمرانوں میں ہوتا ہے یا اسے فرانس کو تباہ کرنے والے حکمرانوں میں شامل کیا جانا چاہیے، ترجمانی کے یہی اختلافات ہیں، جن سے تاریخ وجود میں آتی ہے اور ان سے ہی تاریخی علم حاصل کیا جا سکتا ہے، لیکن ترجمانی کا انحصار اس پر ہے کہ کون یہ ترجمانی کر رہا ہے اور تاریخ کے کس مرحلے پر یہ ترجمانی سامنے آ رہی ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر طرح کی ترجمانی حالات سے جڑی ہوئی ہے اور ہمیشہ اس صورت حال میں سامنے آتی ہے، جس سے اس کا تعلق بنتا ہے، پھر دوسرے مترجم جو کہہ چکے ہیں، اس سے بھی اس کا تعلق بنتا ہے، اس صورت میں ترجمانی کا طریقہ یہ ہے کہ جو پہلے بیان ہوئی ہے اس کی تصدیق یا تردید کی جاتی ہے یا اسے جاری رکھا جاتا ہے، کوئی بھی ترجمانی اور تشریح ایسی نہیں ہوتی جس میں مثالوں کو نہ بیان کیا گیا ہو یا اس کا تعلق دوسری تشریحات سے قائم نہ کیا گیا ہو، اس بات کو یوں لیجیے کہ اگر کوئی اسلام یا چین یا شیکسپیئر یا مارکس پر سنجیدگی کے ساتھ کچھ لکھنا چاہتا ہے اور یہ نہیں چاہتا کہ اس کی تحریر کو غیر متعلقہ اور بے معنی قرار دے دیا جائے، تو اسے کسی نہ کسی طریقے سے یہ جاننا ہوگا کہ اس موضوع پر، اس سے پہلے کیا کہا گیا، یا لکھا جا چکا ہے، اس کے معنی یہ ہوئے کہ کوئی بھی تحریر دوسروں کی تحریروں کے حوالے سے نہ تو پاک ہو سکتی ہے اور نہ پاک ہوتی ہے کیونکہ یہ کوئی ریاضی کی مشق نہیں ہوتی، انسانی معاشرے کو ضبط تحریر کرنے اور ریاضی کی مشق میں بڑا فرق ہے، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس عمل سے کسی ایسی جداگانہ اصل اور خالص تحریر کی توقع نہیں کی جا سکتی، جس میں دوسروں کا کوئی حصہ ہی نہ ہو۔

اس معلوم صورت حال میں طے یہ پایا ہے کہ دوسری ثقافتوں کا علم خاص طور پر اس غیر سائنسی تاثرات کے اوران حالات کا تابع ہوتا ہے، جو تشریح اور ترجمانی کو جنم دیتے ہیں، تاہم عارضی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کسی دوسری ثقافت کا علم حاصل کرنا بھی اسی صورت میں ممکن ہے اور اسے حاصل کرنے کی خواہش بھی اسی صورت مطمئن ہوتی ہے، جب اس سے متعلق دو شرائط پوری کر دی جائیں...... یہ دونوں شرائط بالکل ویسی ہیں جن کا آج مشرق وسطی اور اسلام کے مطالعے میں خیال نہیں رکھا جا رہا، ایک شرط تو یہ ہے کہ طالب علم پر یہ بات سمجھنا لازم ہے کہ جس ثقافت کا وہ مطالعہ کر رہا ہے، اس سے اس کا رابطہ کسی جبر کے تابع تو نہیں ہے، پھر اس نے اپنے مشاہدے کو جب تحریر کا روپ دینا ہے، تو اس کے لیے وہ اس قوم کے سامنے جوابدہ ہوگا، جس کے متعلق وہ لکھ رہا ہے، اس لیے وہ غلط بیانی سے کام نہیں لے سکتا، میں یہ بات پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ مغرب کو غیر مغربی دنیا کے متعلق زیادہ تر باتیں نو آبادیاتی نظام کے زمانے میں معلوم ہوئیں، چنانچہ یورپی سکالروں نے اس صورت حال میں جب کسی معاشرے کا مطالعہ کیا، تو ان کا مقام اور حیثیت ایک غالب اور برتر کی تھی، چنانچہ حاکم نے جب محکوم کے متعلق کچھ جاننا چاہا، سمجھنا چاہا تو اس پر حاکمیت غالب آ گئی اس صورت میں اس نے اپنے موضوع کی مناسبت سے جو کہا، اس میں دوسروں کے اور مقامی حوالے شامل نہیں تھے، بلکہ اس سے پہلے جو دوسرے یورپی باشندے لکھ چکے تھے، اس نے انھیں ہی اپنا حوالہ بنایا اور اپنے مطالعے کو خود ہی محدود کر لیا، اس بات کو سامنے رکھتے ہوئے میں، اپنی اس کتاب کے شروع میں اور اپنی کتاب اورینٹل ازم (شرق شناسی) میں بھی لکھ چکا ہوں کہ اسلام اور اسلامی عوام کا جو مطالعہ کیا گیا ہے، اسے نہ صرف بالادستی اور مخالفت بلکہ ثقافتی منافرت کے مقام پر بیٹھ کر مکمل کیا گیا ہے، اس لیے آج اسلام کی تشریح یوں منفی انداز میں کی جاتی ہے، جیسے اس کا مغرب کے ساتھ جھگڑا چل رہا ہو، اس کشیدگی نے ایک ایسا دائرہ باندھ دیا ہے، جس نے اسلام کے متعلق علم کو محدود کر دیا ہے، جب تک یہ دائرہ قائم رہے گا، مغرب کو اس اسلام کے متعلق علم حاصل نہیں ہو سکے گا، جس کے احکامات کے تحت مسلمان اپنی زندگی بسر کرتے ہیں، اس سلسلے میں افسوسناک بات یہ ہے کہ اسلام کے متعلق علم سے یہ دوری یورپ کی کم اور امریکا کی زیادہ ہے۔

یہ تو تھی پہلی شرط، اب دوسری شرط کو لیجیے، یہ پہلی سے جڑی ہوئی ہے اور اس کی تکمیل کرتی ہے، یہ شرط کچھ یوں ہے کہ سماجی دنیا کا علم، قدرتی دنیا کے علم کے مقابلے میں اس چیز کی تہ میں پوشیدہ ہوتا ہے، جسے میں اب تک تشریح اور ترجمانی کہتا چلا آیا ہوں، یہ علم اپنا مقام مختلف ذرائع سے حاصل کرتا ہے، ان ذرائع میں کچھ ادبی ہوتے ہیں، کچھ سماجی اور ان میں سیاسی ذرائع بھی آ جاتے ہیں، تشریح، تفسیر اور ترجمانی سب سے

پہلے تو ایک ایسی قسم ہے جو کچھ بناتی ہے، اس کے معنی یہ ہوئے کچھ بنانے کا انحصار انسانی ذہن کی اس سوچی سمجھی سرگرمی پر ہوتا ہے، جس میں اس کی اپنی رضامندی شامل ہوتی ہے، اس طرح جن چیزوں پر اس کی توجہ مرکوز ہوتی ہے وہ ان کا مطالعہ کرتے ہوئے، انھیں بڑی احتیاط کے ساتھ تحریر کے سانچے میں ڈھالتا اور انھیں اپنے الفاظ سے کچھ بنا دیتا ہے، اس طرح کی سرگرمی ایک مخصوص وقت اور مقام پر زبردستی یا مجبوراً شروع ہوتی ہے، اور ایک خاص مقام پر موجود ایک ایسا فرد، اس کا بار اٹھا لیتا ہے، جس کا ایک مخصوص پس منظر ہوتا ہے، پھر وہ ایک مخصوص صورت حال میں چیزوں کو، منطقی انجام کے مختلف سلسلوں کی طرف لے جاتا ہے، اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ عبارتوں کی ترجمانی کا انحصار، بنیادی طور پر دوسری ثقافتوں کے علم پر ہوتا ہے اور یہ علم نہ تو کسی محفوظ لیبارٹری میں پیدا ہوتے ہیں اور نہ یہ لیبارٹری میں کوئی بامقصد نتائج حاصل کر سکتے ہیں، دوسری ثقافتوں کا علم ایک طرح کی سماجی سرگرمی ہوتی ہے، جو ایک ایسی سرگرمی کے ساتھ جڑی ہوتی ہے، جس سے یہ پہلے خود ابھری تھی اور جسے اب یا تو اسے علم کا درجہ دینا ہے یا اسے ناموزوں قرار دیتے ہوئے علم کے درجے سے خارج کر دینا ہے، یہ بات طے ہے کہ کوئی تشریح اس صورت حال کو نظر انداز نہیں کر سکتی اور کوئی تشریح اس صورت حال کی تشریح کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔

یہ بات بڑی واضح ہے کہ احساسات، عادات، رسوم، روابط اور اقدار جیسی غیر سائنسی چیزیں تشریح و ترجمانی کا لازمی جزو ہوتی ہیں، مترجم دوسری زبانوں کی تحریروں کو پڑھتا ہے، پھر نفس مضمون کو اپنی زبان میں ڈھالتا ہے، مگر کوئی بھی پڑھنے والا نہ تو غیر جانبدار ہوتا ہے اور نہ اقدار سے آزاد ہوتا ہے، بالفاظ دیگر اس بات کو یوں سمجھیے کہ پڑھنے والا اپنی ذاتی انا بھی رکھتا ہے اور وہ ایک معاشرے کا فرد بھی ہوتا ہے، اس کے مختلف نوعیت کے مراسم بھی ہوتے ہیں، جو معاشرے کے ساتھ اس کے تعلق کو قائم رکھتے ہیں، چنانچہ حب الوطنی یا جنگجویانہ وطن پرستی کے قومی جذبات اور خوف یا مایوسی جیسے ذاتی جذبات بھی ہوتے ہیں اور یہ سب اس کے کام پر اثر انداز ہوتے ہیں چنانچہ تشریح کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک ایسا منظم طریقہ اختیار کرے، جس کے ذریعے وہ ان وجوہ اور اطلاعات کو جو اس نے رسمی تعلیم کے ذریعے حاصل کر لی ہیں، انھیں خوبی کے ساتھ استعمال میں لائے تاکہ اسے فہم و ادراک کی منزل حاصل ہو جائے، ویسے تو رسمی تعلیم بھی اپنی جگہ خود ایک طویل تشریحی عمل ہے، فہم و فراست کی منزل تک پہنچنے کے اس عمل میں کچھ رکاوٹوں کو بھی دور کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، ایک تو ان رکاوٹوں کا اس دور سے تعلق ہوتا ہے، جس میں مترجم موجود ہے، دوسرا تعلق اس دور سے ہوتا ہے، جب اور جہاں وہ عبارتیں تیار ہو رہی تھیں، جن کے ترجمے کی ضرورت پیش آ گئی ہے،

پھران دونوں کے درمیان بھی رکاوٹیں ہوتی ہیں، اس مرحلے کو عبور کرنا شعوری ارادے سے وجود میں آنے والی کوشش کا کام ہے۔ان شعوری کوششوں کے ذریعے ہی فاصلے سمٹتے ہیں اور ثقافتی رکاوٹیں دور ہوتی ہیں، یہی کوششیں دوسرے معاشروں اور ثقافتوں کے علم کو نہ صرف ممکن بناتی ہیں بلکہ اس کی حدود کا تعین بھی کرتی ہیں، یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جب مترجم اپنے آپ کو انسانی حوالوں سے نہ صرف سمجھتا ہے بلکہ عبارت کو بھی اس ماحول اور حالات کے حوالے سے سمجھنے کے لائق ہو جاتا ہے، جس انسانی ماحول اور حالات میں اسے تخلیق کیا گیا تھا، یہ منزل اس وقت میسر آتی ہے، جب خود آگاہی کے نتیجے میں یہ احساس اجاگر ہو جائے کہ جو کچھ دور اور اجنبی ہے وہ بہر طور انسانی بھی ہے، یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس سارے عمل کا تعلق نہ تو اس ''نئے اور مکمل طور پر مختلف علم'' سے ہوتا ہے جس کا تذکرہ روایتی مستشرق نے کیا ہے اور نہ پروفیسر بائنڈر کے اس ''نظم وضبط'' سے ہوتا ہے، جو خود اپنی تصحیح کرتا رہتا ہے۔

اس سلسلے میں ایک اور ضروری بات یہ ہے کہ ترجمانی کے عمل کی جس تجریدی وضاحت تک پہنچ کر علم حاصل ہوتا ہے وہ کسی صورت کوئی متوازن چیز نہیں ہے، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ دلچسپی کے بغیر کسی ترجمانی، کسی فہم وفراست کا، کسی علم کا کوئی وجود نہیں ہوتا، یوں تو یہ بات کسی بے مزہ مسلمہ حقیقت کی طرح معلوم ہوتی ہے مگر یہی بات وہ پورا، پورا اور معلوم سچ ہے، جسے یا تو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور یا مسترد کر دیا جاتا ہے، اب اس بات کو یوں سمجھیے کہ دلچسپی میں بھی ایک واضح فرق ہوتا ہے، ایک امریکی سکالر کے لیے آج کے زمانے میں ایک عربی یا جاپانی زبان میں لکھے گئے، ناول کو پڑھنا اور اسے اپنی زبان میں منتقل کرنا، ایک اجنبی شے سے متعلق ایسی مصروفیت ہے، جو اس ادویہ ساز کی مصروفیت سے قطعی مختلف ہے جو ایک کیمیائی فارمولے کو منتقل کرنے میں لگا ہوا ہے، کیمیائی عناصر ذاتی طور پر متاثر نہیں کرتے اور نہ کسی کے انسانی جذبات کو ابھارتے ہیں، اگر ان کے ساتھ کسی سائنسدان کا کوئی جذباتی تعلق قائم ہو بھی جاتا ہے، تو اس کا کوئی ذاتی حوالہ نہیں ہوتا، مگر انسانی ترجمانی میں یہ بات بالکل الٹ ہوتی ہے اور اس میں ذاتی حوالہ اور جذباتی تعلق دونوں موجود ہوتے ہیں، اس کے متعلق بعض نظریہ سازوں کا کہنا یہ ہے کہ یہ تعصبات کی آگاہی، اور ان عبارتوں کے ساتھ لاتعلقی کے احساس سے شروع ہوتا ہے، جن کی ترجمانی مقصود ہوتی ہے، جیسا کہ ہینس جارج گاڈامر (Hans George Gadamer) نے لکھا ہے کہ:

> کوئی شخص جو ایک عبارت کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے، ذہنی طور پر اس بات کے لیے تیار ہوتا ہے کہ یہ عبارت اسے کچھ بتائے گی، اس لیے وہ شخص جسے تعبیر اور تفسیر کی تربیت

> دی گئی ہے، اس کے ذہن کو شروع میں ہی اس بات کے لیے تیار ہونا چاہیے کہ اس عبارت میں نئے پن کی صفت موجود ہے، مگر اس طرح کی حساسیت کے لیے نہ تو زیر مطالعہ چیز سے ''غیر جانبدار'' ہونے کی ضرورت ہوتی ہے، اور نہ اپنی ذات کی نفی کرنا لازم ہوتا ہے، بلکہ ہوتا یوں ہے کہ ماضی کے تجربات کی بدولت، جو مطالب اور معنی پہلے سے موجود ہیں، ان کی بنیاد پر قائم ہونے والے اپنے مطالب اور معنی کو اور اپنے تعصبات کو جانتے بوجھتے ہوئے ایک دوسرے میں ضم کرنے کا فن کام آتا ہے، اس میں سب سے اہم اپنے تعصبات سے آگاہی اس لیے ضروری ہوتی ہے تاکہ زیر مطالعہ عبارت پوری تازگی کے ساتھ پیش کی جا سکے اور اپنی سچائی کو دوسروں کے اخذ کیے گئے مطالب ومعانی پر حاوی کیا جا سکے۔

اس لیے ایک اجنبی ثقافت سے متعلق عبارت کو پڑھتے ہوئے، جس چیز کا سب سے پہلے احساس کرنا ہوتا ہے وہ اس کا فاصلہ ہے، یہ فاصلہ وقت اور جگہ دونوں کی نسبت سے محسوس کرنا ہوتا ہے، اگرچہ یہ بات صرف مترجم کے لیے ہی نہیں ہے، اس میں دوسرے بھی آتے ہیں، تاہم مترجم کے لیے اپنے وقت کے اندر اور اپنی جگہ پر موجود ہونا ضروری ہوتا ہے، جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ قدامت پرست مستشرق یا ''علاقائی مطالعوں'' میں طریق کار یہ رہا ہے کہ وہ فاصلے کو اختیار کے مساوی قرار دیتے ہیں اور علمی بحث کے حاکمانہ لب ولہجے کو ایک دور افتادہ ثقافت کے غیر ملکی احساس میں سمو دیتے ہیں، اس علمی بحث میں یہ علم کا وہ سماجی مرتبہ ہے، جس میں یہ نہیں بتایا جاتا کہ غیر ملکی احساس آخر ہے کیا اور مترجم سے جبراً اس کی کیا تشریح حاصل کی جاتی ہے، پھر یہ بھی تصدیق نہیں کی جاتی کہ طاقت کے کس ڈھانچے نے مترجم کے کام کو ممکن بنایا ہے، ان تمام باتوں سے میری مراد صرف اتنی ہے کہ آج کے مغرب میں اسلام پر لکھنے والا کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو واضح طور پر اس بات کو تسلیم کرے کہ ''اسلام'' کو ایک دشمن ثقافت سمجھا جاتا ہے، یا یہ کہ اسلام کے متعلق پیشہ ور سکالر جو بات کہتے ہیں، لکھتے ہیں، کیا وہ کارپوریشنوں، میڈیا اور حکومت کے تابع ہوتی ہے، پھر اس بات کو بھی تسلیم نہیں کیا جاتا کہ یہ سب باتیں مل کر ترجمانی کا وہ کردار ادا کرتی ہیں جو اسلام کو ''قومی دلچسپی کے معاملات'' کے مطابق اور قابل قبول بنا دیتی ہیں، جس دلیل کا میں نے اوپر تجزیہ پیش کیا ہے ان کے متعلق لیونارڈ بائنڈر کا طرز عمل بڑی مخصوص نوعیت کا ہے، وہ پہلے ان امور کا ذکر کرتا ہے، پھر وہ پیشہ ورانہ خصوصیات اور ''نظم وضبط کو خراج عقیدت پیش کرتا ہے اس کے بعد ایک جملے سے انھیں غائب کر دیتا ہے حالانکہ یہ پیشہ ورانہ خصوصیات اور

''نظم وضبط'' کا ہی مجموعی کام ہے کہ وہ ہر اس چیز کو مسترد کر دے، جو علمی مقصدیت پر پڑے ہوئے نقاب کو اٹھا سکتی ہے، یہ دراصل اس قابل قبول سماجی علم کی ایک مثال ہے، جو ان اقدامات کو خود مختار ہا ہے، جن اقدامات کے ذریعے وہ خود وجود میں آیا ہے۔

ترجمانی کے ایک پہلو کی حیثیت سے ''مفاد'' کے مطالب ومعانی کی تشریح زیادہ ٹھوس انداز میں کی جا سکتی ہے، کوئی بھی اسلام، اسلامی ثقافت، اسلامی معاشرے کے متعلق یوں ہی گفتگو نہیں کرتا، آج کی ایک مغربی صنعتی ریاست کے باشندے کے لیے اسلام کے ساتھ تصادم کی وجہ یا تو تیل کا سیاسی بحران یا بنیاد پرستی اور دہشت گردی، یا میڈیا کی اس پر شدت کے ساتھ مرکوز توجہ، یا ان ماہرین کی عرصہ دراز سے موجود روایت جنھیں مستشرق کہتے ہیں اور مغرب میں اسلام پر تبصرے ہیں، ذرا اس نوجوان تاریخ دان کے معاملے کو لیجیے جو مشرق وسطیٰ کی جدید تاریخ میں مہارت حاصل کرنا چاہتا ہے، اسے اس موضوع کا مطالعہ کرتے ہوئے ان تینوں پہلوؤں کو سامنے رکھنا پڑتا ہے، جو اس کے ساتھ متعلق ہیں اور وہ اپنی جگہ ان میں سے ہر ایک صورت حال کو اپنے مطابق ڈھالنے اور بنانے میں لگا ہوا ہے، اس صورت حال میں ''حقائق'' کو جنھیں نئے اعداد وشمار کے طور پر لینا چاہیے، گرفت میں لے لیا جاتا ہے، ان کے علاوہ افراد کی دوسری کہانیاں بھی ہیں، جن میں معقولیت اور ادب دونوں میں ملتے ہیں، انھیں بھی سمیٹ لیا جاتا ہے اور ان سے اس مضمون میں اس کے تجسس اور دلچسپی کو، اس خیال سے بڑھاوا ملتا ہے کہ اسے دفتر خارجہ، فوج یا تیل کمپنی میں مشیر کا منصب حاصل ہو سکتا ہے، اس کی یہ خواہش پوری ہو سکتی ہے کہ وہ کانفرنسوں میں شرکت کرے، ٹیلی وژن پر آئے، لیکچر دے اور ایک مشہور سکالر بن جائے، اس کی یہ آرزو پوری ہو سکتی ہے اگر وہ ''ثابت'' کر سکے کہ اسلام ایک شاندار ثقافتی نظام ہے یا بصورت دیگر یہ بتا سکے کہ اسلام ایک خوفناک ثقافتی نظام ہے، پھر یہ تمنا کہ وہ اس ثقافت اور اس ثقافت کے درمیان فہم وفراست کا پل بن جائے اور اس کی جاننے کی خواہش کی تکمیل ہو جائے، عبارت، پروفیسر، عالمانہ روایت اور مخصوص لمحے، وہ نشان راہ ہیں، جن کا نوجوان تاریخ دان کو مطالعہ کرنا ہے اور آخر میں اسے دوسری باتوں کی طرف بھی دھیان دینا ہے، اگر کسی نے انیسویں صدی کے شام کی تاریخ اور اس کی زمینی ساخت کا مطالعہ کیا ہے، تو اس بات کا قوی امکان ہے کہ اگر اس موضوع کا انتہائی خشک اور ''بامقصد'' انداز میں بھی مطالعہ کیا جائے تو اس میں بھی موجودہ دور کی پالیسی کا کچھ نہ کچھ تعلق ضرور نکل آئے گا، خاص طور پر ان سرکاری افسروں کے لیے جو روایتی اختیارات کے ان پہلوؤں کو سمجھنا چاہتے ہیں، جو زمین کی ملکیت کو معاصر شام میں بعث پارٹی کی قوت کے برابر بنا دیتی ہے۔

لیکن اگر ابتدا میں ہی دور کی ثقافتوں کے ساتھ مجبوری کے بغیر رابطہ قائم کر لیا جائے اور دوسرے یہ کہ اگر مترجم اس صورت حال کو سمجھ لے، جس میں اسے ترجمانی کا کام کرنا ہے، یعنی اگر مترجم یہ سمجھ لے کہ دوسری ثقافت کا علم حتمی نہیں ہوتا، بلکہ ترجمانی کے ان حالات سے جڑا ہوتا ہے، جس میں سے یہ علم پھوٹتا ہے تو اس بات کا امکان بڑھ جاتا ہے کہ مترجم اسلام کے قدامت پرستانہ نظریات اور ''اجنبی'' ثقافتوں کے ایسے ہی نظریات کو انتہائی محدود تصور کریں گے، اگر اسلام کا دوسری ثقافتوں کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ قدامت پرست نظریات نے اسلام کو جن حدود میں مقید کر رکھا ہے، ان پر قابو پانے کی بڑی معقول صلاحیت اسلام کے متناقص علم میں ہے، اسی وجہ کی بنا پر متناقص سکالر اس خیال کو رد کر دیتا ہے کہ اسلام کے علم کو حکومت کی پالیسی کے فوری مفادات کے تابع ہونا چاہیے، یا یہ کہ اسے محض میڈیا کے اس اسلامی تصور پر پورا اترنا چاہیے، جو دنیا کو ایسی خوفناک عسکریت پسندی اور تشدد فراہم کرنے میں لگا ہوا ہے، جو علم اور طاقت کے درمیان ساز باز کو نمایاں کرتا ہے اور ایسا کرتے ہوئے وہ اسلام کے ساتھ ان تعلقات کو استوار کرنے کے بجائے، جو طاقت کے لازمی تقاضوں سے پھوٹتے ہیں، اسلام کے ساتھ دوسری طرح کے تعلقات قائم کرنے کی راہیں تلاش کرتا رہتا ہے، جس کا ایک ہی مطلب نکلتا ہے کہ تعلقات کی دوسری راہوں کی تلاش دراصل ترجمانی کے دوسرے حالات کی تلاش ہے، اس طرح ایک اور محتاط مگر منضبط طریقے کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔

آخر میں یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس چیز سے بچ نکلنے کا کوئی آسان راستہ نہیں ہے، جسے بعض حلقے ترجمانی کا دائرہ کہتے ہیں اور اس دائرے میں سماجی دنیا کا علم کبھی ان ترجمانیوں سے بہتر نہیں ہوتا، جو اسے جنم دیتی ہیں، چنانچہ پیچیدہ اور ہاتھ سے پھسل پھسل جانے والے اسلام جیسے مظاہر کے متعلق ہمارا تمام علم، عبارتوں، اشکال اور ان تجربات سے حاصل ہوتا ہے، جنھوں نے اسلام کو ڈھانپ نہیں رکھا ہوتا، تاہم یہ ظاہری نشانیوں سے ہی گرفت میں آتا ہے اور اس کا پتا اس کی نمائندگی یا اس کی ترجمانی سے ہی معلوم ہوتا ہے، اس کے معنی یہ ہوئے کہ دوسری ثقافتوں، معاشروں اور مذاہب کا علم بالواسطہ طور پر ان شہادتوں کی آمیزش پر استوار ہے، جو کسی سکالر کے ذاتی حالات سے وجود میں آتی ہے، ان میں وقت، جگہ، ذاتی صلاحیت، تاریخی حالات کے ساتھ ساتھ مجموعی سیاسی صورت حال بھی سامنے آتی ہے، اسی لیے سوچنا پڑتا ہے کہ وہ کیا چیز ہے جو اس طرح کے علم کو درست یا غلط قرار دیتی ہے، اسے بد، برا اور اچھا کے درجوں میں بانٹ دیتی ہے، میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اچھے اور برے ہونے کا تعلق بنیادی طور پر اس معاشرے کی ضرورتوں سے ہے، جس میں اس علم کا دھارا

پھوٹ نکلا ہے، یقیناً اس عمل میں سادہ حقائق کا بھی اپنا ایک مقام ہوتا ہے، جس کے بغیر کوئی علم پیدا ہی نہیں ہوسکتا، آخر ہم عربی اور بربر زبانوں کو سیکھے اور مراکش کے معاشرے کے متعلق کچھ معلومات حاصل کیے بغیر مراکش میں اسلام کے متعلق کیونکر کچھ ''جان'' سکتے ہیں، مراکشی اسلام کو سمجھنے کے لیے ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے، ہم یہاں اور وہاں کے درمیان ایک تعلق قائم کر کے، یا ایک ساکن چیز اور اسے دیکھنے والے کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کر مراکشی اسلام کو نہیں سمجھ سکتے۔ اسے سمجھنے کے لیے بالعموم کسی مقصد کے تحت میل ملاپ ہوتا ہے، مثال کے طور پر ایک پر مغز مضمون، ایک لیکچر کا، ٹیلی وژن پر آنا، پالیسی بنانے والوں کو مشورہ دینا، ایسی باتیں ہیں جن میں دو چیزوں کے درمیان ملاپ اور مقصد دونوں موجود ہیں، علم کا دائرہ استعمال بھی ہے جس کے متعلق یہ بات لازم ہے کہ وہ یا تو خود عمل کے میدان میں متحرک ہو یا کسی کا آلہ کار ہو۔

جو کچھ علم کے طور پر پیش کیا جاتا ہے وہ دراصل ایک ملی جلی چیز ہوتی ہے اور اس کا یقین پیدائشی ضرورتیں کم اور خارجی ضرورتیں زیادہ کرتی ہیں، ویسے بھی پیدائشی یا فطری ضرورتیں شاذ و نادر ہی کہیں ملتی ہیں، ایک امریکی ادبی شخصیت اگر پہلوی دور حکومت میں ایرانی شرفا کا مطالعہ کرتی ہے تو یہ مطالعہ ان پالیسی سازوں کے لیے بڑے کام کی چیز ہوگا جن کا پالا شاہی حکومتوں سے پڑتا ہے، لیکن اس مطالعے کے مسودے کو اگر ایرانی امور کے ان ماہرین کے سپرد کر دیا جائے جو غیر روایتی ہیں، تو ان کے نزدیک یہ غلطیوں سے پر اور ناقص اندازوں کا مرقع قرار پائے گا، بنیادی طور پر اندازوں کے مختلف معیار نہ تو بہتر کسوٹی کی ضرورت کو اجاگر کرتے ہیں اور نہ یہ غیر متزلزل انتہاؤں کو تجویز کرتے ہیں، بلکہ یہ تو ہمیں اس بات کی یاددہانی کراتے ہیں کہ یہ ترجمانی کی فطرت ہے کہ وہ ہمیں واپس ان سوالوں کی طرف دھکیل دیتی ہے، جو اس نے خود اٹھائے ہوتے ہیں، چنانچہ ہمیں ان سوالوں کے جواب تلاش کرنا ہوتے ہیں کہ یہ کس کے لیے، کس مقصد کے تحت ہیں اور ایک ترجمانی دوسری کے مقابلے میں زیادہ قابل قبول کیوں ہے، میتھیو آرنلڈ (Mathew Arnold) کہتا ہے کہ ترجمانی آسمانی تحفہ بن کر نہیں اترتی بلکہ یہ علم اور ثقافت کے درمیان مقابلے سے وجود میں آتی ہے۔

اس کتاب میں شروع سے ہی میرا موقف یہ رہا ہے کہ ہم نے اسلام کی جو روایتی کوریج تعلیمی اداروں، حکومت اور میڈیا میں دیکھی ہے، وہ نہ صرف ایک دوسرے کے ساتھ متعلق رہی ہے بلکہ کئی اعتبار سے اس کے اثرات کو بہت کم بھی کیا گیا ہے، پھر مغرب میں کسی دوسری ''کوریج'' کے مقابلے میں اسلام کی کوریج زیادہ دور تک پہنچتی ہے اور اس سے دوسروں کو ترغیب بھی زیادہ ملی ہے پھر اسلام کی تشریح کا معاملہ بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں رہا ہے، قطع نظر اس کے کہ یہ کوریج صحیح اور سچائی پر مبنی تھی بھی یا نہیں، اس کی کامیابی کا سہرا

ان لوگوں اور اداروں کے سیاسی اثر و رسوخ کے سر ہوتا ہے، جنھوں نے اس کوریج کو تیار کیا، میں یہ دلیل بھی پیش کر چکا ہوں کہ اس کوریج میں اسلام کے صحیح علم سے انحراف کیا گیا ہے اور اس انحراف کے جو مقاصد ہو سکتے تھے وہ بھی اس سے پورے ہوتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ صرف اسلام کے ایک مخصوص علم کو نہیں بلکہ ایک خاص طرح کی اس ترجمانی کو فتح حاصل ہوتی ہے جو کبھی چیلنجوں سے نہیں بچ سکی اور اس کے متعلق، غیر روایتی اور متجسس دماغوں نے جس قدر سوالات اٹھائے، ان سے بھی یہ کبھی اپنا دامن نہ بچا سکی۔

اس لیے یہ درست ہے کہ ''اسلام'' خاص طور پر خلیج کی جنگ کی وضاحت کرنے میں مفید ثابت نہیں ہوسکا۔ اتنا بھی مفید ثابت نہیں ہوسکا جتنا کہ بیسویں صدی میں سیاہ فام امریکیوں کے تجربات کو واضح کرنے میں ''نیگرو ذہنیت'' کے متعلق تصورات مفید ثابت ہوئے تھے، یہ اس لیے ہوا ہے کہ ان تصورات کو جو ماہر استعمال میں لاتا ہے اور جس کی روزی کا اکثر و بیشتر انحصار اسی پر ہوتا ہے، اس کے حصے میں صرف نرگسی اطمینان آتا ہے، مگر یہ ہمہ گیر نظریات اور تصورات نہ تو حالات کی قوت کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل سکے، اور نہ ان قوتوں کا ساتھ ہی دے سکے، جنھوں نے ان واقعات کو پیدا کیا تھا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک طرف تو وہ نظریات زور مارنے لگے، جن کی نسل ایک تھی اور دوسری طرف ان سے زیادہ طاقت سے خود کو منوانے والے وہ نظریات صف بستہ ہوگئے، جن میں حقیقی تاریخ کا عدم تسلسل بھی شامل تھا، ان دونوں کے درمیان خلیج مسلسل وسیع ہو رہی ہے تاہم اس خلیج میں کبھی کبھار کوئی فرد قدم رکھ ہی دیتا ہے، موقع کی مناسبت سے درست سوالات بھی پوچھ بیٹھتا ہے اور یہ توقع بھی رکھتا ہے کہ اسے جواب بھی معقول ملے گا۔

جس دنیا میں ہم رہتے ہیں، اس کے متعلق تمام باتیں کوئی شخص نہیں جان سکتا، اس لیے ادبی تلاش کی ایک تقسیم سامنے آجاتی ہے، کئی شعبے وجود میں آجاتے ہیں، اس طرح اس تقسیم کو ایک حقیقت تسلیم کرتے ہوئے پیش بینی کا عمل جاری رکھنا ہوتا ہے، اس تقسیم کی ادبی ادارے کو ضرورت ہوتی ہے، علم بھی اس تقسیم کا تقاضا کرتا ہے اور مغرب میں تو معاشرہ اسی تقسیم کے گرد منظم ہوتا ہے، لیکن میرے خیال میں انسانی معاشرے کے متعلق سب سے بہتر علم یہ ہے کہ یہ بالآخر انسانی فہم تک پہنچ جاتا ہے، اس انسانی فہم تک جو عام انسانی تجربات سے پھیلتا ہے اور تنقیدی جائزے کے تحت بھی آتا ہے، عام فہم اور تنقیدی جائزہ، دونوں سماجی اور ادبی منسوبات کے آخری تجزیے کے لیے نہ صرف دستیاب ہوتے ہیں بلکہ انھیں ہر ایک دوسروں کے ذہن میں بٹھا سکتا ہے، یہ آخری تجزیہ کسی خاص طبقے کی جاگیر نہیں ہوتا اور نہ یہ مٹھی بھر سند یافتہ ''ماہرین'' کا محتاج ہوتا ہے، اس کے باوجود اگر کسی نے عربی یا چینی زبان سیکھنی ہے، اقتصادی، تاریخی یا آبادی کے رجحان کو سمجھنا ہے، تو

اسے تربیت کے مراحل سے گزرنا ہوگا، اور مجھے اس میں قطعی کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ تربیت تعلیمی ادارے میں ہی دستیاب ہوتی ہے، اس سلسلے میں مشکل اس وقت سامنے آتی ہے جب اس تربیت سے ایسی تنظیمیں اور صحافت کے ایسے ''ماہرین'' وجود میں آجاتے ہیں جو اجتماعی زندگی کی حقیقتوں، اچھے احساسات اور ادبی ذمہ داریوں کے ساتھ اپنا رابطہ کھو بیٹھتے ہیں اور یا تو ان گروپوں کو ہر قیمت پر بڑھاوا دینے لگتے ہیں، جن کی دلچسپیاں خاص نوعیت کی ہوتی ہیں یا پوری پوری رضامندی اور کسی اعتراض کے بغیر طاقت کی خدمت پر مامور کر دیتے ہیں، دونوں صورتوں میں اسلام جیسے غیر ملکی معاشروں یا ثقافتوں کے متعلق اس انداز میں معلومات حاصل کی جاتی ہیں کہ یہ سمجھ میں آنے کے بجائے، عام فہم کے دائرے سے باہر نکل جاتے ہیں، اس صورت حال میں اس بات کا بھی خطرہ ہوتا ہے، ان غیر ملکی معاشروں یا ثقافتوں کو چھپانے کے لیے افسانے گھڑے جائیں گے اور غلط اطلاعات کی اتنی قسمیں گردش میں آجائیں گی کہ ان کا شمار کرنا بھی ممکن نہیں رہے گا۔

جنگ عظیم کے بعد امریکا اور یورپ کے سماجی سائنسدانوں، مستشرقین اور دنیا کے مختلف علاقوں کا علم رکھنے والے ماہرین نے ایک نقشہ مرتب کیا تھا، جس میں یہ اندازے قائم کیے گئے تھے کہ آنے والے دنوں میں دنیا کے مختلف ممالک کا عمل اور ردعمل کیا ہوگا، پچھلے کچھ برسوں سے یہ عجیب بات دیکھنے میں آنے لگی ہے کہ کسی بھی لمحے کوئی بھی شخص، قابل ذکر تعداد میں ایسی شہادتیں لے آتا ہے، جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ غیر مغربی دنیا بالعموم اور اسلام بالخصوص اب اندازوں کے اس نقشے کے مطابق عمل نہیں کر رہے، میرے خیال میں اس صورت حال کو ممتاز الجزائری سکالر اور نقاد محمد ارکون نے بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے، وہ سوربون (Sorbonne) میں اسلامی فکر کے پروفیسر ہیں وہ کہتے ہیں:

> ''اسلامی مطالعہ'' پر علمی بحث نے ابھی یہ وضاحت پیش کرنا ہے کہ کس طرح اتنے مختلف شعبوں، نظریوں، ثقافتی دائروں، ضابطوں اور تصورات کا ایک لفظ ''اسلام'' کے ساتھ تعلق جڑ گیا ہے اور جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، اس پر ایک ہی رخ سے کیوں بحث کی جاتی ہے، اس کے برعکس جب مغربی معاشرے کا مطالعہ کیا جاتا ہے، تو اس کی نمایاں خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ بڑی احتیاط کے ساتھ جانچ پڑتال کی جاتی ہے، صحیح تفاصیل پر توجہ مرکوز کی جاتی ہے، چیزوں میں بڑی باریک بینی کے ساتھ امتیاز کیا جاتا ہے، پھر ان کی بنیاد پر نظریات کو تعمیر کیا جاتا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ مغربی ثقافت کے مطالعے کو ایسے خطوط پر اٹھایا جاتا ہے کہ اس کا رخ اس طرف سے بالکل

> مختلف سمت کی طرف ہو جاتا ہے، جس سمت ''اسلام'' اور نام نہاد ''عرب دنیا'' بڑھ رہی ہے۔۔[لندن بکس آف ریویو میں یکم اگست 1996ء) صفحہ 27 پر میلسی رتھ ون (Malise Ruthuen) نے اقتباس شائع کیا]۔

یہ بات درست ہے کہ اسلامی دنیا نہ تو اجتماعی طور پر امریکا اور یورپ کی مخالف ہے، نہ متحد ہے اور نہ اس کے اقدامات کے متعلق پیشین گوئی کی جا سکتی ہے، اسلامی دنیا کی ان تبدیلیوں کا تفصیلی ذکر کیے بغیر میں یہ کہتا چلا آیا ہوں کہ ان کا مطلب اور مقصد اسلامی دنیا میں نئی اور بے قاعدہ حقیقتوں کا ظہور رہا ہے، یہ بات بھی کسی طرح کم درست نہیں ہے کہ اس طرح کی بے قاعدگیاں پچھلے برسوں میں نو آبادیاتی نظام کے بعد کی دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی، پہلے سے مرتب کیے گئے نظریات اور تصورات کا سکون درہم برہم کرتی رہی ہیں، ''ترقی پذیر'' اور افریقی ایشیائی ذہنیت'' کے متعلق پرانے فارمولوں پر زور دیتے رہنا تو بے وقوفی ہے ہی، لیکن ان کو سرسری انداز میں مغرب کے افسوسناک زوال، نو آبادیاتی نظام کے بدقسمت انجام اور امریکی قوت میں افسوسناک کمی کے ساتھ جوڑنا اس سے بڑی حماقت ہے، ایسا کوئی طریقہ نہیں ہے، جس کے ذریعے وہ معاشرے جو فاصلے اور شناخت دونوں اعتبار سے، بحر اوقیانوس کی دنیا سے ہزاروں میل دور ہیں، ان معاشروں اور بحر اوقیانوس کی دنیا کے درمیان ایسی مفاہمت پیدا ہو جائے جیسی ہم چاہتے ہیں، جس طرح میں سوچتا ہوں اسی طرح کا کوئی بھی شخص، اسے غیر جانبدارانہ حقیقت خیال کر سکتا ہے اور اسے درست قرار دے سکتا ہے، بہرحال ایران کے مغرب کے ہاتھ سے نکل جانے، اس کے لیے خطرہ بن جانے اور مغرب کے زوال کی بات کو ایک ہی سانس میں کہہ دینے میں خطرہ یہ ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں ہونے والے تمام ممکنہ اقدامات کو ہم خود ہی اپنی نظروں سے اوجھل کر دیتے ہیں اور ہمارے سامنے صرف مغرب کے عروج اور ایران اور خلیج جیسی جگہوں پر پھر سے مغرب کے قبضے کا تصور رہ جاتا ہے، پچھلے دو عشروں سے مغرب میں یہی ہوتا چلا آ رہا ہے۔